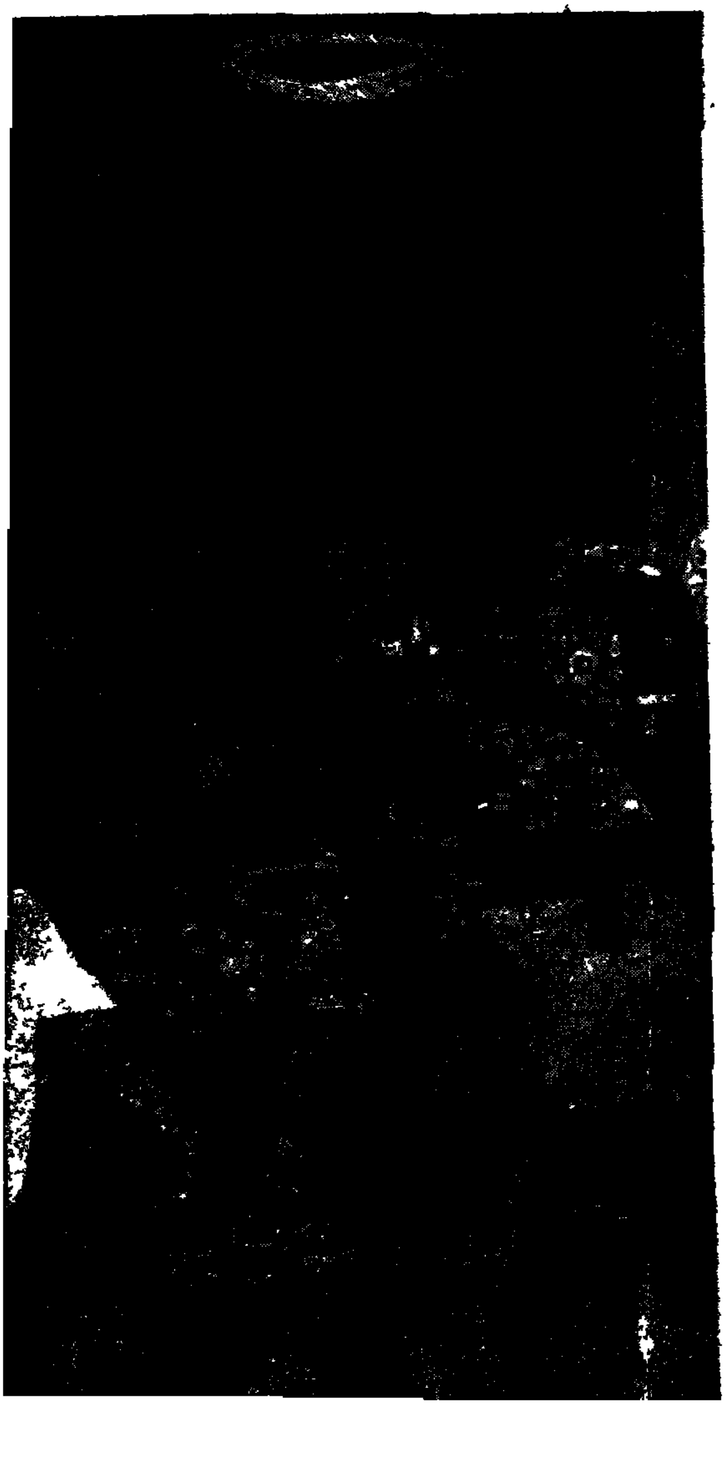
شمارہ ۱۲۳

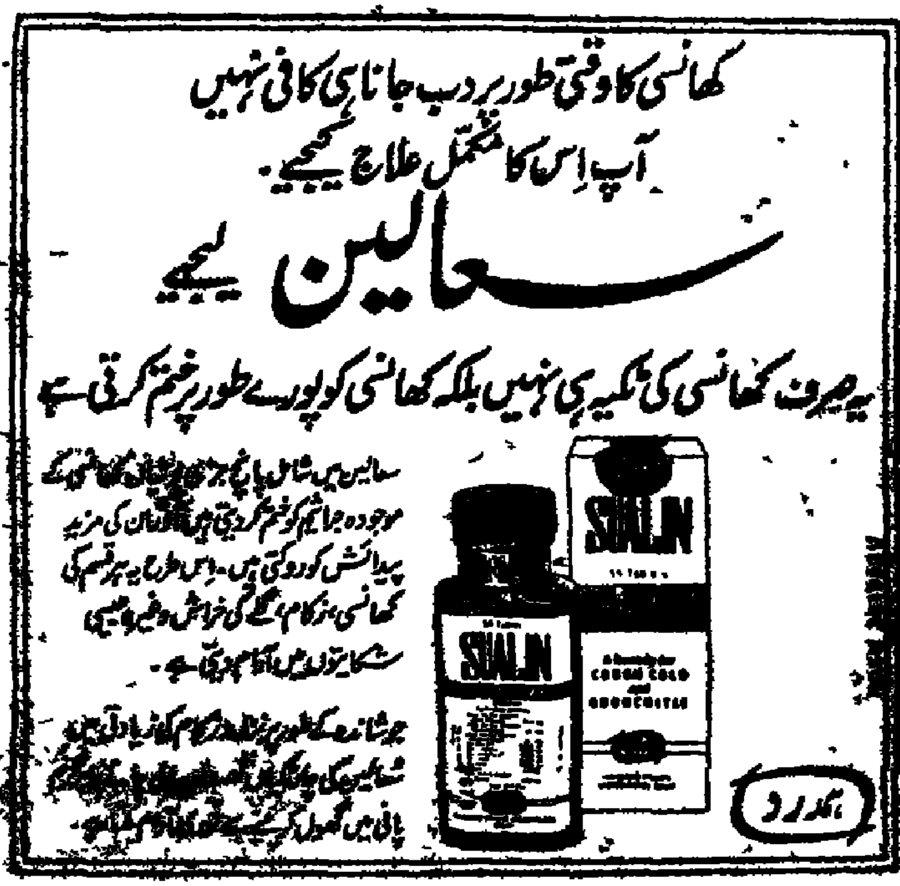
جنوری - فروری ۱۹۷۷ء



- ۴۲ نظمیں
- ۵۷ غزلیں
- ایک مقالہ

شار اختر، غلام ربانی تاباں، بلراج کومل
، بشیر بدر، وحید اختر، شاذ تمکنت، عزیز قیسی
زائن ناز، کرشن موہن، مدحت الاختر، صادق
لیس، عتیق اللہ، ذکا صدیقی، غلام مرتضیٰ راہی
الرحمان، علی عباس امید، اسلم عمادی، سلیم شہزاد
شم تشنہ، حکیم منظور، زبیدہ ثانی، ساغر مہدی

اور بہت سے دوسرے


کھانسی کا وقتی طور پر دب جانا ہی کافی نہیں
آپ اس کا مکمل علاج کیجیے۔
سعالین لیجیے
یہ صرف کھانسی کی تسکین ہی نہیں بلکہ کھانسی کو پورے طور پر ختم کرتی ہے
موجودہ جراثیم کو ختم کر دیتی ہیں اور ان کی مزید
پیدائش کو روکتی ہیں۔ اس طرح یہ ہر قسم کی
کھانسی، زکام، گلے کی خراش وغیرہ جیسی
شکایتوں میں آرام پہنچاتی ہے۔
SUALIN
SUALIN
COUGH COLD
BRONCHITIS
ہمدرد

مجلس مشاورت
حیات اللہ انصاری
سہیل عظیم آبادی / عابد سہیل
ڈاکٹر قمر رئیس

کتاب لکھنؤ

کپور مارکیٹ۔ لکھنؤ ۳

شمارہ ۱۲۳
جنوری، فروری، مارچ

مضمون

نظمیں

غزلیں

مدیر و پبلشر • طباعت • کتابت • زرسالانہ • حسابداری • ترسیل زر کا پتہ
آل پریس • نظامی • ۱۲ روپئے • ۲۵۱ • کتاب

پہلا ورق

گذشتہ سال جون میں ان صفحات پر ادبی رسائل کے بعض مسائل پیش کیے گئے تھے ان پر قارئین کے ردِ عمل کا سلسلہ آج تک "سنگم"، "متند"، "شیریں" کے صفحات پر موجود ہے۔ کسی بھی رسالہ کے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ اسکے پڑھنے والوں کا حلقہ رسالہ سے زندہ تعلق برقرار رکھتا ہے، اس کے مسائل سے دلچسپی لیتا ہے، اسمیں شائع ہونے والی اچھی چیزوں کی تعریف اور مدیر کے غلط فیصلوں کی سخت نکتہ چینی کرتا ہے۔

ہم نے گذشتہ سال دہلی سیمینار نمبر کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار ماہ میں یہ نمبر شائع کر دیا جائے گا لیکن وہ حالات جن کا رسالہ کی معاشیات سے گہرا تعلق ہے روز بروز خراب ہوتے گئے اور اب حالت یہ ہو کہ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، تقریباً ایک ایک سطر کی کتابت ہو چکی ہے، ساری تصاویر فراہم کی جا چکی ہیں، سرورق کا ڈیزائن تیار ہے لیکن کاغذ دستیاب نہیں۔ ردی کے نام پر بازار میں کاغذ جن قیمتوں پر دستیاب ہے اسے خرید کر کتاب ایسا جریدہ جس کے مالی وسائل ویسے ہی بے حد محدود ہیں خاص نمبر کسی طرح شائع نہیں کر سکتا۔ اس خاص نمبر کے لیے کم از کم اتنے کاغذ کی ضرورت ہوگی جس کی قیمت بازار میں ڈھائی ہزار روپیوں سے کم نہیں۔

ان حالات کے پیش نظر اب ہم اس نمبر کی تاریخ اشاعت کے اعلان سے مجبور ہیں۔ کاغذ حاصل ہوتے ہی یہ نمبر پیش کر دیا جائے گا۔ اس غیر متوقع اعلان کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں لیکن افسوس کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

پچھلے چند برسوں میں قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس نے زندگی کے ہر گوشے کو بری طرح متاثر کیا ہے لیکن رسائل و جرائد کو ایسے زبردست مالی بحران کے سامنے لا کھڑا کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ موٹے موٹے سنڈے اڈیشن اور ضمیمے شائع کرنے والے اخبار اب اپنی نازک بدنی کے سبب پہچانے نہیں جاتے، جانے کتنے بند ہو گئے، جانے کتنے موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور جانے کتنے اس امید موہوم پر زندہ ہیں کہ حالات شاید بہتر رُخ اختیار کر لیں اور ان کی زندگی کا سامان ہو جائے جبکہ اس بات سے ہم آپ سب ہی واقف ہیں کہ اس امید کو خوش فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

اب رسائل کے معاشی پہلو پر ذرا زیادہ قریب سے اعداد و شمار کی روشنی میں غور کیجیے۔ ۱۹۵۶ء میں ۶۴ صفحات کے ایک ادبی جریدہ کی قیمت ۱۲ آنے یعنی ۷۵ پیسے تھی۔ اس وقت کتابت ۸ آنے صفحہ، کاغذ ۹ روپے ریم، طباعت مشکل ۵ روپئے ہزار اور بلاک کی شرح آج کی ۲۵ فیصدی تھی۔ آج کاغذ ۳۵ روپے ریم بھی مل جائے تو آپ خود کو خوش قسمت تصور کریں گے۔ اسی طرح کتابت، طباعت، کور کاغذ، بلاک بنوانے کے اخراجات، غرض ہر چیز میں کم از کم تین سو فیصدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں ۶۴ صفحات کے رسالہ کی قیمت کسی طرح ڈھائی روپے سے کم نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس قیمت میں

رسالہ خریدے گا کون؟ ایک محدود حلقہ کے لیے ادبی جریدہ ضرورت کی حیثیت تو ضرور رکھتا ہے لیکن قحطِ دمشق میں اس عشق کو کون کتنے عرصہ تک یاد رکھ سکے گا۔ اس لیے آئندہ سے رسالہ کی ضخامت صرف ۵۶ صفحات ہوگی اور موجودہ قیمت میں تبدیلی نہ ہوگی۔ ہم کوشش کریں گے کہ ضخامت میں مزید کمی کی نوبت نہ آئے لیکن اگر حالات نے اور بھی خراب رُخ اختیار کیا تو ہم آپ سے یہ ضرور دریافت کریں گے کہ ۳۰ یا ۴۰ صفحات کا رسالہ شائع کرنے کے مقابلہ میں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے اور بہتر حالات کا انتظار کیا جائے، جو شائد اب کبھی نہ پیدا ہوں گے۔

کاغذ کے اس بحران کے سبب تعداد اشاعت میں زبردست کمی کی جا رہی ہے۔ پہلے تمام خریدار حضرات کو مدتِ خریداری ختم ہونے کی دو بار اطلاع دینے کے بعد اگلا شمارہ وی پی سے بھیج دیا جاتا تھا۔ اب وی پی صرف ان خریداروں کو بھیجا جائے گا جو واضح طور پر اس کی ہدایت کریں گے۔ مدت خریداری ختم ہونے کی اطلاع بھی اب صرف ایک بار ہی دی جاسکے گی۔ اعزازی فہرست بھی مختصر کی جا رہی ہے۔ امید ہے قارئین کتاب اور دوسرے ادبی جرائد کو اس بحران کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشیں گے۔

موجودہ شمارہ کم و بیش سو منظومات اور ایک مقالہ پر مشتمل ہے۔ اگلے شمارہ میں ایک ناولٹ، پانچ افسانے اور ایک مضمون شائع ہوگا۔ اسی طرح اس کے بعد والے شمارہ میں بھی کم و بیش ایک درجن افسانے شایع کیے جائیں گے۔ ضخامت کی کمی کے باوجود ہمیں امید ہے کہ ان شماروں کو اپنے مشمولات کے سبب قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اگلے شمارہ میں

ناولٹ:-

جیلانی بانو

افسانے:-

سہیل عظیم آبادی، عشرت ظہیر، امیر زہرا زیدی

سوشیل رائے۔ ترجمہ: سید الابرار

مضمون:-

اردو ادب کا لکشمن ــــ واجیو مرزا

تبصرے، خطوط

اس کے بعد

قرۃ العین حیدر، عتیق حنفی، انور عظیم، عبد القوی دسنوی، شہریار، قمر احسن، شوکت حیات، کوثر عبد الستار، حسین الحق، شفیع جمال، فاروق راہب، شبنم مسیح الزماں، سجاد عزیز، قاسم لیلی

عربی کہانی، مختصر مختصر ہندی افسانے

غزلیں

غلام ربّانی تاباں

جاوِد نگر - نئی دہلی ۲۵

سوچنا پڑتا ہے قید یام و در میں کیا نہ تھا
وحشتوں کے گھر میں کیا ہے میرے گھر میں کیا نہ تھا
فاصلوں کی گرد نے دھندلا دیے منظر تمام
ورنہ ہم آوارہ گردوں کی نظر میں کیا نہ تھا
چند یادوں کے علاوہ، چند زخموں کے سوا
زندگی کی شام میں کیا ہے، سحر میں کیا نہ تھا
شورشیں ہی شورشیں تھیں، زندگی ہی زندگی
سوچیے تو ایک مشت بال و پر میں کیا نہ تھا
چھوڑیے بھی اب تلاش و جستجو سے فائدہ
ہاں کبھی وہ دن بھی تھے دل کے نگر میں کیا نہ تھا
عقل بیچاری دلیلوں میں اُلجھ کر رہ گئی
ورنہ تاباں اس نگاہِ مختصر میں کیا نہ تھا

■■

جاں نثار اختر

آنکھیں چُرا کے ہم سے بہار آئے، یہ نہیں
حصّے میں اپنے صرف غبار آئے، یہ نہیں
کوئے غمِ حیات میں سب عمر کاٹ دی
تھوڑا سا وقت واں بھی گزار آئے، یہ نہیں
خود عشق قربِ جسم بھی ہے، قربِ جاں کے ساتھ
ہم دور ہی سے اُن کو پکار آئے، یہ نہیں
آنکھوں میں دل کھِلے ہوں، تو موسم کی قید کیا
فصلِ بہار ہی میں بہار آئے، یہ نہیں
اب کیا کریں، کہ حُسن جہاں ہے عزیز ہے
تیرے سوا کسی پہ نہ پیار آئے، یہ نہیں
اکثر ترے بغیر ہمیں چین آ گیا
تو آئے، تب ہی ہم کو قرار آئے، یہ نہیں
ہم سب سے پہلے قتل ہوئے، تم گواہ ہو
مرنے پہ دوسروں کو ابھار آئے، یہ نہیں
وعدوں کو خونِ دل سے لکھو، تب تو بات ہے
کاغذ پہ قسمتوں کو سنوار آئے، یہ نہیں
کچھ روز اور کل کی مروت میں کاٹ لیں
دل کو یقینِ وعدۂ یار آئے، یہ نہیں

■■

یونٹ ـــــ عام لوگوں کے لئے پونجی لگانے کا نہایت بڑھیا طریقہ

یونٹ ٹرسٹ سرکاری اہتمام میں قائم شدہ ایک ادارہ ہے جس کے ذریعے عام لوگ آسانی سے اپنی پونجی لگا سکتے ہیں۔ ریزرو بنک اور دوسری مالی تنظیموں کی طرف سے طرف سے مقرر کردہ ماہرین کا ایک ٹرسٹی بورڈ اس ٹرسٹ کا بندوبست کرتا ہے۔ یہ ٹرسٹ یونٹ فروخت کرتا ہے اور اس طرح حاصل شدہ پونجی کو اسٹاک مارکیٹ میں منتخبہ شیئرز اور کفالتوں میں لگاتا ہے۔ اس طرح لگی ہوئی پونجی سے ہر سال جتنی آمدنی ہوتی ہے، اس میں سے ٹرسٹ کا خرچ نکال کر باقی رقم ان یونٹ مالکوں میں ان کے حصے کے مطابق تقسیم کردی جاتی ہے جن کے نام ۳۰ جون تک رجسٹر میں درج ہوتے ہیں۔ ٹرسٹ کا حساب کتاب کا سال جولائی سے جون تک ہوتا ہے اور تمام یونٹ مالکوں کو پورے سال کا منافع دیا جاتا ہے خواہ، انھوں نے یونٹ کسی بھی تاریخ کو خریدے ہوں ۱۹۷۲-۷۳ء کے لئے ٹرسٹ نے ۸½ فیصد منافع دیا۔

ایک یونٹ پر درج قیمت دس روپے ہے اور یونٹ دس کے حاصل الضرب میں فروخت کئے جاتے ہیں۔ کم از کم دس یونٹ خریدنے پڑتے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی زیادہ سے زیادہ حد مقرر نہیں کی گئی ہے کوئی شخص جتنے بھی چاہے اتنے ہی یونٹ خرید سکتا ہے۔ ٹرسٹ کے بمبئی، کلکتہ، نئی دہلی اور مدراس کے دفاتر سے یا کئی ایسے بنکوں اور ڈاک گھروں سے رائج قیمت فروخت پر یونٹ خریدے جاسکتے ہیں، جو ٹرسٹ کے ریسیونگ ایجنٹ کے طور پر درخواستوں کے فارم مہیا کرتے ہیں اور روپیہ جمع کرکے ٹرسٹ کی طرف سے باقاعدہ رسید جاری کردیتے ہیں۔ یونٹوں کے سرٹیفکٹ ٹرسٹ کی طرف سے براہ راست بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجے جاتے ہیں۔ یونٹ کوئی فرد اکیلے خرید سکتا ہے یا دو، تین یا چار افراد مل کر بھی خرید کرسکتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی فرد نابالغ نہیں ہونا چاہیئے۔ کوئی نابالغ خود یونٹ خریدنے کی درخواست نہیں دے سکتا۔ البتہ اس کا باپ یا اس کی ماں، بشرطیکہ وہ قانونی طور پر اس کی سرپرست ہو یا عدالت کی طرف سے مقرر کردہ سرپرست نابالغ کی طرف سے درخواست دے سکتے ہیں اور جتنا عرصہ بچہ نابالغ رہے، وہ ایسے یونٹ سرٹیفکٹوں کے بارے میں تمام کارروائی کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

یونٹوں کے مالک (ماہ جولائی کے سوا) کسی بھی وقت اپنے یونٹ دوبارہ خرید کی واقعی قیمت پر پھر ٹرسٹ کو واپس بیچ سکتے ہیں۔ اس کے لئے یونٹ مالک، یونٹ سرٹیفکٹ کی پشت پر درج فارم کو پُر کرکے اور اس پر اپنے دستخط اور دستخطوں کی شہادت دلواکر اسے ٹرسٹ کے متعلقہ دفتر کو بھیج سکتے ہیں۔ ٹرسٹ دستخطوں وغیرہ کی پڑتال کے بعد ڈرافٹ، چیک، منی آرڈر یا زرنقدی کی صورت میں جیسی بھی یونٹ مالک کی خواہش ہو، اس کو رقم بھیج دیتا ہے۔

شریف ارشد

رحمانیہ اسکول۔ آسنسول

بشیر بدر

(ناصر کاظمی کے بعد جدید تر غزل کا دوسرا بڑا اسٹیبلشمنٹ)

ترقی پسندی کی لے مدھم ہوئی تو رفتہ رفتہ غزل کی بزم میں دو چراغ روشن کئے گئے یہ چراغ تھے فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی، فیض اقبال، سودا، داغ اور غالب سے منسلک تھے اور ناصر کاظمی میر کے مطیع، فیض فکر کے شاعر تھے تو ناصر کاظمی جذبہ کے، فکری وجذباتی ناآہنگی کے باوصف دونوں کے یہاں ایک زیریں لہر ہے جو پوری غزل میں موجود ہے اور غالباً یہی اس عہد میں انکی مقبولیت کا راز بھی تھا۔ بہر حال ناصر کاظمی اپنے وقت کے بہت بڑے ادبی اسٹیبلشمنٹ کے روپ میں سامنے آئے اور اپنے عہد پہ چھا کر رہ گئے اور ایک بت کی طرح پوجے جانے لگے۔ ناصر کاظمی کا یہ کارنامہ ضرور ہے کہ انہوں نے غزل کو دم عیسیٰ بخشا تھا، انہیں کے دم سے غزل کو نشاط ثانیہ نصیب ہوئی تھی، انہوں نے میر کی طرح سبک اور نازک بحروں میں غزلیں لکھی ہیں جن میں ترک وطن کی مصیبتیں، فسادات کا ذکر، ویرانی، محبت کی بربادی، رشتوں اور ناطوں کی شکست وریخت اور اداسی کی گہری تقسیم ہند کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کی تباہی کا ذکر ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں تباہ شدہ ہزاروں افراد کے لئے جس طرح میر کا کلام ایک تاریخی دستاویز تھا اسی طرح تقسیم ہند کے نتیجے میں تباہ شدہ ہزاروں افراد اور ان کے متوسلین کے لئے ناصر کے کلام سے متاثر ہونا اور ان کی شاعری کو پسند کرنا ایک فطری امر تھا۔ میر اور ناصر دونوں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ دونوں نے دو عظیم سیاسی حادثات (۱۸۵۷ کا غدر اور تقسیم ہند کی تباہ کاریوں) کو کرب ناکیوں میں اپنا ذاتی احساس گھولا۔ یعنی دونوں کے یہاں تخلیق انسان کی تباہی اور بربادی کا غم ہے۔ میر اور ناصر کے عقیدت مند حضرات میرے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں عجلت نہ فرمائیں اس لئے کہ میں معترف ہوں میر اور ناصر کی عظمت کا، میرا مطلب فقط یہ ہے کہ انکی عظمت اور مقبولیت کے باب میں ان حالات کا بڑا حصہ ہے، حواریں، مقلدین، اور متبعین کی ایک جم غفیر درکار ہے مسلسل کئی سالوں تک، پھر کسی آدمی کا پیغمبر بن جانا کسی عہد میں دشوار نہیں، یہی ہوا ان دونوں کے ساتھ، ۱۸۵۷ کے غدر کا تباہ شدہ ہر فرد دلی اور لکھنؤ میں میر کو پیغمبر مانتا رہا اور ادھر ہندوستان و پاکستان میں ناصر کو پیغمبر مانا جاتا رہا، یہاں تک کہ خود انہیں احساس ہوگیا اپنی پیغمبری کا، ناصر کاظمی کے عہد میں تقسیم ہند کے واقعات اور میر کے عہد میں ۱۸۵۷ کا غدر یقیناً مماثل حادثات ہیں دونوں شاعر ان حادثات سے ذاتی طور پر بھی متاثر ہوئے تھے۔ حالات کی یہی یکسانیت تھی جس نے ناصر کاظمی کو یہ سمجھایا کہ تم میر ہو اور تمہارا فرمایا ہوا مستند ہے۔ نقادوں نے شور مچانا شروع کیا تم پیغمبر ہو، ناصر کاظمی آخر معمولی انسان تھے پیغمبر نہ تھے، دھوکہ کھا گئے اب وہ خود اپنی نظر میں ناصر کاظمی کم رہ گئے اور میر زیادہ، نتیجہ ظاہر تھا میر کے لہجے کی پیروی میر کی لفظیات کا اتباع ان کا مطمح نظر ہو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ اپنی اس بات کا احساس نہیں رہ گیا کہ میر اور ان کے عہد میں زمانوں کا کتنا فاصلہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے میر کے عہد کی رات کو اپنے عہد کی رات سے کھینچ ملایا۔ وہی زبان، وہی غم، وہی خستگی دل کا نوحہ، وہی ویرانی شب کا ماتم۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اسکی وہی پرانا روگ

فلک نے پھینک دیا برگ گل کی چھاؤں سے دور
وہاں پڑے ہیں جہاں خار زار بھی تو نہیں
(برگ نے)

"دیوان" کے اشعار سے یقیناً یہ احساس ہوتا ہے کہ ناصر نے اپنے جگر لخت لخت کو سمیٹا ہے۔ اپنی شخصیت کی لاش میں روح پھونک کر اسے کھڑا کیا ہے، اور اپنے دل و دماغ کو سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ جو کچھ ہونا تھا سو ہوا، اب فکر کرنے سے کیا حاصل جو کھلونے ٹوٹ گئے، ان کا رونا کب تک روئیں گے، لاہور کی مٹی سے نئے کھلونے تیار کئے جائیں۔ یہاں کے شب و روز کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور فرد کے کرب کو کائنات کے کرب میں سمو دینا چاہیئے۔ آنے والے فتنوں سے اپنے ابناء وطن کو آگاہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح ممکن ہے دل بہل جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہ سارے کھلونے لاہور کی مٹی سے بنائے اور اپنے آخری ایام تک ان سے کھیلتے بھی رہے

پیارے دیس کی پیاری مٹی — سونے پر ہے بھاری مٹی
چند گھرانوں نے مل جل کر — کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
سب کا بوجھ اٹھانے والے — تو اس دنیا میں تنہا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے — تیرے پاؤں تلے سونا ہے
گہری نیند سے جاگو ناصر — وہ دیکھو سورج نکلا ہے

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آ گیا
خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں
لفظوں میں بولتا ہے رگ عصر کا لہو
لکھتا ہے دست غیب کوئی اس کتاب میں

اب کوئی کام بھی کریں ناصر — رونا دھونا تو عمر بھر کا ہے
(دیوان)

لیکن ان کے لہجے میں جو خستگی گھل گئی تھی، وہ خستگی نہ گئی، دلی کی بربادی کی زیریں لہر (جو انکی شاعری میں بربادیٔ دل کی علامت تھی) لاہور کے ذکر میں بدستور باقی رہی، دلی کی سرزمین سے جس پودے کو اکھاڑ کر لاہور کی سرزمین میں گاڑ دیا تھا حوادث روزگار نے، اس کی جڑیں نئی زمین کی تہوں میں کبھی پیوست نہ ہونے دیں۔ کسی خوش اخلاق مریض کی مزاج پرسی کو جایئے تو وہ لمحہ بھر کے لئے اپنے جسم کی تمام توانائی اور آب و روغن اپنے چہرے پہ سمیٹ کر مسکرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہنسی پردۂ غم ہے۔ ناصر کاظمی کی دلی ان کے ارمانوں، تباہ شدہ خاندانوں اور ٹوٹے بکھرے رشتوں کی لاش ہے تو ان کا لاہور دلی کا مقبرہ ہے۔ اس لئے مسٹر شہزاد احمد اور دیگر حضرات کو "برگ نے" اور "دیوان" میں جو فرق نظر آتا ہے وہ جسم کا فرق ہے روح کا نہیں یہ دراصل یوں ہے کہ "برگ نے" اور "دیوان" میں ناصر کی شخصیت کو بانٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اپروچ سے ناصر کی شخصیت کی اکائی برقرار نہیں رہتی وہ خود تقسیم ہند کی طرح ہند و پاک میں منقسم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا اصل "دیوان" "برگ نے" ہی ہے

ہاں تو یہ تھا جدید غزل کا وہ اسٹبلشمنٹ جو اپنے پورے دور پر حاوی تھا۔ اور اسی اسٹیبلشمنٹ کے زیر سایہ جی رہے تھے دوسرے شعراء، احمد مشتاق، سلیم احمد، ظفر اقبال، ہر چند ان شعراء کو اپنی زندگی کی بقا کے لئے ناصر کے کیمپ میں مصلحتاً جانا بھی پڑا ہے اور ناقدین نے انھیں زبردستی ناصر کا کلمہ پڑھنے پر مجبور بھی کیا۔ اسلام کا ایسا غلبہ تھا کہ کافر رہ کر زندہ رہنا مشکل تھا لیکن ان کے دلوں میں منافقت کی آگ بھڑک رہی تھی، یہ حضرات اس زبان، لہجہ اور مضامین سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ سلیم احمد نے ابوجہل کا کردار ادا کیا، بدتمیز غزلیں کہہ کر ناصر کا منہ چڑایا۔ اختر احسن نے بھی اس رویہ کے خلاف اپنی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔ عباس اطہر نے بھی اس اسٹبلشمنٹ کو توڑنے کی کوشش کی، ناصر کاظمی کو مبرا [illegible] کا بھوتی

تک کہا گیا۔ ظفر اقبال نے لکھنؤ اور دلی کی زبان کے حصار سے باہر قدم رکھا اور غزلوں میں وہ ترکیبیں، الفاظ، استعمال کیے جس سے اس اسٹیبلشمنٹ کے گھٹنے تک ٹوٹ گئے۔ اونٹ کی گردن میں جب سات جگہ نہر لگی ہے تب جا کر یہ اونٹ زمین پہ بے دم ہو کر گرا۔

اتنا نہ سنبھال مال ہڈی — اندر ہو چل پڑی ہے گڈی
کھلنے تڑواوے فرش پر ہی — کھیلے نہ پلنگ پر کبڈی
اب جوش نکال کر بیٹھیں گے — تازہ ہے اور ریڈ بلڈی
انگیا میں ڈوبتا ہے دن سا — خوشبو سی چھوڑتی ہے چڈی
تانا پیٹا ہوئے ہیں غائب — چلنے کو چل رہی ہے کھڈی
پہنچیں گے اگرچہ سب سے پہلے — کہلائیں گے پھر بھی ہم پھسڈی
اک عادت بد تھی شاعری کی — سو وہ بھی ہم نے چھوڑ چھڈی
آیا ہے آخر نظر کیا — لگتی نہیں کیوں زمین پہ اڈی
چپکا دہی کا ہو گیا ظفر وہ — آئی جہاں جس کے منہ میں ہڈی

(ظفر اقبال)

ان غزلوں کی تخلیق کا مقصد صرف یہ تھا کہ ناصر کاظمی پہ پتھر پھینکا جائے اور ان کے تصور زبان کو مجروح کیا جائے۔ یہ تخریب کاری اپنے اندر تعمیری مقصد رکھتی تھی۔ لیکن آج کل جو اس کی کاپی چھپ رہی ہے وہ محض بیہودہ تقلید ہے جس کا کوئی مقصد نہیں۔

بشیر بدر اس پورے دور میں ناصر کاظمی سے فکری طور برسر پیکار ہے اور خود پیغمبری کے اعلان کی تیاریوں میں مصروف۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ احمد مشتاق، سلیم احمد، ظفر اقبال نے اگر زمین ہموار نہ کی ہوتی تو بشیر بدر کو بڑی کٹھنائیوں کا سامنا تھا، عباس اطہر کا بھی ناصر کاظمی کے بت کے توڑنے میں بڑا بھاری حصہ رہا ہے لیکن ان میں سے کوئی ناصر کاظمی کے بعد دوسرا اسٹیبلشمنٹ نہ بن سکا، دراصل آخری بھرپور پتھر بشیر بدر ہیں جس نے ناصر کاظمی کے بت کو چکنا چور کر دیا اور خود اسکی جگہ گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح نصب ہو کر رہ گئے۔

بشیر بدر نے اپنی شاعری سے کئی طلسم توڑے ہیں اور کئی حقیقتیں واضح کی ہیں۔ مثلاً انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ میر کے اتباع کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے عہد کی زبان اور اپنے عہد کے مسائل کو اپنی شاعری میں برتنے کی کوشش کریں۔ میر کی رات کا ڈانڈا آج کی رات سے ملانا اپنے عہد سے غداری اور میر کے عہد سے وفاداری ہے اور یہ کہ میر نے جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں کی بولی کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر یہ بتایا ہے کہ ہم علیگڑھ یونیورسٹی کیمپس کی زبان استعمال کریں۔

بشیر بدر اپنے دور کا نہایت کامیاب نمائندہ ہے آج کا تہ دار، پیچیدہ، اور مشکل ترین زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں، کراہتوں کے ساتھ اس کے آئینہ افکار میں جلوہ گر ہے۔ اس کا فن و فکر اسلوب کی ایک اکائی ہے۔ تازہ بہ تازہ، زندگی سے بھرپور، افکار ہیں تو شبنم سے دھلا ہوا اسلوب۔ انکا فن وہ شمع ہے جو ایک ایسے کمرہ میں رکھی ہوئی ہے جسکے تمام دریچے وا ہیں پھر بھی اس کی لو متوازن ہے۔ کبھی غیر متوازن (Lopsided) نہیں ہوئی ہے۔ شعر کو فکر و اسلوب کی اکائی بنا کر پیش کرنا کوئی مذاق نہیں ہے، یہ عمل پل صراط پر سے گذرنے کا عمل ہے۔ ذرا قدم پھسلے اور فنکار کھائی کے اندر گرا، شعر کی یہ وہ منزل ہے جہاں ناخن سے اسلوب چھیلئے تو فکر کا گودا ہاتھوں میں آ جائے اور اگر فکر کو چھیلئے تو اسلوب ہاتھوں میں آئے۔ اور جہاں شعر کے اندر کے دونوں عناصر (فکر و اسلوب) کو ناقد اپنے نوک قلم پہ رکھ کر گھماتے پھریں وہ شعر ہی جیسی چیز ہوں تو ہوں شعر نہیں۔ شعر کوئی فکر و اسلوب کا قوام تیار کرنا ہے۔ بشیر کے نمائندہ اشعار فکر و اسلوب کا قوام ہیں۔

علامت، اور امیج بشیر بدر کے اسلوب کے دو نمائندہ طریقے ہیں۔ بیسویں صدی کی تمام نمائندہ اقوام کی ادبیات کا اسلوب یہی ٹھہرا ہے۔ آج کی تہ در تہ الجھے سکھے انیتہا سائیکلو ٹک قسم کے جذبات علامت اور امیج جیسے مہین آلات کے بغیر گرفت میں بھی نہیں آ سکتے۔

ایٹم کے ٹوٹتے ہی زندگی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہے، اقدار یکسر بدل گئے ہیں۔ انسان کی گردن کی شاخ پر اب نہ وہ پرانا چہرہ ہے اور نہ دل کے اندر وہ ابھرے جذبات ہیں زندگی اور جذبات اب تہ در تہ ہو گئے ہیں۔ کوئی انکار نہ خالص انکار ہے نہ کوئی اقرار خالص اقرار ہے اب اقرار انکاری اور انکار اقراری ہوا کرتا ہے۔ جنگ کا مفہوم صلح اور صلح کا مفہوم جنگ ہوا کرتا ہے۔ الفاظ اور مفاہیم میں پورب پچھم سا رشتہ ہو کر رہ گیا ہے۔ فکر و نظر کے سارے سانچے بدل کر رہ گئے ہیں

اور حدیہ ہے کہ کوئی قدر مطلق اور جامد نہیں رہ گئی ہے۔ ایسی صورت میں علامت اور ابہام بیسویں صدی کا بہترین اسلوب ٹھہرا ہے۔ زندگی اب خانقاہوں، حکیموں کے مطب، مساجد اور نوجوانوں کے محل سے نکل کر کارخانوں، یونیورسٹیوں، اسپتالوں، کلبوں، اور پارلیامنٹ کے ایوان میں درآئی ہے اس لئے اب پرانے الفاظ کام نہیں دے سکتے۔ اب ناصر کاظمی کے عہد کی لفظیات غزل میں استعمال کرنا بیسویں صدی کی الٹرا ماڈرن لڑکی کو بیل باٹم کی جگہ گاؤں کی لڑکیوں کی چولی، کرتہ، اور شلوار پہنانا ہے۔ بشیر بدر کی غزلیں بیسویں صدی کی الٹرا ماڈرن لڑکی ہے تو ان کا اسلوب "بیل باٹم"۔

یہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے ۔۔۔ کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

پلوور (pullover) اور دیا سلائی کی طرح بشیر کا اسلوب ہیرے کا سا تراشا ہوا اسلوب ہے۔ روزبیؔ اور مورسؔ کی طرح بشیر کی شاعری میں سیاست حاضرہ کا "پنچ" ہے۔ اور بقول ایلیٹؔ شاعر کے لئے منفعت بخش یہ ہے کہ شاعر دنیا اور اشیاء کے حسن کے پار مکروہیت (horror) شان رفیع الذات (glory) اور زندگی سے اکتاہٹ (boredom) کا بھی احاطہ کرسکے، ان کے یہاں حیات و کائنات کے مکروہ چہرے بھی ہیں، زندگی اور کائنات کی شادابیاں بھی ہیں اور عہد حاضر کی زندگی اور پوری کائنات سے اکتاہٹ کا احساس بھی۔

بشیر بدر اردو غزل کا فنکار ہے۔ ایک نئی غزل خود رمزیہ اظہار اسے لطیف اور باریک علامتوں کے استعمال نے بشیر کی شاعری کو مشکل ضرور بنا دیا ہے۔ "تعمیم" بقول بلیک "احمقوں اور کم عقلوں کا شیوہ ہے حسن و خوبی کی بڑی پہچان تخصیص ہے۔" بشیر کے فن کا حسن تخصیص کا حسن ہے تعمیم کا نہیں۔ اگر مجھے ایک لمحہ کے لئے سائنسز تسلیم کر لیا جائے تو میں بشیر کی غزلوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ "ہر لفظ ایک ہیرا ہے، ہر پیکر ایک تمثیل ہے اور ساری غزلیں دکھائی دینے والی موسیقی ہیں" بشیر کا زندگی اور کائنات کے بیش اپر دیح موضوعی ہے اور جنس، لاشعور، تحت شعور، انسانی آزادی، سیاسی اور سماجی ذمہ داریاں سبھی احساسات ان کے فن میں موجود ہیں۔

جیسے یہ جانتا ہو طلسمی ہوا اب کبھی اس کو واپس نہیں لائے گی
خشک ڈنٹھل نے ایک فاختہ کی گھنی بند پلکوں کا اس طرح بوسہ لیا
بند پلکوں پہ جو پھول رکھ کر کہے آؤ ہم برف کی چوٹیوں پر چلیں
سبز قالین پر دھوپ لیٹی ہوئی سوچتی ہے نہ جانے وہ کب آئے گا
ریشمی بالوں والے کسی پھول کی گرم ٹوپی پھنسی جھاڑیوں میں ملی
سرخ خرگوش کے وہ تعاقب میں گم جھاڑیوں میں اترتا چلا ہی گیا
کچے پھل کوٹ کی جیب میں ٹھونس کر جیسے ہی میں کتابوں کی جانب بڑھا
گیلری میں چھپی دوپہر نے مجھے ناریل کی طرح توڑ کر پی لیا
لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا
گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

ڈنٹھل، گیلری، لان، کوٹ کی جیب، سرخ خرگوش، ناریل، بیل، جنگلی آم، صندوق، گرم ٹوپی، بظاہر یہ الفاظ ایسے لگتے ہیں جیسے ان کا غزل میں فٹ ہونا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ یونیورسٹی کیمپس کے الفاظ کس چابکدستی اور فنکاری سے غزل میں فٹ کئے گئے ہیں۔ اس غزل کے بعض ٹکڑے کتنے جان بخش اور رومان پرور ہیں۔

"بند پلکوں پہ جو پھول رکھ کر کہے آؤ ہم برف کی چوٹیوں پر چلیں"
"سبز قالین پر دھوپ لیٹی ہوئی"
"کچے پھل کوٹ کی جیب میں ٹھونس کر"
"لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے"
"ریشمی بالوں والے کسی پھول کی"

بشیر بدر بیسویں صدی ہی کی طرح مضمحل، افسردہ اور اداس ہے۔ اور پوری دنیا کی پسی ہوئی مظلوم انسانیت کے دکھ درد میں شریک۔

زندگی تو مجھے پہچان نہ پائی ورنہ ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں تیرا نمائندہ ہوں

ان کی رات میرؔ کی رات ہے اور نہ ناصر کاظمی کی رات، ان کے یہاں ۱۸۵۷ء کے غدر کی تباہی کا رونا ہے اور نہ تقسیم ہند کی خرابیوں کا نوحہ، آج کا انسان ایسی کسی قیامت کا استقبال کرنے کو تیار ہے جو ایک آن واحد میں اسے لقمۂ اجل بنا لے۔ انسان زندہ اس لئے ہے کہ اسکی سانس

ابھی چل رہی ہے اور مردہ اس لئے ہے کہ اس کی زندگی بے کیف ہے۔ نہ زندگی اس کے پاس ہے اور نہ موت اسے نصیب ہے۔

میں دن ہوں میری جبیں پر دکھوں کا سورج ہے
دیے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

اور غالباً اس نسل کو معاشی، سیاسی، اور سماجی ناانصافیوں سے نجات اس عہد میں ممکن بھی نہیں ہے کیوں کہ آج کی نسل "دن" ہے جو اپنی جبین پہ سورج لئے پھر رہی ہے۔ جب یہ نسل غروب ہو جائیگی تو آنے والی رات کی پلکوں پہ دیئے کی ٹھنڈی لو جگمگائیگی۔ یہ آنے والی رات نئی نسل سے عبارت ہے۔ مجاز مرحوم نے بھی کچھ اس قسم کی پیش گوئی کی تھی، یہی کہ میرے بعد نئی اور زندگی بخش کرنوں کے ساتھ صبح نمودار ہونے والی ہے اور غریبان لکھنؤ کی آخری شام مجبوراً دم توڑ رہی ہے لیکن جانے یہ شام کتنی دراز ہے کہ صبح ہونے کو نہیں آتی۔

آج کے عہد کی المناکی کا عرفان بشیر بدر اور ان کے ہمعصر شعراء مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، شہریار، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، بمل کرشن اشک، مظہر امام، کرامت علی کرامت، سہیل واسطی، عادل منصوری، پرکاش فکری، سلطان اختر، محمد علوی، شمیم حنفی، اظہر نفیس وغیرہ ہم کو بدرجہ اتم حاصل ہے۔ ان میں سے بعض اپنے مخصوص لب و لہجے، اور اسلوب و آواز کے لئے خاصے مشہور ہیں۔

پھولوں سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کوئی کہتا ہے بچا لو میں ابھی زندہ ہوں (بشیر بدر)

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا روحِ کائنات
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں
(خلیل الرحمٰن اعظمی)

قرض کسی سے مانگ کے لاؤں تھوڑی سی موہوم امید
شعروں کے تعداد کی خاطر تہذیب جذبات کروں (مظہر امام)

یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ
(اظہر نفیس)

جاگا تو اپنی آنکھ میں کچھ بھی بچا نہ تھا
بستر پہ ٹوٹے خوابوں کی کچھ کرچیاں ملیں
(پرکاش فکری)

چھاؤں میں جسم پڑا ہے لیکن
دھوپ کے نیزے پہ سر ہے اپنا
(سلطان اختر)

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تاحدِ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے
(شہریار)

نہ اتنا تیز چلے سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتہ دکھائی دیتا ہے
(شکیب جلالی)

بن جاؤں نیل کنٹھ نہ کیوں پی کے میں اسے
جو زہر اگل رہا ہے حرم آگہی کا سانپ
(کرامت علی کرامت)

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی
(ساقی فاروقی)

سائے دیواروں کی جڑ میں جا چھپے
دوپہر ہے دیکھ سورج کا جلال
(شریف اختر)

دوستو مملکتِ غم کا کوئی اور نہ چھور
اس میں خورشید کبھی کا ہے کو ڈوبا ہوگا
(حرمت الاکرام)

لیکن خال خال ایسے بھی ہیں جو آج کے شب و روز اور صبح و شام سے بے خبر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو آج بھی اپنے عہد سے سو سال پیچھے ہیں۔

ابھی زمانے سے شاید ہو سو برس پیچھے
تمہارا دل بھی سلامت ہے اور چہرہ بھی

یہ احساس دراصل انہی کو ہے جنہوں نے زندگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، خود اپنے ہاتھوں سے چھوا ہے۔ خود اپنی زبان سے چکھا ہے۔ خود اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ اور خود اپنی ناکوں سے سونگھا ہے۔ آپ کو اس اسٹیٹمنٹ پہ حیران نہ ہونا چاہیئے کیونکہ ایسے افراد آج بھی آپ کو مل جائیں گے جو خود اپنی زندگی دوسروں کے تجربات کے سہارے گذار رہے ہیں۔ یہ لوگ سگریٹ یا پائپ کی مدد سے پیتے ہیں، گویا سگرٹ نہیں پیتے پائپ پیتے ہیں اور پائپ سگرٹ پیتی ہے۔ سگرٹ پائپ کی مدد سے پینے والوں سے مجھے کوئی پرخاش ہے اور نہ چڑ، سگرٹ پائپ کی مدد سے پینا دراصل میرے نزدیک علامت ہے۔ زندگی کو دوسروں کے تجربات کے سہارے گذارنے کی۔ یہ بڑے خوش قسمت لوگ ہیں ان کا دل گردہ اور چہرہ سب کچھ سلامت ہے لیکن جس نسل کے افراد کا یہ حال ہو کہ جاڑوں میں کبھی دھوپ کو دیواروں پر سے نیچے اترتے نہیں دیکھا، رات رہے دفتر اور کارخانوں کی ڈیوٹی کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور رات گئے گھر واپس آئے۔

[ہم کیا جانیں دیواروں سے کیسے دھوپ اترتی ہوگی
رات رہے گھر سے جانا ہے رات گئے گھر آنا بابا]

وہ نسل لاکھ زمانہ شناس و ذہین سہی بعض اوقات اپنے ان تجربات کو یاد کر کے سسکیاں بھرنے لگے گی۔

بہت ذہین و زمانہ شناس تھا لیکن
وہ رات بچوں کی صورت لپٹ کے رویا بھی

آج کا نوجوان معیاری اعتبار سے جن الجھنوں میں گرفتار ہے اس کی تمثیل ملاحظہ کیجیے۔

بھرپور زندگی ہے تو دنیا ہے بے خیال
دو عورتوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہوں میں

آج کی نسل کیوں پریشان ہے، بشیر کے یہاں اس کا جواب علامتوں کی مدد سے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ نظام حیات کی خامی ہے کہ وہ انسانی کرب کا مداوا نہیں کر پا رہا ہے۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہے کہ انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن مروجہ نظامہائے حیات سوشلزم، کمیونزم، اسلام یا ... دار ... میں سے کون سا نظام ہے لیکن کوئی نظام حیات اپنے افراد کے ساتھ ایسی شفقت، محبت، اور رافت سے پیش نہیں آتا جیسا ایک ماں اپنے بچوں کے ساتھ پیش آتی ہے تو وہ نظام حیات نہ ہوا قید خانہ ہوا۔ بشیر بدر اس نظام حیات سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ میں ان حالات میں زندہ ہوں۔

آتی ہوئی ٹرین کے آگے جو رکھ دیا
اس ماں سے یہ نہ کہنا بقیدِ حیات ہوں

آج کا پڑھا لکھا طبقہ، اسکول، کالج، یونیورسٹی کے اساتذہ فسانہ نگار، شاعر، ادیب، ناولسٹ، جرنلسٹ اور انٹیلیجنشیا یعنی ہرن لادی اٹھائے اٹھائے دھوبی کے گھاٹ کے ارد گرد چکر لگا رہے ہیں اور "گدھے" عالمی مقابلہ حسن کے چیئرمین ہیں، یہ ہے آج کے عہد کا معیار تعلیم اور ذوقِ جمال۔

لادی اٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن
کیسے عجیب دور میں بیٹھا ہوا ہوں میں

دو سخت خشک روٹیاں کب سے لئے ہوئے
پانی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں میں

یہ دو سخت، خشک روٹیاں آٹے کی نہیں ہیں یہ روٹیاں علامتیں ہیں ڈگریوں کی، جنہیں آج کا پڑھا لکھا طبقہ پانی میں بھگو کر کھانا چاہتا ہے۔ آج کے ذہنکلچولس کی مفلوک الحالی اور افلاس کی کتنی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

بشیر بدر اپنے عہد کی سنسان رات کا گنبد ہے جو تنہائیوں کی گونج سے گونجا ہوا ہے۔

گنبد ہوں اپنے عہد کی سنسان رات کا
تنہائیوں کی گونج سے گونجا ہوا ہوں میں

یہ تنہائی جو آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے، زخم ہے، یقیناً آنے والا وقت اس کا علاج کرے گا کیونکہ بشیر کے خیال میں دنیا کے لوگ ماضی کے برتے ہوئے تصورِ حیات سے تنگ آ چکے ہیں اور ایک تابناک مستقبل کا خمیر گوندھنے میں مصروف ہیں۔ ساری دنیا کے پنچھی اب ایک ڈال پہ آ کر بیٹھ چکے ہیں، جائزہ لے رہے ہیں اپنے بال و پر کا، ایک نئے افق کی طرف پرواز کرنے کو بس پر تول رہے ہیں۔

سارے اور کے بچھڑے پنچھی ڈال پہ بیٹھے سوچ رہے ہیں
کن سمتوں سے ہم آئے ہیں کون دشا اب جانا بابا

آج کی نسل کو بڑی پامردی سے ڈٹے رہنا ہے کارزار حیات میں، کیونکہ ہم اپنی راہ کے پتھر بھی ہیں اور دریا بھی، ظاہر ہے ہمارے فرائض کتنے متضاد ہیں، ہمیں خود رونا ہے اور خود اپنے آپ کو بہت رو لینے کے بعد تسلی بھی دینا ہے۔ ہمیں اگر کہیں غصہ بھی آتا ہے تو اس کی تان خود اپنے ہی آپ پر ٹوٹتی ہے یہ بھی مجبوری سی مجبوری ہے۔

قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا بھی
ہم اپنی راہ کا پتھر ہیں اور دریا بھی
ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اٹھیں اپنے ہی دل پر برسیں

بشیر بدر کو یقین ہے پتھر کا جگر یقیناً ایک روز پھٹ پڑے گا اور پانی خود اپنی راہ بنائے گا۔

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنائے گا بہتا ہوا پانی ہے

بشیر بدر نے یقیناً غزل کو آب حیات پلا کر اسے بے موت مرنے سے بچا لیا ہے۔ میٹھے میٹھے عارض و گیسو کے مضامین سے قاری تنگ آ چکے تھے۔ بشیر ناصر کاظمی کے پیچھے اسی تاک میں کھڑے تھے کہ ذرا قاری کا موڈ بدلے اور وہ انہیں فکر و جذبے سے بھرپور اور جوش سے کا پیالہ پڑھائیں۔ چنانچہ قاری کا موڈ بدلتے ہی انہوں نے ان کے سامنے یہ پیالہ بڑھا دیا۔

غزلیں پہلے شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

عشق کا سوم رس پیتے پیتے لوگ عاجز آ چکے تھے۔ اب انہیں زندگی کا "نیم رس" چاہیئے تھا سو بشیر نے پیش کیا۔

ہاں! —— تو ناصر کاظمی کے بعد بشیر بدر اردو غزل کے بہت بڑے اسٹیبلشمنٹ ہیں! "چاند کا ٹکڑا" اور "موسم کا نمائندہ" وہ یقیناً نہیں ہیں، لیکن عہد حاضر کی زندگی کا حقیقی بھرپور نمائندگی ان کے یہاں ہے، اتنی واضح نمائندگی ان کے ہمعصر غزل نگار کے یہاں نہیں ہے۔

اس کو ہی لوگ چوم کے فنکار بن گئے
جس ریشمی غلاف سے لپٹا ہوا ہوں میں
(بشیر بدر)

بلراج کومل
ای۔۱۳۹۔ کالکاجی۔ نئی دہلی۔۱۹

ایک چہرہ

شب گراں کے ہزار چہرے تھے
ایک سے ایک اجنبی
خوفناک
لیکن مرے مقابل تو ایک تھا
صرف ایک
ترتیب سنگ و آہن کا معجزہ
ناتمام تخیل کا شرارہ
جو رات کے آسماں سے نازل ہوا تھا

ان جانا زرد چہرہ

نہ میرا چہرہ، نہ تیرا چہرہ
نہ جانے پہچانے لاکھ چہروں میں کوئی چہرہ

نہ میرا ہم زاد، دشمن جاں، نہ ہم سفر
جسے دیکھتا تھا میں اور سوچتا تھا
اسے حقیقت کہوں
یا اپنے کسی فراموش، بھولے بسرے
وجود کا کوئی گوشۂ شرمسار جس کو
قبول کرنے کا خوف مجھ سے عظیم تر تھا

مسعود علی فاروقی
بتوسط بشیر بدر، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رات

تخیل کے طائر نے بازو سمیٹے
بسیرا لیا نیند کے آشیاں میں
چمکتے جھلکتے ستاروں کی کلیاں
کھلیں دور، آکاش کے گلستاں میں

نشیلا اندھیرا، طلسمی خموشی، خموشی میں جاں بخش لوری کا جادو
ملائم سی خنکی، لچیلی ہوائیں، ہواؤں میں شبنم کی مرہوم خوشبو

وہ رہ رہ کے مڑتی ہوئی نرم شاخیں
وہ تھم تھم کے بہتے ہوئے نرم جھونکے
وہ کوئل کی دلدوز مدھم صدائیں
وہ جھیلوں میں لہروں کے خوابیدہ نغمے

کہیں گیت گاتی ہوئی جنبشیں ہیں، کہیں گنگناتی ہوئی سرسراہٹ
کہیں جگنوؤں کی گھڑی بھر چمک میں اندھیرے کی سہمی ہوئی مسکراہٹ

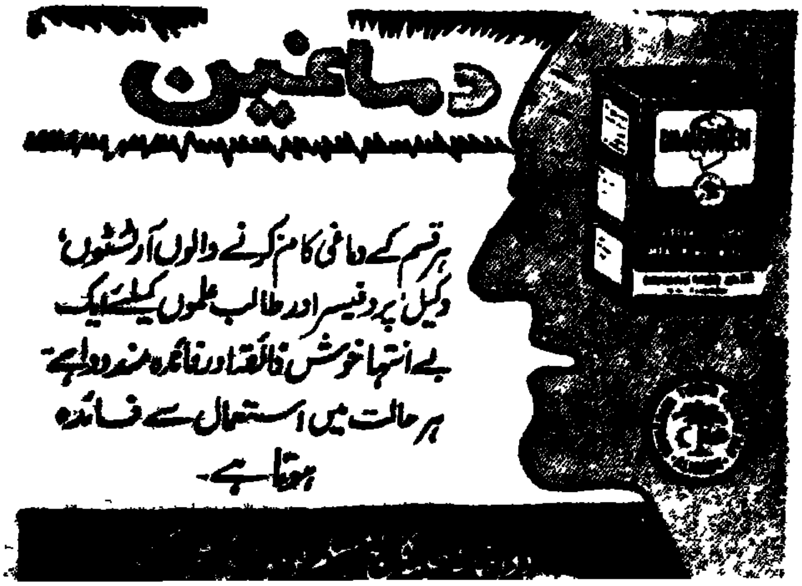
خلاؤں میں رقصاں ہے شب کی حسینہ
ستاروں کا زرتار پرچم اڑائے
نشیلے اندھیرے پہ چھائے ہوئے ہیں
سنہرے، طرب ناک خوابوں کے سائے

پُراسرار ظلمت، وہ رنگین سپنے، وہ سپنوں میں جیون کی آشائیں رقصاں
جوانی کے سہمے ہوئے ولولوں میں فراغت کی دھندلی تمنائیں لرزاں

"یہ زنداں کی زنجیر ٹوٹی پڑی ہے"
"وہ افلاس کا دیو سویا ہوا ہے"
"یہ دکھ درد کا راکشس سرنگوں ہے"
"وہ آزادیوں کا دریچہ کھلا ہے"

یہ دم بھر کو رویں جو، جو نچال سی ہیں وہ سب خواب کی دلنشیں سیمیا ہے
نہ زنداں کی زنجیر ٹوٹی پڑی ہے، نہ افلاس کا دیو سویا ہوا ہے

••


دماغین
ہر قسم کے دماغی کام کرنے والوں آرٹسٹوں، وکیل، پروفیسر اور طالب علموں کیلئے ایک بے انتہا خوش ذائقہ اور فائدہ مند دوا ہے
ہر حالت میں استعمال سے فائدہ ہوتا ہے۔

شاذ تمکنت
۱۷-۳-۱۷۱ اعظم پورہ۔ حیدرآباد

کمیں گاہ

شاذ کیا رات ہو، کیا تیز ہوا ہے مری جاں
تم کہاں اپنے چراغوں کو جلانے نکلے
تم نے دستک دی ضمیروں کے نہاں خانے پر
اژدر و مار کے مسموم ٹھکانے نکلے
تم نے رنگین نقابوں کو بھی چہرہ جانا
کتنے ہشیار ہو تم، کتنے سیانے نکلے

گر یہی نائبِ یزداں ہیں تو ابلیس ہو کون!
کون جیتا ہے یہاں حق کے رسولوں کی طرح
شام ڈھل جائے تو پھر پھول کی اوقات ہی کیا
جاوداں کون ہے صحرا کے ببولوں کی طرح
دست و بازوئے عدالت سے لہو جاری ہے
منصفی ٹھہری جرائم کے اصولوں کی طرح

ریت کو آبِ بقا، زہر کو نوشینہ کہو
خرِ پالنگ کو شبدیز کا ثانی سمجھو
سچ کو فرسودہ کہو، گفتہ کو ناگفتہ کہو
پائے طاؤس کو نقاشیٔ معنی سمجھو
چاند کو داغ کہو مہر کو انگارہ کہو
سحر و شام کو پریوں کی کہانی سمجھو

تم لطافت کی دکاں کھول کے بیٹھے ہو کہاں
جنس نایاب سہی، کوئی خریدار بھی ہو
کس کو دکھلاتے ہو پیمانۂ گل کی سرخی
کور چشم اور بھلا خواہشِ دیدار بھی ہو
نغمہ پیرائی ہے تسلیم مگر گوش کہاں
قدرِ عیسیٰ ہے سلامت کوئی بیمار بھی ہو

تم کو آدابِ جہاں آئیں تو کب آئیں گے
شاعری، سادہ دلی، بے خبری کچھ بھی نہیں
یہ جہاں ایک کمیں گاہ ہے، فردوس نہیں
حسنِ ظن کچھ بھی نہیں، خوش نظری کچھ بھی نہیں
جانبِ پشت بھی دیکھا کرو، گھات ہے گھات
ایک منزل ہے مگر ہم سفری کچھ بھی نہیں

■■

شاذ تمکنت

پچھلے پہر کی سیڑھیوں سے

پھر پچھلے پہر کی سیڑھیوں سے
اک گیت اُتر رہا ہے دیکھو
پھر اڑ کے شاخ شاخ پر جا
کس ناز سے مڑ رہا ہے دیکھو

پُر شور ہوا، گھٹا، سمندر
دھنکی ہوئی نم فضا کا سونا
برفیلی سفید چوٹیوں پر
آہستہ خرام بہہ رہا ہے
شفاف سنہری وادیوں میں
پھولوں سے ڈھکا ہوا دریچہ
دروازۂ نیم باز کب سے
اک چاپ کا درد سہہ رہا ہے

محراب میں آگ جل رہی ہو
لب بستہ، شکستہ وائلن پر
رقصندہ ہیں ناشنیدہ تانیں
یہ شخص ہے کون، نام کیا ہو!
بکھرے ہوئے بال اداس آنکھیں
پتھر کا کوئی مجسمہ ہے
اک نغمۂ بے صدا ہو لرزاں
سناٹا یہ کس سے کہہ رہا ہے
اب میرے تمہارے راستے میں
کچھ بھی تو نہیں بجز سمندر
میں پار کہاں اتر سکوں گا
تم آ نہ سکو گی مجھ تک اُڑ کر
انفاس کا رہ گیا ہو رشتہ
اس جاتی ہوئی بہارِ جاں سے
اک آخری پھول اور چن لو
میں اپنی تمام کشتیوں کو
ساحل پہ جلا رہا ہوں سن لو

شاذ تمکنت

فون پر

شوخ، شائستہ، شگفتہ رُو، شریر
برق کی لہروں کی ارجُن دیر کی
چٹکیوں میں نیم کش سونے کا تیر
زیر و بم میں جیسے ترغیبِ گناہ
بات میں اک لوک سی کھُبتی ہوئی
ریشمیں سیّال، جسمِ صوت پر
ہچکی کی کھونپ سی چُبھتی ہوئی
گفتگو کے بیچ میں جلتے ہوئے
مُرکیوں کے نیلے کا نوری چراغ
کچھ رکاؤ، کچھ بناؤ، کچھ سبھاؤ
کچھ شفق آلودہ بن چھلکے ایاغ
راز اندر راز جانے کون ہے!
دے رہے ہیں لَو مرے سینے کے داغ
اجنبی آواز جانے کون ہے!

■■

ماورا

مجھے چارہ گر سے خبر ملی
وہ پھر آ گئی یہیں شہر میں
مجھے یوں لگا کہ مرے لئے
کوئی آسرا نہیں شہر میں
مجھے اُس سے کہنا ہے بس یہی
سرِ راہِ شورشِ زندگی
کہ ملے تو آنکھ چُرا نہ لے
کہ جو درد روح میں بس گئے
کہ ہم ایک ایک کو جس طرح
پسِ ماہ و سال ترس گئے
یہ وہ غم ہیں ماضی و حال کے
جو نہیں ہیں بس میں وصال کے

■■

خوراک

ضائع نہ کریں

دوسرے کتنی لوگوں کو خوراک کی ضرورت ہے۔



گھروں، پارٹیوں، ہوٹلوں اور کلبوں میں کھانا ضرورت کے مطابق ہی لیجئے۔

بچوں کو بھی یہی سکھائیے۔

اس طرح آپ اپنا پیسہ بچائیں گے اور ملک کا بھی۔

دانہ دانہ قیمتی ہے

اسے ضائع نہ کریں

davp 73/329

وحید اختر
آئنہ بھون، سول لائنز، علی گڑھ

خَلِیفَۃٌ فِی الْاَرْض

(۱)

یا خدائے ذوالجلال
خالقِ موجود و ناموجود، ذاتِ لایزال
عرش و کرسی، سلسبیل و کوثر و لوح و قلم تیرا جمال
جن و انس، ابلیس و جبریل و ملایک تیری قدرت کا کمال
جنتِ موعود و جلوہ ہائے ناموجود کے پہلو بہ پہلو رقص کرتا خاک کا ننھا سا
ذرّہ، یہ زمیں
تو نے اس ذرّے کو دی ہے عرش و کرسی کی بلندی، آسماں کی وسعتیں
تو نے آدم میں مجسّم کر دیے اپنے کمالات و صفات
اور کراں تا بہ کراں پھیلی خلاؤں میں بنایا خاک کے پُتلے کو تصویرِ حیات
دی اُسے تخلیق و آزادی پہ قدرت
روح کو اُس کی بنایا شعلۂ عرفانِ نفس و کائنات
عدل و صدق و حق کا ہے معیار یہ محدود ذات
ایک ننھا سا شرارہ اور اُس پہ کل خدائی کا ہے بار
اک وجود اور اُس کو حلقے میں لیے ہے ہر طرف سے ظلمتوں کا بحرِ ناپیدا کنار
نور مبہم، اور ظلمت آشکار
زندگی مجبور اور مرگِ عدم با اختیار

یہ امانت دارِ تخلیقِ آدمی
یا
عدم ظلمات، اور اندھا خلا
کون ہے نائب ترا
میرے خدا؟

(۲)

غیر موجودات پر ہے مشتمل یہ کائنات
طمطراقِ نعرۂ و زر، لعل و گوہر کا ثبات
تشنگی کا ریگ زار، آسودہ کامی کی فرات
خواہشوں کے دشت و صحرا، آرزو کی کائنات
حسرتوں کے سرد لاشے، جستجو کے گرم ہات
جسم کے مصروف دن اور روح کی بے چین رات
درمیاں میں وقت کا کچھ فاصلہ رکھ لو تو سب نابود ہیں
شمع بجھ جائے تو یہ سارے مناظر حلقہ ہائے دود ہیں۔
صرف کچھ انساں، ہجومِ غیر موجودات میں موجود ہیں

ہست پر نابود حاکم
واقعی پر وہم ناموجود حاکم
شمع پر ہیں حلقہ ہائے دود حاکم
آدمی
یا
آدمی کی شکل کے نابود و ناموجود حلقہ ہائے دود
کون ہے نائب ترا
میرے خدا؟

(۳)

لاؤ لشکر طبل و اورنگ و علم، نقارے، حاجب، چوبدار
بم، میزائل، آسمانی لیپ، راکٹ اور خلائی شہسوار
قحط و سیلاب و وبا، غصے سے شق ہوتی زمیں، آتش بہ سینہ کوہسار
خوردنی، ناخوردنی اجناس کے مسروقہ گودام
اور اشیائے ضرورت کی ڈکیتی کے حصار
ظلم و استحصال و ملکیت کے حافظ شرع و دستور و قوانینِ تشدد آشکار
قاتل و سارق کے خانہ زاد ہیں نظم و نسق کے اختیار
مظہر شانِ خداوندی کی ہیں مجبوریاں نادیدنی، ناگفتنی
فاقہ و بیماری و افلاس کے روندے ہوئے انساں چچوڑتی ہڈیوں کے واسطے
بھونکتے اک دوسرے پر، نوچتے اک دوسرے کی ہڈیاں
محنت اور ایمان داری ہے سگِ شہرِ ہوس
آدمی

یا

آدمی پر حکمراں قانون کا ظالم حصار
کون ہے نائب ترا
میرے خدا؟

(۴)

ہر طرف آباد ہیں بالشتیوں کی بستیاں
بانس کی ٹانگوں پہ چلتی قد آدم ہستیاں
ذہن و دل کی نابلوغت کو چھپا لیتی ہیں لمبی لمبی نقلی ڈاڑھیاں
گردنیں کوتاہ، ماتھے تنگ، لیکن توند لالہ کی دکاں
بسنے پن کی ہیں تلافی اونچی اونچی کرسیاں
پہلوؤں میں زیوروں سے سونے چاندی کے لدی نامردی کی داستاں
مسند کم خواب و دیبا پر بھی کلدار آنکھوں کو نچاتی پتلیاں
کڑکڑاتے کاغذوں اور چھپاتی دھات کے رنگیں کھلونوں کے لیے
سلکاریاں
شہر میں بالشتیوں کے سر بہ زانو، اور کمر سے ہیں خمیدہ آدمی
سر اٹھا کر کھڑا ہو جائے پورا آدمی
عدل کی مسند بچھا کر، کمتری کی گرہ کو میزان بنا کر
حکم دیں گے آدمی کے قتل کا بالشتیے
آدمی

یا

آدمی کی شکل کے بالشتیے
کون ہے نائب ترا
میرے خدا؟

(۵)

یا خدائے ذوالجلال
جنتِ موعود، تیرے بارشِ انوارِ ربوبیت کا جمال
تیری اس موجود دنیا میں تو ہے نابود حاکم
ظلم و استحصال کا قانون حاکم
آدمی پر آدمی کی شکل کے بالشتیے ہیں حکمراں
کیا تری موعود جنت میں بھی ہے نابود کے اندھے قوانین اور انساں شکل
بونوں کا مقام؟
کیا ہمیں ہوگا وہاں بھی صرف اپنے خونِ دل پر اختیار؟
کیا وہاں بھی کرنا ہوگا ہم کو ہر لمحہ سوال
کون ہے نائب ترا
میرے خدا؟

عزیز قیسی
۲/۳۹۹ شاستری نگر - گورے گاؤں بمبئی - ۶۲

کابوس

اِدھر سے دیکھو تو — اُس کے چہرے کا یہ پروفیل کتنا سہانا ہے۔
— وہ ایک پیاری، شفیق، سادہ، حسین ماں ہے، اور اس کی
گودی میں ایک بچہ ہمک رہا ہے۔ وہ اپنی چھاتی کو کھولتی ہے
اور اپنے بچے کے سوکھے ہونٹوں کو اپنے لہو کے رس سے بھگو رہی ہے
اور اس کی پاکیزہ آنکھ کے کناروں سے نور جیسے امڈ رہا ہے

اُدھر سے دیکھو تو — اُس کے چہرے کا یہ پروفیل کتنا ڈراونا ہے۔
— وہ اک بھیانک مہیب بدشکل کالی ڈائن ہے۔ دانت
جس کے لہو سے بھیگے ہوئے ہیں اس کے بدن پہ کانٹوں سے بال ہیں
جلد اُس کی جذام کے پیپ سے بنی ہے اور اس کا یہ ہاتھ
جیسے لوہے کا کوئی پنجہ ہے۔ انگلیاں خنجروں سی اکڑی ہوئی
ہیں۔ اور ناخنوں میں نکیلے نشتر لگے ہوئے ہیں
وہ اپنے بچے کے پیٹ کو چیرتی ہے اور اپنی ہتھیلی اور
انگلیوں پہ پھیلے لہو کو رہ رہ کے چاٹتی ہے

میں سوچتا ہوں —
یہاں سے دیکھو تو اس کے چہرے کے دونوں رُخ دیکھ پاؤگے
یہاں سے مگر کون دیکھتا ہے۔
یہ وہ جگہ ہے جہاں پہ مجھ جیسا کوئی پاگل ہی پاؤں دھرتا ہے
تم ذرا سا بھی لڑکھڑاؤ تو نیچے کھائی ہے اجگروں کی

■■

غزل

ہر لمحہ بے شرم سوالی لگتا ہے
جینا تو اب تو ماں کی گالی لگتا ہے

جب سے پیٹ پہ پاؤں رکھا ہے دنیا نے
ہم کو دل کا درد خیالی لگتا ہے

اب وہ عالم ہم پہ نہیں آنے والا
سوکھا جنگل جب ہریالی لگتا ہے

عکس در عکس ہے آئینہ در آئینہ
پھر بھی یہاں ہر شخص مثالی لگتا ہے

دفن ہے دل کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کچھ
— سینہ لیکن خالی خالی لگتا ہے

آخر آخر، حاصل جاں و حاصل دل
بس پامالی ہی پامالی لگتا ہے

■■

اک دن یہ دھرتی نیلا امبر ہوتی
کاش کسی سر پہ میری چادر ہوتی
جن چیزوں سے دیواریں گھر بنتی ہیں
ایسی کوئی چیز ہمارے گھر ہوتی
دونوں وقت پلیٹیں ہم سے کہتی ہیں
کھانے کی اک میز ہمارے گھر ہوتی
گدّے لحافوں کے اکثر بدلے جاتے
دودھ سی روز دُھلی ہوئی چادر ہوتی
چھک چھک کرتی ریل گزرتی آنگن سے
گڑیا ہوتی گڑیا کی موٹر ہوتی
برتن گھستے گھستے آخر راکھ ہوئے
جن ہاتھوں میں مہندی کی جھالر ہوتی
خواہش جرم نہیں ہے اُسکی خواہش تھی
اک اچھی سی لڑکی ہم بستر ہوتی
کہرے کا یہ کمبل دھوپ ہٹا دیتی
تتلی سرخ شگفتہ سیبوں پر ہوتی
تن ڈھکنے کو بس اتنا ہی کافی تھا
پھولوں اور پتوں کی اک نیکر ہوتی
دنیا کے بدصورت حصے ڈھک جاتے
اپنے پاس کوئی ایسی چادر ہوتی

بشیر بدر
شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

غزلیں

چھوڑ کر خاکی بدن آب و ہوا بن جاؤں میں
ایک دن سو کر اٹھوں اور دوسرا بن جاؤں میں
بے زباں، بے چشم ہیں سب آب و آتش، خاک و باد
کس کی آنکھیں کس کے لب کس کی صدا بن جاؤں میں
ہر طرف گہرے سمندر، چار سو پھیلے پہاڑ
آنے والوں کے لیے اک راستہ بن جاؤں میں
اے خدا اس دن مجھے تو تتلیوں کا روپ دے
پھول جیسی بچیوں کی جب دعا بن جاؤں میں
ابر اُٹھے جب بجھانے چاند تاروں کے چراغ
جھاڑیوں میں جگنوؤں کا سلسلہ بن جاؤں میں
برف کے گالے جو کل ہوں گے چھٹکتا آسماں
گھونسلوں میں ان فرشتوں کی غذا بن جاؤں میں
منتظر معصوم بچے تاکتے ہیں راستے
اک غزال زخم خوردہ کی صدا بن جاؤں میں
جس کو ہر شب زخم تاروں پہ سجانا ہو بدن
کاش اُس عورت کی آنکھوں کی حیا بن جاؤں میں
دودھ پیتے وقت اکثر سوچتا رہتا تھا میں
سب کی مونچھیں چھین کر سب سے بڑا بن جاؤں میں
روز دنیا دیکھنے آتے ہیں نابینا فقیر
ایک دن کیا ان کی آنکھوں کی ضیا بن جاؤں میں
چھوڑ کر خاکی بدن آب و ہوا بن جاؤں میں
ایک دن سو کر اٹھوں اور دوسرا بن جاؤں میں

راج نرائن رازؔ
۲۹/۳۰ - ایسٹ پٹیل نگر - نئی دہلی - ۸

جیسے فسانہ ختم ہوا...

کمرے کی خاموش فضا میں
— اک مانوس سی خوشبو تھی
ملکی سانسوں کا سرگم تھا
کنچن کایا قرب کی حدّت سے نکھری تھی
سورج کی ایک ایک کرن اُجلی تھی

پلکیں بوجھل، آنکھیں بند، حواس مسخّر
چڑھتی دھوپ میں اک نشّہ تھا

اس کو فسانہ اک لکھنا تھا

کمرے کی خاموش فضا خالی تھی
قرب کی خوشبو
کنچن کایا
سانس کے سرگم —
سب تحلیل ہوئے تھے
جیسے فسانہ ختم ہوا تھا!

ڈھلتی دھوپ میں زہر بجھا تھا

وہ بیٹھا تھا۔
— جیسے ہاری فوج سے بچھڑا ایک سپاہی
اپنی پسپائی پر گُم سُم
جسم کے اوپر تیغ سے لکھی تحریروں پر نادم
سوچ رہا ہو — زخم شماری سے کیا حاصل!

اک جھونکا تھا — تیز ہوا کا — آیا اور گیا!

وہ پتھر کے بُت کی صورت بالکل بے حس بیٹھا تھا
— رات کا لمبا، گہرا سایا پھیل گیا تھا۔
■■

مختصر نظمیں

اُداسی

مری روح ہے ایک گہری اُداسی
کہ اِک دیو داسی
مرے خون کی ہے کئی دن سے پیاسی ..

قابلِ نفرت

کالا بریہمن، گورا مہتر
اور موچھیلی عورت
تینوں وجہ نحوست
تینوں قابلِ نفرت ..

کھردرے الفاظ

کچیلے کپڑے پھٹے پرانے
کہ جن میں سے جھانکتی ہیں گوری مڈول راہیں
قبول صورت بدن کا ہے پیرہن دریدہ
لطیف مضموں ہے اور الفاظ کھردرے ہیں ..

جیون مرن

تیرے السائے اور نیند بھرے نین
یہ بچپن، بے نیاری کا یہ بانکپن
تیرا لس سرا چیت منن
میرا مَن
میرا جیون، مرن ..

بسرے وغیرہ

عجب ہیں یہ مایا کے نخرے
سدا سوچتا ہی رہا ہوں
کیسے سوچ نے میرے نخرے
کہ یاد آ رہے ہیں مجھے آج بسرے 'وغیرہ' ..

کرشن موہن
بی ۱۳۴۔ پنڈارا روڈ۔ نئی دہلی

گیان مارگ کی نظمیں

'کام' کی مسکان

'کام' کی مسکان تیرے گیان کو ڈھانپے ہوئے ہے
دھیان کو بھانپے ہوئے ہے
اس لئے تو
دل ترا 'کانپے ہوئے ہے
آتما' جیون کی لمبی دوڑ میں ہانپے ہوئے ہے ..

سنسار

دو رنگ ہیں نیکی اور بدی
دونوں کا درپن ہے جیون
سنسار ہے ایک اننت ندی
جسکی لہریں ہیں کرم گتی
ہم سنساری اس ندی کو
تن من ارپن کر دیتے ہیں ..

... نہیں تو

یہ سنسار اک شبد ہے، ارتھ اس کے نکالو
اسے سوچ لو، نوچ ڈالو
کھنگالو
گلے سے لگالو
اسے رات دن یاد رکھو
نہیں تو ......
نہیں تو اسے تیاگ دو، ارتھ کو، آتما کو بچالو، سنبھالو
یہ ہر لمحہ بڑھتے ہوئے شبد کے سر پہ بیراگ کی دھول ڈالو
اسے بھول ڈالو ..

غزلیں

لطف الرحمٰن
ٹی ۔ این ۔ بی کالج ۔ بھاگلپور

ہوس اہلِ ہوس کی بزم میں ہے سرخرو اب بھی
بڑی مشکل میں ہے اہلِ وفا کی آبرو اب بھی
لہو پر اُن کے پردہ ڈال کر دینا بہت خوش ہے
ہوا تو چیختی پھرتی ہے لیکن کو بہ کو اب بھی
وہ مجھ پر کھل چکا ہے سرحدِ امکان تک لیکن
مجھے شعلہ صفت رکھتی ہے اسکی جستجو اب بھی
یہ کیسے مجھ میں کوئی اک خلا بھرنے نہیں پایا
درِ دل سے یہ ٹکراتی ہے کس کی آرزو اب بھی
دبی چوٹوں کا پرچم کھول دو بہتی ہے پُروائی
ہمارے کاسۂ دل میں ہے باقی کچھ لہو اب بھی
دلوں کے شور میں اکثر پتہ اپنا نہیں ملتا
ستاروں سے مگر رہتی ہے تیری گفتگو اب بھی
میں خود ہی کاٹتا رہتا ہوں اپنا راستہ پیہم
نہیں ہے کوئی مجھ سے بڑھ کے خود میرا عدو اب بھی
کہوں کیا ادوجو گذری سمجھ لو خیریت گذری
مگر دل میں ہے کوئی زخم محتاجِ رفو اب بھی
مٹے باقی کے شیدا اٹھ گئے یہ کس تمنا میں
لٹاتا ہے کوئی خونِ نابِ سوزِ گلو اب بھی

مدحت الاختر
شعبۂ اردو، فارسی ۔ ناگپور مہا ودیالیہ ۔ ناگپور

درد کیا چیز ہے آنسو کی حقیقت کیا ہے / آج جانا کہ ترے پیار کی قیمت کیا ہے
تو ہی جب گھر میں نہیں ذوقِ تکلف کیسا / اب در و بام کی آرائش و زینت کیا ہے
ایک اک گام پہ یادوں کو صدا دیتا ہوں / لوٹ آؤ کہ ابھی ترکِ رفاقت کیا ہے
دل دکھاتے ہیں یہ بے سود بہانے تیرے / صاف کہہ دے کہ تجھے میری ضرورت کیا ہے
کوئی پوچھے تو تجھے یاد بھی کیا آئے گا / لمس کیا چیز ہے ہونٹوں کی حلاوت کیا ہے
شہر ہو دشت ہو محفل ہو کہ تنہائی ہو / اب وہ اندیشۂ رسوائی الفت کیا ہے
میں بہت دور چلا جاؤں گا دنیا سے تری / آسماں سر پہ ہے گھر کی ضرورت کیا ہے
کوئی دنیا میں محبت کا طلب گار نہیں / آخر اس جنسِ فرومایہ کی قیمت کیا ہے
زندگی یوں ہی گزر جائے گی لمحہ لمحہ / دیکھتے جایئے انجامِ محبت کیا ہے

کٹ گئی عمر محبت کے گماں پر مدحت
پوچھتا پھرتا ہوں اک اک سے محبت کیا ہے

غزلیں

مظفر حنفی

نزد پرانی نظامت سیہور (بھوپال)

اس طرح جو بنیاد سے انجان رہے گی
قدموں پہ ستونوں کے یہ چھت آن رہے گی

راتیں ہی غنیمت ہیں، جھگڑتے تو ہیں کچھ لوگ
دن میں یہ گلی اور بھی سنسان رہے گی

سوچا تھا یہ کس نے کہ سبھی ذرّہ کی بستی
افراد کی بہتات سے ویران رہے گی

دروازہ ہی ہوگا نہ کوئی نام کی تختی
آئندہ مرے گھر کی یہ پہچان رہے گی

غم ہوئے سے بڑھ کر نہیں سر کی کوئی توہین
ہاں کج کلہی سے تو ذرا شان رہے گی

ہمسائے کے گھر آئی ہوئی ہے جو قیامت
کچھ دن کے لئے میری بھی مہمان رہے گی

تہذیب کی ناخن پہ مظفر ہے تو مظفر
اندر سے جبلّت مری حیوان رہے گی

عتیق اللہ

۲ - مارگیٹ - اجین (ایم - پی)

وہ خلا تھا کہ ہواؤں کا بہت زور ہوا
دونوں جانب میں تسلسل سے کئی ڈور ہوا

میں کسی چیخ کا انکر تھا کہ اس جنگل میں
جس جگہ پھوٹ کے نکلا ہوں نیا شور ہوا

دائرے بند ہتھیلی میں بھی مجھے بھینچے تھے
میرا اظہار تو ہونا تھا بہر طور ہوا

کان پہ کھینچے ہوئے حرف کی مہلت تھی میں
تیری تحویل میں آجانے سے شہ زور ہوا

آئینے لے کسی لمحے کی روایت ہوں میں
میری نسبت سے اگر از سر نو غور ہوا

مری طرح ہے بہت سخت جاں ہزار برت
زمانہ کھیل نہ سمجھے تو اپنا وار برت

بغیر جادو جگائے گزر نہ جا یوں ہی
قرار آزما — یا پھر — لہو کی دھار برت

فشار سنگ میں پیوست کر کے بھول نہ جا
مرا یقین برت ۔ اپنا اعتبار برت

ہر ایک چیز مری دسترس سے باہر ہو
میں تیرے ہاتھ لگا ہوں تو بار بار برت

مرے علاوہ کوئی بھی مرا شریک نہیں
نتیجہ ایک ہی نکلے گا تو ہزار برت

صادق
۱۳۹-۱۰-۲ وزیر آباد - ناندیڑ

کبھی

کبھی
اپنی سوچوں کے رتھ روک کر
تم نے دیکھا نہیں
کہیں بھی
کسی چیز کے کوئی معنی نہیں
پھر بھی
کوئی نہ کوئی خرابی
بھٹکتے ہوئے
خود بخود
سطح سے
ٹوٹتے شہر میں
بیت کر
سامنے آگئی
اور ساری اُمس
دیر تک
گیلری میں
کھلے بال بیٹھی رہی
اس کی نظروں کی
چھوٹی بڑی سوئیاں
کھڑکیوں سے گزر کر
اچانک کسی بات پر جم گئیں
بند کمرے میں
دیوار کے جسم پر
موسموں کے بدلنے کا
کوئی اثر ہی نہ تھا
پھر بھی اک روشنی
سیڑھیاں چڑھ کے
زنجیر ہر دو ار کی
کھٹکھٹانے لگی
اپنے در کھول کر
دیکھ لو کہ کہیں بھی
کسی چیز کے
کوئی معنی نہیں
— اور تم
ان اندھیروں اُجالوں کی زد میں
خوشی اور غم جھیلتے
پھر اُپھنتے ہوئے
دلدلوں کے
سرابوں میں
پھنستے چلے جارہے ہو ——

وحید الحسن
سی۔ڈی۔پی۔آر۔ٹی۔آئی بیہال۔رانچی ۸

شعلۂ تاب

لمحوں کو چھوٹے حصوں میں بانٹنے والے نے
جب ایک ٹکڑا اٹھایا
تو اس پر تیری مسکراہٹ کی پرت لپٹی تھی
اُس نے اُسے صاف کرنا چاہا تو
دل پر ایک خراش سی لگی اور
پلکوں پر خون کا ڈھلا ہوا قطرہ نمودار ہوا
جس رومال میں وہ جذب ہوا تھا
میں اُسے لے کر تیری خواب گاہ میں آگیا ہوں
میں نے گستاخی کے پردوں میں
جذبے کی شدّت کی آگ لگا دی ہے
تو اگر چاہے تو اس کی راکھ سے
اپنی سیاہ آنکھوں کو کچھ اور بھی سیاہ کرلے
شاید پھر میرا عکس اُس میں اُتر سکے
لیکن وہ لہو کا قطرہ جو اس رومال میں جذب ہے
اگر تو نے اس سے اپنی آنکھیں صاف کی
تو کیا لمحے کی وہ مسکراہٹ
لپکتے شعلوں کی تاب لائے گی؟

——

غزلیں

سید احمد شمیم

۴۳ ـ نیو بارہ دری (ایسٹ) ، ساکچی جمشید پور

پھول، خوشبو، جام، ساون، شعل پیمانہ چلے
جن کو چلنا ہے ہمارے ساتھ میخانہ چلے

یوں چلے لہرا کے جیسے موج بل کھائی ہوئی
یا سحابِ مست جیسے چال مستانہ چلے

زلف سنبل، پھول لب، رخسار پر رنگِ شفق
جنبشیں آنکھوں کی پلکوں پر کہ پیمانے چلے

اُن سے کہہ دو پتھروں کے بت بنے بیٹھے ہیں سب
اب نہ یہ جادوئے چشمِ نرگسانہ چلے

شکریہ احباب کا جن کی محبت کے طفیل
مجھ سے کچھ آگے ہی آگے میرا افسانہ چلے

اس گلی میں تیر کا ہمسر نہ آیا پھر شمیمؔ
وہ جو قاتل کو دعا دے کر فقیرانہ چلے

ذکا صدیقی

گھیر باز خاں، گنج قدیم ـ رامپور

کہیں خیال بھی پیکر دکھائی دیتا ہے؟
یہ خواب مجھ کو ہی کیونکر دکھائی دیتا ہے!

میں اپنے آپ کو دشمن کی طرح دیکھتا ہوں
کہ ایسے دور کا منظر دکھائی دیتا ہے

ہماری پیاس نے ہم کو کہاں ڈبویا ہے
جہاں بھی صحرا ہے سمندر دکھائی دیتا ہے

تمہارے شہر میں کوئی گناہ گار نہیں!؟
سبھی کے ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے

یہ کون شخص ہے، یہ کس قدر اکیلا ہے
یہ شخص بھیڑ میں اکثر دکھائی دیتا ہے

وہ کون تھا یہ، جسے اپنی جستجو تھی کبھی
فرازِ دار پہ اک سر دکھائی دیتا ہے

یہ کیسی بے حسی ہے، کوئی اضطراب دے
اے دردِ تشنگی! مجھے تو ہی سراب دے

اے زندگی! فریبِ حقیقت نہ دے مجھے
آنکھیں ترس گئی ہیں کوئی اور خواب دے

میری طرف سے کوئی کہاں تک کرے سوال
میری طرف سے کوئی کہاں تک جواب دے

سب کچھ تو مجھ سے چھین چکی اے شبِ فراق
اُمیدِ صبح کا نہ مجھے اب عذاب دے

اس پتھروں کے شہر میں کس کو پکاریئے
صحرا نہیں کہ میری صدا کا جواب دے

غلام مرتضیٰ راہی
احمد منزل، سرائے رحمان علیگڑھ

غزل

ناؤ جب ڈوب رہی تھی تو اُتر لینا تھا
آخری وقت کنارا مجھے کر لینا تھا

نوکِ خنجر پہ مجھے اُس نے اُچھالا ورنہ
کاٹ کر سر کو مرے پاؤں پہ دھر لینا تھا

شاخ تا شاخ وہی بے سر و سامانی ہے
نئے موسم کا انہیں کچھ تو اثر لینا تھا

گرمیوں بھر مرے کمرے میں پڑا رہتا تھا
دیکھ کر رُخ مجھے سورج کا یہ گھر لینا تھا

ہو گئی تھی لبِ دریا جو رسائی تیری
ایک کوزے میں مرے واسطے بھر لینا تھا

اُس کے سجدے میں اب احساس ہوا دکھ سے
تیرا احسان مجھے اپنے ہی سر لینا تھا

■■

علی عباس اُمید
انیس منزل۔ نور محل۔ بھوپال

دھواں دھواں عکس

نارسائی کی فضا کیا معنی
بے نوائی کی گھٹا کیا معنی
اصطلاحوں کی بدلتی ہوئی رنگت کیسی
زندہ لفظوں کی پگھلتی ہوئی صورت کیسی
کیوں ہر اک لمحہ کو درکار ہے جینے کا خراج
قحط غمخواری ہے کیوں محفلِ یاراں کا مزاج
پھول پر قطرۂ شبنم تو بجا تھا لیکن
کھاری پانی کی ٹپکتی ہوئی بوندیں کیسی
دور تک ــــ ختم جہاں ہوتے ہیں سمتوں کے حدود
قحط امروز بھی ہے (قحط شب و روز بھی ہے)
کوئی ایسا نہیں جو چوم لے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی جبیں
تشنگی بھی نہیں بن پاتی ہے سوکھے ہوئے ہونٹوں کی امیں

آگہی قید ہوئی، تھم گیا ذہنوں کا سفر
دلبری سو گئی ماحول کی تپتی ہوئی چٹانوں پر
اجنبیت کے جواں نخل میں کونپل پھوٹی
سانس محبوس ہوئی ذات کے زندانوں میں
دور تک ــــ ختم جہاں ہوتے ہیں سمتوں کے حدود
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے نہاں خانوں میں!

تپتے حالات کے صحرا میں بھٹک کر شب و روز
سارے بکھرے ہوئے لمحات کو یکجا کر کے
میں ہر اک سمت صدا دیتا ہوں دلداری کو
اپنے پاؤں میں چبھوتا ہوں ہر اک راہ کے خار
اور پھر ان پہ طلب کرتا ہوں روٹھی ہوئی غمخواری کو!

کاش ٹپکے کبھی ماحول کی آنکھوں سے ندامت کا لہو
دھڑکے کانپتے ہاتھوں کے فسردہ لب کو
پھیلتے لفظوں کے ہونٹوں کی حلاوت مل جائے
بجھتی آنکھوں میں حقیقت کا جواں نور آ جائے
سونے طاقوں پہ کئی شمعیں فروزاں ہو جائیں
اور ہم ــــ سوچ کے ماضی کو پشیماں ہو جائیں!! ■■

صلاح الدین پرویز
۹۳۔ سرسید نگر۔ دودھ پور۔ علی گڑھ

ہمارا خدا ایک تھا

اس کی دونوں مٹھیاں خالی کنستر کی طرح بجتیں
ہمارے گاؤں میں جب بھی وہ آتا ——

ہمارے گاؤں میں جب بھی وہ آتا
عورتیں گھر سے نکل کر اسکو پتھر مارتیں
لڑکیاں بچوں کی چھوٹی نعش
وہ چھوتا برف بنتیں
برف سے پانی
ہزاروں مرد آ جاتے
دلاسے کی ہتھیلی میں اسے پانی پلاتے
ٹوٹ جاتے، لوٹ کر وہ گھر نہیں جاتے

ہمارے گاؤں میں جب بھی وہ آتا
ایک میلہ سا نظر آتا
آنگنوں میں زرد پتے
اپنی مائیں اپنے کندھوں پر چڑھائے
موت کے سارے پرندوں کو بیچ دیتے

ہمارے گاؤں میں جب بھی وہ آتا
آگ خیمے سے نکلتی
(اور پھر وہ کہ جیسے ایک مٹھی آسماں ہم سب زمیں پر تھے)
تو وہ خالی کنستر کی طرح مٹھی بجاتا
گاؤں میں جب بھی وہ آتا
آگ خیمے سے نکلتی
اس کی دونوں مٹھیاں خالی کنستر کی طرح بجتیں ——

سلیم شہزاد
۲۲۳ منگلوار وارڈ۔ مالیگاؤں (ناسک)

غزل

ہجومِ شہر میں گم ہو گیا ہوں
خبر جس کی نہیں وہ حادثہ ہوں

نکالو مجھ کو، اک تاریخ ہوں میں
تہِ سنگ ایک مدت سے پڑا ہوں

نہ جانے کتنے نوری سال گزرے
ابھی تک فاصلے کی ابتدا ہوں

ندی ہوں میں بلندی سے اترتی
سمندر اور صحرا کی ہوا ہوں

ہوں ذہنوں پر مسلط آس بن کر
بڑا رنگیں، سجیلا واہمہ ہوں

کوئی ہر وقت خود کو ڈھونڈتا ہے
مرے اندر میں اک غارِ حرا ہوں

سلیم اک شخص یاد آتا ہے مجھ کو
میں جب تصویر اپنی دیکھتا ہوں

غزلیں

حکیم منظور
۶۰ بہو کالج دال پنیاں، جموں

سیدھا بہت تھا جو اسے اُلٹا کہا گیا،
اس شہر میں وجود کو سایا کہا گیا
روئی کے گالے بن کے بکھر جائے گی زمیں
سمجھا گیا نہ ہم سے کہ یہ کیا کہا گیا
کچھ اس سے آگے سوچنا منظور تھا کسے
دو آنکھوں والی چیز کو چہرا کہا گیا
خوش کتنے ہو گئے تھے سبھی کور چشم جب
سورج کو دوپہر کے بھی اندھا کہا گیا
یوں بھی چھپایا جاتا رہا اپنا چھوٹا پن
اونچا بہت تھا جو اسے چھوٹا کہا گیا
ہوتے رہے ہیں آپ ہی مقتول مطمئن
ہر قتل کو جب ایک تماشا کہا گیا
توڑے گئے نہ تجھ سے جو منظور آئینے
بزدل کہا گیا تجھے اچھا کہا گیا

■■

حکیم منظور

اب کسی بھی چہرے کی آبرو نہیں کوئی
آئینہ ہوا خالی، روبرو نہیں کوئی
کیا سبھی فرشتے ہیں چپ ہیں اس طرح سارے
جیسے زندگی میں اب آرزو نہیں کوئی
اپنے کمرے کی چھت بھی آسماں دکھائی دے
آدمی میں ہی شاید اب نمو نہیں کوئی
چمنیوں کا مجلس ہی اب ہمارا ورثہ ہے
کیوں کہیں کہ پھولوں میں رنگ و بو نہیں کوئی
کالی پیلی سڑکوں پر کوئی نقش کیا ٹھہرا
ٹھیک ہے جو راہی کو جستجو نہیں کوئی
خود فریب بننے سے فائدہ ہے کیا منظور
گفتگو ہے کس سے جب روبرو نہیں کوئی

■■

ظہیر غازی پوری
ریلوے آؤٹ ایجنسی - ہزاری باغ

صلیبِ روح کا سایہ مری تلاش میں ہے
ابھی خود اپنا ہی نوحہ مری تلاش میں ہے
میں اک شجر ہوں سرِ راہ، سنگسار شدہ
ہوائے وسعتِ صحرا مری تلاش میں ہے
اتر کے دیکھا ہے خود آپ اپنے اندر بھی
لہو لہو سا نوشتہ مری تلاش میں ہے
فرات و نیل کی گہرائیوں تک اُترا ہوں
مگر تمازتِ گنگا مری تلاش میں ہے
روا نہیں کہ اُجالوں کا مرثیہ لکھوں!
سلگتے لفظوں کا چہرا مری تلاش میں ہے
مری صدی کا کوئی حادثہ بڑا نہ سہی
میں دب گیا ہوں تو ملبہ مری تلاش میں ہے
میں اپنی ذات ہی کی خلوتوں میں چھپ جاؤں
کہ خود تعاقبِ دنیا مری تلاش میں ہے
کہیں یہی تو نہیں میری زندگی کا صلہ
مٹا مٹا کوئی کتبہ مری تلاش میں ہے!
کوئی صدا مری تکمیل پا سکی نہ ظہیر
ہر ایک خوں زدہ جذبہ مری تلاش میں ہے

■■

عبدالرحیم نشتر
بنیا گودام ۔ کامٹی

غزل

آج شہزادی اپنے گھر ہوگی
کچھ نہ اس کو مری خبر ہوگی
دُور تک اس کی بھیگی آنکھوں میں
دُھند میں ڈوبی ڈگر ہوگی
کیا ملے گا نجات سے پہلے
بس یہی ایک رہگذر ہوگی
ڈوب جائیں اسی غبار میں ہم
اپنی منزل یہیں پہ سر ہوگی
میں جو بندھ جاؤں تری سانسوں سے
کب مجھے خواہشِ سفر ہوگی
میں چھلکنے لگوں گا مٹی میں
جب کبھی تیری آنکھ تر ہوگی
میں دشاؤں میں پھیل جاؤں گا
جس طرف بھی تری نظر ہوگی

▬ ▬

شاہد ماہلی
بتوسط سب ساقی ۵ راجندر پرشاد روڈ نئی دہلی

عظمتیں

عظمتیں اپنے سینوں پہ
کتبوں کے تمغے لگائے
بڑی دیر تک میری حیرت پہ ہنستی رہیں
جانے کتنی فتوحات کی داستاں
پتھروں کی زبانی سُناتی رہیں
گنگناتی رہیں
جانے کتنے شب و روز کے رنگ صد رنگ نغمے
دکھاتی رہیں
دُھند میں جب کوئی قافلہ آ کے ٹھہرا
نکلتے رہے صف بہ صف
آتی جاتی رہی لشکروں کی کمک
وہ چمک وہ چمک
چیخ، للکار، جھنکار، آہ و بکا
خون کی ندیاں
عظمتیں دُھند میں سب دکھاتی رہیں
مُسکراتی رہیں، گنگناتی رہیں
عظمتیں میری ۔ کتبوں کی تحریر
پڑھنے کی لاحاصلی ۔ دیکھ کر
رو پڑیں
عظمتیں رو پڑیں ....!

▬ ▬

نزہت نواز
بنگلا اسٹریٹ ۔ امروہہ

غزل

ترے نگر میں بھٹکنے کا کچھ صلا تو ملے
نصیب ہو کوئی آہٹ کوئی صدا تو ملے
میں تیرے کھیت کی ہر دم منڈیر بن کے رہوں
نہ برسے مجھ پہ جو ہر روز وہ گھٹا تو ملے
میں اپنی ذات کے سارے نقوش چھوڑوں گا
اِن آنسوؤں سے تقاضوں کی وہ ادا تو ملے
ترے قریب پہونچنے کے راستے تو بہت
ترے قریب پہونچ کر تیرا پتا تو ملے
نہیں یہ فکر کہ روکے چڑھاؤ ندیوں کا
اُسے یہ غم ہے ہواؤں کو کچھ سزا تو ملے
نہیں ہے کچھ تو یہ تنہائیاں ہی اپنائیں
کسی طرح بھی سہی کوئی دوسرا تو ملے

▬ ▬

انیس الرحمٰن
جیل روڈ۔ مظفرپور۔ ۱

غزل

یوں تو صدیوں کا تسلسل ہی مری قسمت میں تھا
قید لیکن میں تو بس اک لمحۂ حیرت میں تھا
کس سے ملتا، کس سے بچتا، میں عجب حیرت میں تھا
جو بھی قاتل تھا مرا، وہ دوست کی صورت میں تھا
سب سے اچھا یہ تھا میں رہتا خود اپنے آپ میں
کیونکہ اک رستہ خرابی کا مری شہرت میں تھا
آخرش میں ایک دن پتھر کی مورت بن گیا
لوگ کہتے ہیں کہ چپ رہنا مری فطرت میں تھا
اس سے تھی میری بقا یا مجھ سے تھا اس کا ثبات
کیسے کہئے کون کس کے سایۂ رحمت میں تھا
ہاں مگر یہ ہے کہ ہونے کو نہ کیا ہوتا انیسؔ
اب تو یوں کہئے کہ یہ ہونا ہی بس قسمت میں تھا

مشورہ

اگر چاہتے ہو
کہ ان بے اماں ساعتوں کو بھی اب تم
سدا کے لئے بھول جاؤ
وہ رشتے سبھی جو کہ اب تک
تمہارے لئے زندگی تھے
انہیں بے نشاں کر ہی ڈالو
کسی طور سے بھی سہی
زندگی میں نئے باب کا
اک اضافہ ہی کر لو
تو اس کے لئے
نظریے،
فکر کے زاویے۔
اور کوئی بھی پہلو نہ بدلو
نہ عکس اس کا آنکھوں میں محفوظ رکھو
نہ جی ہی دباؤ
بس اتنا کرو کہ اچانک
کسی بھی نئی صبح کو
تم بھی پتھر میں تبدیل ہو جاؤ

احترام الیقین
بتوسط انیس الرحمان۔ جیل روڈ۔ مظفرپور۔۱

۳ نظمیں

پیاس

بڑی دیر سے
ایک سوکھے ہوئے نل کے نیچے
صراحی کے سوکھے ہوئے ہونٹ
وا ہیں
میں یہ سوچتا ہوں
کہ اب اس صراحی کو جاکے
کسی اور نل کے تلے رکھ ہی ڈالوں
نہیں تو
یہ خود ہی پگھل جائیگی اپنی گرمی سے اک دن

--

ایک نظم

اجلے، کالے، زرد پھول
اوس میں ملبوس ہے جن کا شباب
دور اک کمرے کے حبس میں پڑا
چاروں جانب سرخ شعلوں سے گھرا
دیکھتا رہتا ہوں روزن سے انھیں
سوچتا ہوں اوس کا قطرہ کوئی
شاید مجھے
اس جلن سے
ایسے شعلوں سے بچالے ایک دن

--

ردِ عمل

پیاس کی شدت
پانی سے لبریز صراحی
جام ہوس ہے
جھلاہٹ میں ہاتھ بڑھا
اور
آخر کار صراحی پھوٹی
جام کی آنکھیں
(نفرت، غم، اور قہر میں ڈوبی)
میری جانب دیکھ رہی ہیں

--

آفتاب عارف
اسٹیٹ بینک۔ لوکل ہیڈ آفس۔ بھوپال

غزل

ہزار ہاتھ اٹھے کوئی وار کر نہ سکا
تمھارا شہر مجھے سنگسار کر نہ سکا
تھی آرزو کہ سمندر کی سرحدیں چھولوں
میں اپنی ذات کا دریا بھی پار کر نہ سکا
تمام ہو گیا سمتوں کی جستجو میں سفر
ملی بھی راہ تو میں اختیار کر نہ سکا
چمک اٹھے تھے سرابوں کے عکس آنکھوں میں
میں خود کو دفن تہہ رہگزار کر نہ سکا
تمام تیر خلاؤں میں جاکے لوٹ آئے
میں آسمان کے ستارے شکار کر نہ سکا

--

وہاب دانش
لوہا بازار ۔ رانچی

غزل

اَے مشتِ خاک بول کہاں تو خلا میں ہے
کس سمت حادثات سے بچ کر فضا میں ہے

میں منتشر ہوا تو مجھے دکھ نہ کچھ ملال
محفوظ میری چیخ تو اب تک ہوا میں ہے

یہ اور بات ہے کہ کوئی ہنس کے ٹال دے
لیکن وہی اک آن، تری ہر ادا میں ہے

صحرا پرست لوگ ہیں پانی کے آس پاس
جو ابر لے کے آیا وہی کربلا میں ہے

دانش تمام شور شرابے کے باوجود
دل کھینچنے کا وصف لہو کی صدا میں ہے

■■

پرندوں کو واپس بلا لو

پرندوں کو تاریک سمتوں سے واپس بلا لو!
درختوں کے پیچھے نئے موسموں کی
صدائیں بچھا دو
کہ پتوں سے گرتی ہوئی روشنی
قبیلہ سازی کرے
پتھروں پر لکھے راستوں اور دشاؤں کی بازی گری
کھل گئی
تیز، طرار گھوڑوں نے بو سونگھ لی
سومناتی صداؤں میں اب تک لہو چیختا ہے
اپسراؤں کے سینے میں پیوست ہیں
سبز اشلوک کی کرچیاں
ٹیڑھے، تاریک،
اُبلے ہوئے دن کے شانوں سے رستے ہوئے
زرد لمحوں کے لب
بولنے کے لئے زہری بولیاں ... منتظر ہیں
کہ یہ لام ہیتی صدی
اپنی مسمار خواہش کے ذرّوں سے خائف
کھنڈر کو کھلی ہو چکی ہے

....

پرندوں کو واپس بلا لو!
کہ اب آسمانوں میں کوئی نہیں
ایک مدت ہوئی
سارے گیتے فرشتوں کو
ہجرت کی اندھی خلاؤں میں کھوئے ہوئے!!

■■

حمید سہروردی
گوتم کالونی ۔ بیہر (بہار شریف)

خوبصورت چہرہ

مجھے اس ورتا دن سے علاحدہ رکھو
میرے اندر کے جراثیم بے چین ہیں
کہیں آسمانوں میں اپنی پناہ گاہ چاہتے ہیں
محبت، خلوص سے بترا
میرا شریر
تمہاری آس پر لال پتھر کا نشانہ بنانا چاہتا ہے
تمہاری روح کے دشمن یہ جراثیم
تمہیں ایک دن فنا کر دینا چاہتے ہیں
اور اپنے کندھوں پر تمہاری لاش کو
کہیں دور
صحرا میں آوارہ گرد اونٹ کی پیٹھ پر
چھوڑ آنا چاہتے ہیں
تمہارا معصوم اور پاکیزہ جسم
درندوں کے حوالے ہو جائے گا
تمہارا خوبصورت بدن
آہ! تمہارا حسین چہرہ
میں روؤں گا
میں قہقہہ لگاؤں گا
میں تمہاری میت پر
جی کھول کر روؤں گا
ایک ایک رات کا منظر
میری آنکھوں کی روشنائی
چھین لے گا
آہ!
اے خوبصورت چہرے
تو کتنا عیار تھا۔

■■

اسلم عمادی
عمادی منزل ۳-۴-۱۰ عمایت نگر۔ حیدر آباد ۲۰

ہم کو خوف عام نہیں

جب بھی ہمارے کاندھوں پر
روشنیوں کا جھونکا گر پڑتا ہے
ہم بالکل دب جاتے ہیں
اور فلک سے ایک نیا تازہ سا قطرہ سرخ لہو کا
بر بھی زمیں پر گر پڑتا ہے
یہ تو کوئی جشن گل کا ہنگام نہیں ہے
ٹوٹتی ہیں جب سوکھی شاخیں
تو جابر جھونکے کہتے ہیں
آج تمہارے نام کوئی پیغام نہیں ہے

اس کے باوجود۔۔!
بھیگی ہوئی گلابی انگلیوں سے سوکھی اور کھنکھناتی دھرتی پر
ہم تم وہ نقشے ہی بناتے ہیں
جن میں
نہ کمرے ہیں، ایک باتھ روم اور اک آنگن
اور
زندگی
صبح کو اٹھ کر دن بھر گھڑی دیکھ دیکھ کر ڈھل جاتے ہیں
شام کے وقت الارم لگا کر سو جاتے ہیں
اور
کبھی جب
میز پر کائی لگ جاتی ہے برش اٹھا کر گھس دیتے ہیں۔
اور
ضابطے پڑھتے پڑھتے سو جاتے ہیں

ساغر مہدی
محلہ شحانہ۔ بہرائچ

ایک نظم

کوئی کب تلک زیست کے راستے میں
کسی اجنبی ہمسفر کے لئے منتظر رہ سکے گا
حیات ایک سیل بلا خیز صرصر کفت
خواہشیں، حسرتیں، آرزوئیں
نہ جانے کہاں سے کہاں
در بہ در کو بہ کو مجھ کو لے جائیں گی
میں نہ گوتم نہ عیسیٰ
تو پھر یہ سزا کیوں مقرر ہوئی
جسم کی خواہش
روح کی حسرتیں
عقل کی روشنی
علم کی جستجو

اسلم عمادی

غزل

اب میں پھروں تو شہر میں کیا اہتمام ہو
قاتل کو کوئی دیکھے تو کچھ شادکام ہو

اچھا۔ تمھیں فروغ شب غم کا خوف ہو
کھڑکی سے کود جاؤ کہ قصہ تمام ہو

میں مجرمان خود طلبی کا ہوں رہنما
محتاط باد۔۔۔ ہونٹوں پہ میرا اپنا نام ہو

اخبار میں نہیں کوئی آواز زندہ دار
ہنگامہ ہو کہیں پہ، کہیں قتل عام ہو

اسلم لہو کی تیرتی آواز سے مثر ر
حرف سفید، قطرۂ آہستہ گام ہو

زرینہ ثانی
۶۳۱ - شنکر نگر - ناگپور

آزاد غزل

روح کی ساری کثافت دھل گئی روشن دریچے کھل گئے
پتھروں میں ایسے نظارے ملے

زندگی کی برق رفتاری سے فرصت ہے کسے؟
کون اب ان سے کہے یہ لن ترانی چھوڑ دیے

جس کا پانی جوہری قوت نے گندہ کر دیا
تشنگی ایسے سمندر سے مری کیونکر بجھے!

چہرۂ مانوس سے ابھریں گے کتنے اجنبی چہرے شعورِ وقت کی امواج میں
اپنی تنہائی کے دریا میں تو پتھر پھینک دے

رفتہ رفتہ محفلِ شعر و سخن کی روشنی بڑھتی رہی
خونِ دل جلتا رہا فن کے لئے

بے وفائی، کج ادائی ہو مبارک ہم چلے پروا نہیں
گفتگو کے زہر میں کچھ اور تلخی گھولئے!

خواب سی دھندلی فضا، ماحول افسردہ، سخن کی سانس ہے اکھڑی ہوئی
رنگِ محفل دیکھ کر ثانی کہے تو کیا کہے؟

■■

قسیم اظہر
۲۴۳-۱ بہار پور روڈ کلکتہ ۱۴

دو نظمیں

آدمی کے خول میں،
سب ادھورے آدمی

پیلے پیلے چہروں پر
بھیگی بھیگی سرخیاں لئے ہوئے
پھولے پھولے گال ـــ گالوں پر
دھنسی دھنسی سی آنکھیں ـــ آنکھوں میں
لہلہاتے خوابوں کی کھیتیاں ـــ کھیتوں کو
ڈھک چکی ہیں کالی کالی پتلیاں ـــ!!

■■

دل و دماغ

پتھروں کے گھونسلے

جن میں گھوم گھوم کر

سیاہ خون ـــ سفید خون

سازشوں کے انڈے دیتے رہتے ہیں!!

■■

جعفر عسکری
[illegible]

کارزارِ سرد و گرم

رات جب چلنے لگی ٹھنڈی ہوا
رہگزارِ درد کے اک اک شجر ہائے تباہ و برہنہ نے
ناتواں شاخوں کے جسموں کو چھپانے کے لئے
ڈال لی اوپر قبائے برگ ہائے بے وجود و بے ثمر!
رات جب چلنے لگی ٹھنڈی ہوا —

دوسری جانب،
سرِ راہِ سیاہ
شب گزیدہ سب مسافر
خوف سے اپنے مکانوں میں اسیر
جامۂ شب رنگ میں یوں نوحہ خواں —
"پھاڑ دو احساسِ اُمیدِ سحر
پھاڑ دو حسنِ یقیں کا ہر ورق
توڑ دو سب رشتہ ہائے جسم و جاں
آج سے عہد کر لو
عمر بھر رہنا ہے ہم سب کو یوں ہی
شب زندہ دار!"
اور شب گاہوں کے باہر گرم گرم،
دردِ اُمیدِ سحر کی
رات بھر چلتی رہی ٹھنڈی ہوا!

—

سعید عارفی
۲۲۷/۸ اکبرپور الہ آباد

سانپ، کمرہ اور میں

تنگ کمرے میں — کچھ سانپ ہیں

اور میں
فرش پر لال آنکھیں دکھاتے ہوئے سرخ انگاروں سے
خود کو محفوظ رکھنے میں مصروف ہوں
اور کمرے کی چھت
روشنی کی لکیریں سمیٹے کھڑی ہے
غرض
پاؤں کو سرخ انگاروں سے
سر میں چبھتی ہوئی روشنی کی لکیروں سے محفوظ رکھنے میں میں منہمک ہوں
کالے، پیلے، ہرے
سانپ بھی
مجھکو ڈسنے چلے آ رہے ہیں
مگر — میں انھیں مار ڈالوں گا اک دن، یہ مجھکو یقیں ہے

پھر اچانک میں یہ سوچتا ہوں
میرے کمرے میں روزن نہیں ہے کوئی
جس سے بادِ صبا چپکے در آ کے شعلوں کو ٹھنڈا کر سکے
بلب خاموش ہے
پھر بھلا سانپ کیوں آئیں گے؟
جسم سے وسوسوں کی یہ بوسیدہ چادر ہٹا کر
صاف ستھرے سے بستر پہ میں سو رہا ہوں
کیونکہ پچھلے جنم سے میں نروش ہوں
مرا تنگ کمرہ
مجھے دیر سے تک رہا ہے

—

شمیم فاروقی
آل انڈیا ریڈیو۔رانچی

غزل

کوئی صورت پسِ دیوار دکھائی دیگی
پاس جاؤگے تو آواز سنائی دیگی

اب کے موسم میں نہ یہ بوجھ اُٹھے گا شاید
سبز پتّوں کو کھنی شاخ دکھائی دیگی

آج کی رات اُسے چین سے نیند آئے گی
زندگی آج اسے اپنی کمائی دے گی

پھر کسی یاد کو سینے سے لگانا ہوگا
پھر تری آنکھ کسی شئے کی دہائی دے گی

اُس کے ہونٹوں پہ ہنسی پھیلتی جائے گی شمیم
کام کچھ بھی نہ تری تلخ نوائی دے گی

شجاع سلطان

غزل

تمام نقش ہیں اندھے خلا میں ٹھہرے ہوئے
زمانہ گزرا کوئی آفتاب اُبھرے ہوئے

طلسم ٹوٹ گیا منزلوں کی خواہش کا
یہ کیا جگہ ہے جہاں قافلے ہیں ٹھہرے ہوئے

عجیب نور سا آنکھوں کے نم سے چھنتا تھا
کہ جتنے رنگ تھے منظر میں اور گہرے ہوئے

ہم اپنے نام سے اُنکو تلاش کرتے رہے
بساطِ شام پہ کچھ رنگ سے تھے بکھرے ہوئے

رہا یہ حال تو ہم بھی سوادِ ساحل سے
شجاع ہوں گے سمندر کی تہہ میں اُترے ہوئے

شجاع سلطان
۱۵۶ مقابل بس اسٹینڈ۔باٹامالو۔سرینگر

نظم

یہ بادلوں کی گرج ہے کیسی
یہ خالی جسموں کے ٹوٹنے کی صدا ہے کیسی
یہ کون بکھرا
یہ ساعتوں کے لہو کی بارش، کہاں رُکے گی، کہاں تھمے گی
ہماری روحیں ازل کی پیاسی
ابد کی جانب رواں دواں ہیں
اُس اک روِش پہ
جو بے طرف ہے
جو ڈھونڈتی ہے
ہوائے تازہ کے لمسِ پا کو
کہ آبِ زم زم نہیں تو کوئی شرار اُبھرے
ہماری روحوں کو خاک کر دے
یا ٹوٹے جسموں کو آنچ دے کر دوبارہ جوڑے

غزلیں

فاروق شفق

۳/۱۲ دھان منڈی۔ گارڈن ریچ روڈ کلکتہ ۲۴

دیکھ لے جی بھر کے اب یہ دوری بڑھتی جائیگی
بس ذرا ہی دیر میں دیوار چن دی جائیگی

مٹھیوں میں بھر لے اپنی تو ردائے شام کو
رات بھیگے گی تو اس سے آنکھ پونچھی جائیگی

پلٹتے ہی رہ جائیں گے تازہ گلابوں کے ورق
ٹھنڈی رت کی لہر اب کے بے چھوئے ہی جائیگی

ساری سانسیں سطح پر ہی پھیل کر رہ جائیں گی
جب اندھیرے کے بدن پر روشنی کی جائیگی

شخصیت اس کی بھری محفل میں ہوگی منفرد
اڑکے جس کے کوٹ پر رنگین تتلی جائیگی

پیروں سے رشتہ زمیں کا سامنے آجائے گا
بے تحاشا ڈور جب لمحوں کی کھینچی جائے گی

اک نرالی سی وبا وہ ساتھ اپنے لایا ہے
یہ وبا اب ساتھ اسکے بستی بستی جائے گی

فصل دل اگنے بھی دو موسم کا رونا کیا شفق
رت اگر بدلی تو خوں سے فصل سینچی جائیگی

■■

احسن رضوی

۲۲۹۔ ایل۔ ماڈل ٹاؤن۔ جالندھر ۳

خود ساختہ خداؤں کا مسکن دکھائی دے
شہر ادب حکومت راون دکھائی دے

مسکان کی شفق سے بھی جھلکے ہے عکس غم
وہ چہرہ ان دنوں مجھے درپن دکھائی دے

تاریک و تنگ کمروں میں رہنے کے باوجود
سینے میں اک کھلا ہوا آنگن دکھائی دے

غارہ پسند چہروں کے اتنے ہجوم میں
کوئی بدن نہیں ہے جو چندن دکھائی دے

جس کی وجہ سے غیر ہوئے اپنے سارے لوگ
وہ ہی مرے وجود کا دشمن دکھائی دے

پھر لوٹ آئیں تنگ قبائی کی سمت ہم
ڈھیلا لباس شہر میں کامن دکھائی دے

■■

حبیب ہاشمی

خوشی کی چھاؤں سے اس طرح رابطہ رکھئے
غموں کی دھوپ کو اپنے لئے روا رکھئے

تعلقات میں تھوڑا سا فاصلہ رکھئے
قریب ہو کے نہ بنیادِ حادثہ رکھئے

کہیں نہ شدت دردِ حیات گھٹ جائے
پلک کی اوٹ میں اشکوں کا قافلہ رکھئے

پلٹ کے آئیں گی ماضی کی گم شدہ یادیں
فصیلِ شب کا دریچہ ذرا کھلا رکھئے

پرانے زخموں کی تفصیل جاننے کے لئے
نظر کے سامنے لمحوں کا آئینہ رکھئے

سیاہ رات ابھی ساحلوں پہ سوتی ہے
ابھی بھی دست درازی کا سلسلہ رکھئے

زمین بوسی پہ مائل ہیں کھوکھلی شاخیں
غرور وقت کا ٹوٹے گا حوصلہ رکھئے

اگر بچانا ہو شیشے کو یورشِ خم سے
تو آپ دشتِ تمنا میں حاشیہ رکھئے

یہ شہر، شہرِ ہوس ہے کسی بھی گوشے سے
یہاں خلوص کا ہرگز نہ آسرا رکھئے

یہ رسمِ خندہ لبی جو بن گئی لوگو!
چھپا کے کتنا بھلا دل کا آبلہ رکھئے

پرایا غم بھی احاطے میں اپنے جو کر لے
حبیب ایسا نگاہوں کا زاویہ رکھئے

■■

وفا بیاسی
[illegible] روڈ لکھنؤ

غزل

درد جب رات گئے حد سے گزرتا جائے
ذہن کی سطح پہ اک نقش اُبھرتا جائے
روز سنتی ہے کہانی مری بربادی کی
مجھ میں جو شخص چھپا ہے وہ سنورتا جائے
میری ہر رات گزرتی ہے یونہی جیسے کوئی
پاؤں پانی میں بڑھاتے ہوئے ڈرتا جائے
میں سمجھتا ہوں کوئی آوارہ ہوا کا جھونکا
ایک لمحے کو مرے پاس ٹھہرتا جائے
چہرے حالات کی گرمی سے جھلستے جائیں
وقت آواز کی مانند بکھرتا جائے
عمر کے دن میں یونہی کاٹ رہا ہوں جیسے
دھیرے دھیرے کوئی زینے سے اُترتا جائے

دلکش اعظمی
ایچ ۱۴- شیام لال لین، کلکتہ ۲۴

غزل

چہرہ پہ چہرہ ہے، شیریں کبھی کڑوا چہرہ
سرخ نیلا کبھی پیلا کبھی اُجلا چہرہ
صورتیں ہوتی ہیں، یکساں نہیں ہوتا چہرہ
ایک سے ایک بُرا اچھے سے اچھا چہرہ
آئینہ جس پہ تہیں گرد کی جم جاتی ہیں،
لاکھ روشن ہو نظر آتا ہے دھندلا چہرہ
تہ میں جھیلوں کے کوئی جذب بھی ہو جاتا ہے
ایسا ہوتا ہے ہزاروں میں کسی کا چہرہ
درمیاں ربط کے کھنچ جاتی ہے جب کوئی لکیر
اپنا ہو کے بھی وہ لگتا ہے پرایا چہرہ
جب نئی ضرب لگا دیتی ہے سورج کی کرن
سامنے آنکھوں کے ہو جاتا ہے چہرا چہرہ
اک صدی بعد سہی خشک زمیں سے دلکش
راکھ نم ہو کے اُگائے گی شگفتہ چہرہ!

ارمان نجمی
بتوسط ڈاکٹر [illegible] حسن۔ ڈاکخانہ [illegible]

غزل

گھر سے نکل کے وقت کی تصویر دیکھیے
دیوار پر لگی ہوئی تحریر دیکھیے
پھر اپنے گرد و پیش پہ بھی کیجیے نگاہ
سر پہ لٹک رہی ہے جو شمشیر دیکھیے
کل تک انا کی گونج تھی جس کی زبان میں
اس کی صدا کو آج گلوگیر دیکھیے
دھندلا سا کوئی نقش بھی پیشِ نظر نہیں
چاروں طرف غبار کی تصویر دیکھیے
پیاسی پلٹ گئی لبِ ساحل کو چوم کے
اس موجِ نامراد کی تصویر دیکھیے
کیوں تازہ دم ہواؤں سے اُلجھے ہوئے ہیں آپ
ٹوٹے نہ احتیاط کی زنجیر دیکھیے

غزلیں

مضطر حیدری
۲۴/۵ ۔ فدوالی روڈ کلکتہ

فصیلِ غم پہ بہت ارجمند ہیں ہم بھی
فرازِ دار سبھی سربلند ہیں ہم بھی

نہیں کسی کی بھی میراث کائنات کا غم
زمانے بھر کے لئے درد مند ہیں ہم بھی

ہمیں تو مار دیا حسیت کے چرکوں نے
خود اپنی ذات کی خاطر گزند ہیں ہم بھی

قریب ہوتے ہوئے وہ بھی کھل سکا ہو کہاں
شریک ہوتے ہوئے بند بند ہیں ہم بھی

چمکتے چاند کے ہالے سے پوچھ کر دیکھو
عروسِ شب پہ لپکتی کمند ہیں ہم بھی

جدیدیت کے یہ سوتے وہیں سے پھوٹے ہیں
برانہ مان ترقی پسند ہیں ہم بھی

ہمیں سخن کی کسوٹی پہ جانچ لو مضطر
عروجِ فن کی قسم سود مند ہیں ہم بھی

اشہر ہاشمی
روشن کوٹھے، دارلعین ۔ باڑہ

وہ اٹھا، داستان ٹوٹ گئی
تیر نکلا کمان ٹوٹ گئی

روکتی کیا پہاڑی جھرنوں کو
کھا کے جھٹکے چٹان ٹوٹ گئی

جھک کے داخل ہوا ترے گھر میں
سر بچایا تو آن ٹوٹ گئی

ہوتے ہوتے ادا ہوا جملہ
رفتہ رفتہ زبان ٹوٹ گئی

چیخ نے توڑ دی لبوں کی فصیل
پھر خموشی کی تان ٹوٹ گئی

اُس کے آتے ہی غل مچا اُن میں
صف اِسی درمیان ٹوٹ گئی

آ گئے زد میں کھردرے الفاظ
سخت لہجے کی سان ٹوٹ گئی

مخمور رضوی
دائرہ سہسرام

راہ چلتے ہوئے ہر فرد سے رشتہ دیکھا
ڈھونڈنے نکلا تو اپنے کو اکیلا دیکھا

جانے کیا ربط ترے جسم سے ہو آنکھوں کا
تجھ کو دیکھا تو کوئی خواب اُبھرتا دیکھا

ایک خاموشی ہے، ویرانی ہے تنہائی ہے
دل وہ صحرا، کوئی راہی نہ گزرتا دیکھا

میں بھی بہتا ہوا پانی ہوں کسی دریا کا
ہاتھ دھوتے ہوئے ہر اک کو گزرتا دیکھا

شمس فریدی

نظم

ایک ایسا کرب
جس میں
ایک نامعلوم سی لذّت ملے
ایک ایسا نقطہ
جس کو
صرف
احساسات کی
انگشت ہی سے چھو سکیں
جو،
زبان کی
نوک پر
آنے سے پہلے ہی پگھل جائے
ایک ایسی کیفیت
ایک ایسا لمحۂ تخلیق ہے
ایک ایسا شبنمی آئینہ ہے
صورتِ اظہار کا جو لمس تک نہ سہہ سکے

■■

غزل

سہمی سہمی گذر رہی ہے رات
لمحہ لمحہ بکھر رہی ہے رات
شہر ڈوبا ہوا سکوت میں ہے
محفلوں میں سنور رہی ہے رات
چھت پہ آہٹ سحر کی پاتے ہی
سیڑھیوں سے اُتر رہی ہے رات
جسم الجھا ہوا ہے کانٹوں میں
سسکیوں میں ابھر رہی ہے رات
نقرئی ہاتھ کے شکنجے میں
شمسؔ فریاد کر رہی ہے رات

■■

یوسف تقی

ایک نظم

اگرچہ تمھیں اس سے پہلے کبھی میں نے دیکھا نہیں تھا
نہ تم سے ملا تھا
مگر تم اجنبی بھی نہیں لگ رہی ہو
تمہارے یہ عارض
یہ جھرنوں کے مانند مچلتی ہوئی زلف
تمہاری یہ پھیلی ہوئی مست آنکھیں
تمہارے خد و خال
یہ سب آشنا ہیں مری سانس کی کپکپاتی ہوئی حدتوں سے
اگرچہ تمھیں اس سے پہلے کبھی میں نے دیکھا نہیں تھا

■■

سیّد بشارت علی
ایل آئی سی۔ سٹی برانچ ۔ بشیر باغ حیدرآباد ۲۹

تمام مٹی

کہاں سفر ہے
چہار سمتوں پہ
نیچے اوپر
تمام مٹی
ازل کا کتبہ
ابد کا بستر
غبار ہر ہر نفس کی منزل

بدلتے رنگوں کی سرسراہٹ
دھواں مہک کا
سروں کی لہریں
سبھی مٹیلے

اُبھرتے پربت
سکڑتی وادی
اُبلتے چشمے
زمین سایہ فگن ہے سب پر

■■

منظور ہاشمی
شعبہ تعلیم۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

غزل

رگوں سے سارا لہو بھی نچوڑ دو یارو
چلو یہ خون کا رشتہ بھی توڑ دو یارو
ہے انتظار میں کب سے طلسم خاموشی
لگا کے ضرب صدا تم ہی توڑ دو یارو
یہ زندگی جو تڑپتی ہے ریگ ساحل پر
کبھی کبھی تو سمندر میں چھوڑ دو یارو
جو تم دکھاؤ اگر وہ ہی دیکھنا ٹھہرا
تو یوں کرو، مری آنکھیں ہی پھوڑ دو یارو
مرے بدن کا لہو سرد ہے ابھی مجھکو
جھلستی دھوپ کے آنگن میں چھوڑ دو یارو
فرات بند ہوئی، پھر حسین پیاسا ہے
یہہ واقعات کی کڑیاں ہیں جوڑ دو یارو
سروں پہ دست محبت تو رکھ رہے ہو مگر
یہ آستیں کا لہو تو نچوڑ دو یارو
یہ خواب دیکھا تھا لیکن یقیں نہیں آتا
تم اور خنجر قاتل مروڑ دو یارو
اب آزماؤ گے کب تک نئے نئے نسخے
مریض رحم کے قابل ہے چھوڑ دو یارو

■■

امان انجم۔ تق
درگاہ حسین چوک۔ سالسبری پارک۔ پونہ ۱

غزل

اب یہاں سے نظر آتا ہے بیابان مجھے
ورنہ ابتک تو سفر تھا بڑا آسان مجھے
چین کا سانس لیا لوٹ کے اپنے گھر میں
شہر کی سیر کا برسوں سے تھا ارمان مجھے
تجھ سے گر ہوتا نہیں میرا مداوا، نہ سہی
اپنی ناکامی کا مجرم تو نہ گردان مجھے
میں کوئی دورِ اساطیر کی تحریر نہیں
اتنا مشکل نہ سمجھ، پڑھ مجھے، پہچان مجھے
وہم ہے یہ، کہ کسی خوف کا احساس امانؔ
اپنا سایا بھی لگے دوسرا انسان مجھے

■■

یوسف جمال
راج گانگ پور۔ ۷۷۰۰۱۷

غزل

یہ منکشف ہوا جب ان کے جسم چھیلے ہیں
سمندروں کے بدن کے بھی خون نیلے ہیں
ازل سے بھاگتی صدیوں کا وار سہہ سہہ کر
یہ مدتوں سے ہرے زخم خوردہ ٹیلے ہیں
بجھیں گی کیوں نہ بھلا دل میں پیاس کی ڈھولیں
کنواری آرزو کے خشک ہاتھ پیلے ہیں
دکھاؤ مجھ کو بھی خوابوں کا وہ جزیرہ جہاں
سبھوں کے جسم معنبر ہیں اور نشیلے ہیں
جو نایوں آنکھ کے گزرے دلوں کو تو یہ کہو
ہوس کی پیاس بجھانے کے یہ تو حیلے ہیں
ابھی نہ تان مرے سر پہ بے بسی کی ردا
ابھی خودی کے مرے پاس کچھ وسیلے ہیں
کسے خبر کہ مرے جسم کے مکاں میں جمالؔ
عجیب خوف کے آباد کچھ قبیلے ہیں

■■

غزل

سلطان سبحانی
قدوائی روڈ۔ مالیگاؤں

کیا بات ہے اس غم کے سوا کچھ بھی نہیں شہر یا دشت سے گزروں
تنہائی یہاں تک ہے کہ جس سمت بھی دیکھوں کوئی دیوار ہی دیکھوں

اب دل جو یہ کہتا ہے تو اچھا چلو یونہی سہی اس ہونٹ کو چھولوں
وہ اپنا اگر بن نہیں سکتا تو بُرا کیا ہے ذرا نام ہی پوچھوں

یہ عمر کچھ ایسی ہے کہ سب اپنے سے لگتے ہیں کسے اجنبی سمجھوں
اکثر تو یہ دل چاہے ہے کہ ہر شاخ پہ لہراؤں ہر اک پھول پہ جھوموں

میں ایک مسافر ہوں سیہ رات کا اس رات کی سرحد ہی کہاں تک؟
بس ایک کرن ہاتھ جو آجائے تو یہ زہر کا دریا ہی پلٹ دوں

وہ وقت جو آئے گا اسی خون کے اک ننھے سے قطرے سے اٹھے گا
اس وقت کی قسمت تو اسی ہاتھ کی ریکھا میں ہے جب چاہوں دکھا دوں

جب نقاب الٹ ڈالے

تنہا تیماپوری
ڈکم پیٹ۔ گلبرگہ

ہر نقاب کے پیچھے ایک ایک چہرہ ہے
اور یہ سبھی چہرے
مجھ کو دیکھتے ہوں گے
ہر چھپی نظر مجھ کو جانچتی رہی ہوگی
اس خیال سے میری ایک ایک حرکت نے
اپنا پن بدل ڈالا۔
جو مجھے نہ کرنا تھا وہ بھی میں نے کر ڈالا۔

ایک تیز جھونکے نے
سب نقاب الٹ ڈالے
کوئی ایک چہرہ بھی تھا نہ ان نقابوں میں۔

کاش!
ان نقابوں کا یوں بھرم نہ کھل جاتا
اپنی بے بسی کا بھی کچھ بھرم تو رہ جاتا۔

غزل

اظہار اثر

مدت سے کوئی دل میں تڑپ ہے نہ درد ہے
کیسی عجیب بات ہے شعلہ بھی سرد ہے

خوش فہمیوں کا پہلے کبھی رخ پہ رنگ تھا
اب حادثوں کی زیست کے چہرے پہ گرد ہے

یہ شخص ڈر گیا ہے جو دریا کو دیکھ کر
انداز کہہ رہا ہے کہ صحرا نورد ہے

روشن ہو دل میں آگ تو تنہا سا یہ چراغ
یکتائے مہر و ماہ، ستاروں میں فرد ہے

صدیوں سے پھر رہا ہے کسی کی تلاش میں
میری طرح سے چاند بھی آوارہ گرد ہے

موسم کی تیز دھوپ بگاڑے گی کیا اثرؔ
برگِ خزاں کا رنگ تو پہلے سے زرد ہے

ظفر صہبائی

نثری نظمیں

ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے "نثری نظموں کی حمایت میں"
جیسی فکر انگیز تحریر لکھ کر مجھے نثری غزلیں کہنے کی تحریک
دی۔ اس کے لئے میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔ یہ
نثری غزلیں انھیں کی نذر کرتا ہوں

نئے راستے طے شدہ منزلوں کی طرف نہیں جاتے یہ دھیان چھوڑ دو
سفر سے پہلے ذرا ایک بار پھر اپنی ہمتوں کا جائزہ لو
نقطوں کی فصلیں کٹ چکی ہیں کا غذ بالکل کورے ہیں
تخلیقی توانائیوں کی سیاہی دوبارہ اپنے قلم میں بھر دو
دن اپنے کرب کا تمام گرد وغبار مجھ پر انڈیل گیا ہے
رات کتنی نادان ہے مجھ سے کہہ رہی ہے آؤ آرام کرو
گھاس کی پتیاں میرے جسم کا لمس لوٹ کر لذت محسوس کرتی ہیں
لیکن میں ان کے احساسِ لذت سے بے خبر اپنے میں کھویا رہتا ہوں دوستو
ایک نئے وجود کی تعمیر موت سے پہلے ممکن نہیں ہے
اذیتوں کا خوف تج دو، سانسوں کی گرد رطنا بیں کاٹ جانے دو
خاک و خون میں لتھڑی ہوئی زندگی کی ساری خواہشیں
انھیں غسل دینا ہے تو ذہنی آزادی کے دریا کی طرف چلو
نفیس لامرکزیت اظہار لسانی جبر سے فرار کی ایک شکل ہو تو ظفر
تم بھی بحروں کی نفی اور وزن کی پراتی روایت سے منہ موڑ لو

——

حقیقت دوسری تھی خواب تھا قیاس تھا
وہ چہرہ میرے ذہن کا التباس تھا
ابھی تک آنکھوں میں گل بوٹے چمک رہے ہیں
اُس کے جسم پر نہ جانے کون سا لباس تھا
اُس کھڑکی کا جو کھلا آج کیوں خالی ہے
کل تک تو ایک حسین تصویر کا فریم تھا
وقت نے نکیلے ناخنوں سے جسم پر تحریر لکھ دیا
پڑھا تو زندگی کے کرب کا پورا اقتباس تھا
وہ پلنگ پر میرے سامنے سو رہی تھی
میں اپنے بیدار ہونے سے بدحواس تھا
یہ سچ ہے میں اُسے کسی دن قتل کر دیتا مگر
مجھے اپنے کیے ہوئے وعدوں کا پاس تھا
بسوں کی ہڑتال نے سب کے پاؤں توڑ دیے
پیدل چلنے کا ظفر بھلا کسے ابھیاس تھا

——

صفدری

گذارش

ننھے بچو
پاکدامن بن بیاہی لڑکیو
ہاتھ جوڑو
دیوتاؤں سے کہو،
اپنے اپنے آسنوں سے اب اٹھو

——

غزلیں

سلیمان اطہر جاوید

شعبۂ اردو - سری وینکٹیشورا یونیورسٹی - تروپتی

ہم تو یہ سمجھتے تھے ایک ہم ہیں تن تنہا
ہر بدن اکیلا ہے یاں تو ہر ذہن تنہا

یوں مرے خیالوں میں اُنکا عکس لگتا ہو
جیسے گھُپ اندھیرے میں ہو کوئی کرن تنہا

ہم کو چھوڑیے صاحب ہم تو آبلہ پا تھے
خارزارِ دُنیا میں ہے وہ گلبدن تنہا

یوں بچھڑ کے روتی ہے مجھ سے آرزو میری
اپنے پی کے غم میں ہو جسطرح دُلہن تنہا

کب دیا ہے شیریں نے ساتھ خستہ جانوں کا
آج ہم اکیلے ہیں تھا جو کوہکن تنہا

جو بھی فرد ملتا ہے یہ گُمان ہوتا ہے
رُوح سے بچھڑ کر ہے یہ کوئی بدن تنہا

ہم سے محفلوں میں تھی دلکشی و رعنائی
اب وہ لے کے بیٹھے ہیں اپنا بانکپن تنہا

ہم اِدھر بھٹکتے ہیں اجنبی دیاروں میں
اور اُدھر پریشاں ہو میلی دکن تنہا

■ ■

ناظمی انصاری

۱۰/۹۷۱ پریڈ - کانپور

ہر ذرّہ انتشار کا پیکر دکھائی دے
آنگن میں اپنے حشر کا منظر دکھائی دے

الفاظ چیختے ہیں کہ معنی کہاں گئے
آئینہ دیکھنا ہو تو پتھر دکھائی دے

تحریرِ عہدِ شوق نہ پڑھنا ہی خوب ہے
پڑھیے تو حرف حرف مکرّر دکھائی دے

اک ذرّے میں ہے سمٹی ہوئی وسعتِ جہاں
قطرے میں دیکھئے تو سمندر دکھائی دے

تاریکیاں سنبھال کے رکھیں کہاں مجھے
روزن سے جب کہ چاند برابر دکھائی دے

برسوں گزر گئے ہیں تصوّر کی قید میں
ٹھنڈی ہوا بھی اب مجھے خنجر دکھائی دے

صدیوں کا درد یوں مرے لمحوں میں آبسا
اپنا وجود خود مجھے اجنبی دکھائی دے

■ ■

عین تابش

جذبات کو ناکردہ گناہی کی سزا دو!
خاموش چٹانوں کو سمندر میں بہا دو

پھر آج ہواؤں پہ کوئی شہر بسا دو
جنگل میں بھٹکتے ہوئے لوگوں کو صدا دو

کھڑکی کو ذرا کھول دو سُورج کو بُلا دو
اب جاگتی آنکھوں کو کوئی خواب نیا دو

عُریانیِ حالات تمھیں گھُور رہی ہے
کاغذ پہ کوئی نقش اُبھارو تو مٹا دو

پتھر کا جگر لے کے تمھیں پھول پڑوں میں
خود کو بھی نہ پہچانوں مجھے ایسی دُعا دو

ٹُوٹے ہوئے پتھر کا نشہ پھیل رہا ہے
پھر آج اُمیدوں کے شبستاں کو سجا دو

■ ■

غزلیں

مہدی پرتاپگڑھی

بیلم وارڈ۔ پرتاپ گڑھ

آج خوابوں کے دریچے پہ ہے پہرا کیسے
باندھ دینے سے رُکے گا کوئی دریا کیسے

اب نظر آتا نہیں کوئی شناسا خد و خال
اس طرح مسخ ہوا وقت کا چہرا کیسے

کتنی مضبوط ہے ذہن پہ ہر اسکی گرفت
کسی خوشبو کی طرح بکھرے یہ لمحہ کیسے

شرط ہے عزم جنوں اُکو کسی کی خاطر
پاؤں سے ٹوٹے گا، زنجیر کا رشتہ کیسے

ایک اک کرکے بجھے جاتے ہیں اب سارے چراغ
اب نظر آئے گا ہم کو رُخِ فردا کیسے

جانے کس لمحہ وہ خوش رنگ سی تتلی آ جائے
بند کر دوں میں یہ خوابوں کا دریچہ کیسے

کسی غمخواری کا سایہ نہ رفاقت کی ردا
دھوپ میں غم کی کٹے وقت ہمارا کیسے

اب نمک پاشی کا دستور رواں ہو ہر سمت
مندمل ہو گا مرا زخم تمنا کیسے

سُنتے ہیں اپنے کو تاریخ بھی دہراتی ہے
لوٹ آتا نہیں گذرا ہوا لمحہ کیسے

دورِ نا قدریٔ اربابِ ہنر آیا ہے
اپنی رسوائی کا دیکھو گے تماشا کیسے

اب کوئی کرشن نہ عیسیٰ کی صدا ہو مہدی
رقص فرمائے گی یہ وقت کی رادھا کیسے

■■

علی اسد

ذوقِ عریانی ہوا مانگے ہے
کون اب بندِ قبا مانگے ہے

فطرتِ عشق بدلنا مشکل
حُسن دستور نیا مانگے ہے

کھنچ گئے دار پہ ہم مہر بہ لب
اور تو دادِ وفا مانگے ہے

کام آنے کی نہیں بخیہ گری
اب تو پیوندِ ردا مانگے ہے

میری بربادی کا یہ عالم ہے
وہ بھی رو رو کے دعا مانگے ہے

صبح تک آنکھ جھپکتی ہی نہیں
رات بھر کون دعا مانگے ہے

یہ تو دستورِ کہن ہے یارو
چاند سورج سے ضیا مانگے ہے

■■

فکری بدایونی

خوابوں کا جال چہروں پہ پھیلا ہوا سا تھا
ہر شخص اپنے آپ میں کھویا ہوا سا تھا

مشکل تھا مجھکو ڈھونڈنا چہروں کی بھیڑ میں
ہر نقش میری لوح کا مٹتا ہوا سا تھا

شاید جلی تھی یاد کی قندیل رات بھر
چہرہ تمام صبح کا پگھلا ہوا سا تھا

آنکھوں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں دمِ سحر
بادل کسی کی یاد میں برسا ہوا سا تھا

منظر نیا ضرور تھا لیکن کہیں کہیں
خوابوں میں اس سے پہلے بھی دیکھا ہوا سا تھا

کھولی جو میں نے آنکھ تو میرا وجود بھی
دریائے خواہشات میں ڈوبا ہوا سا تھا

ویسے وہ موسم ہی تھا قریب و بعید سے
لیکن وہ پتھروں میں تراشا ہوا سا تھا

جیسے کہ پتی ٹوٹ رہی ہو گلاب کی
کچھ ایسے آج وقت بھی گذرتا ہوا سا تھا

مشکل تھا اُسکو روکنا فکری شبِ فراق
اُس کا خیال دل میں اُترتا ہوا سا تھا

■■

ذکاء اللہ بیگ شایان
نزد سب پوسٹ آفس پکریا۔ پیلی بھیت۔ یوپی

غزلیں

اچھلتے ڈوبتے منظر ہیں دن کے شانوں پر
مٹیلی شام کا دریا ہے اب مکانوں پر

لبوں کے زہر میں ہے سبز ذائقوں کی لہر
لگا ہے خون ہماری سیہ زبانوں پر

الٹ پلٹ کے جہاں چاہے دیکھ لو ہم کو
بچھے ہوئے ہیں ہمیں قرنوں پہ زمانوں پر

کہیں بکھرتے سمندر پہ ٹوٹ کر برسا
نہ ابر ٹھہر سلگتے ہوئے مکانوں پر

اگر جھٹک دیں تو ہر رنگ نغمہ جاگ اٹھے
ہے نیند میں وہ قیامت ہمارے شانوں پر

گھٹن سے پیاس کی سانسوں میں اک تلاطم ہے
ہوا کی یورشیں بہتی ہیں بادبانوں پر

——

خاک ہو کر یہاں اعزاز ملا کرتے ہیں
وہ زمیں ہم ہیں فلک جس پہ جھکا کرتے ہیں

آج شب محفلِ دل میں نیا افسانہ جگاؤ
غم کے قصے تو یہاں روز ہوا کرتے ہیں

خار و صحرا کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں شاید
اب تو شہروں میں بھی ملبوس پھٹا کرتے ہیں

ہم نے پتھر کی طرح ان کو بھی تکتے دیکھا
وہ گراں جسم جو پھولوں میں تُلا کرتے ہیں

غم غلط جس سے ہو وہ بولتی شکلیں ڈھالو
چہرے آئینے میں چپ چاپ رہا کرتے ہیں

نکہتیں دور کھڑی سوچ رہی ہیں۔ کیسے
ریت کے سینے میں ہم نقشِ صبا کرتے ہیں

——

ہمایوں ظفر زیدی
شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

غزل

کبھی جو بچ کے چلے رہگزارِ عام سے ہم
جلے ہیں اپنے خیالوں کے ازدحام سے ہم

خود اپنی ذات کی پہنائیوں میں قید رہے
نکل تو آئے تھے دنیائے دوں کے دام سے ہم

تمام عمر ہوئی صرفِ کوششِ تکمیل
تری نگاہ میں پھر بھی ہیں ناتمام سے ہم

وہ لوگ اب بھی حدودِ دیارِ صبح میں ہیں
جنھیں پکارا کیے رہگزارِ شام سے ہم

بہت تھا شورِ سرِ راہ رفتگاں لیکن
صدائیں دیتے رہے تجھ کو ہر مقام سے ہم

——

غزلیں

راہی قریشی

ایک دانستہ فریب اور بھی کھا کر دیکھیں
اب دعاؤں کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دیکھیں

ہم سے ہی درگذری کی ہے تمنا سب کو
رسمِ ایثار یہاں ہم ہی نبھا کر دیکھیں

کر دیا شور نے ہر لفظ کو بے صوت و صدا
کس کی آواز میں آواز ملا کر دیکھیں

رفتہ رفتہ ہیں کھو جائے نہ احساسِ وجود
اپنے ہی گھر میں اک آواز لگا کر دیکھیں

دور تک کوئی شناسا بھی کہیں ہے کہ نہیں
اجنبیت کی یہ دیوار گرا کر دیکھیں

چشمِ ویراں میں چھپاتے ہیں دن بھر جس کو
شب کے صحرا میں وہ سرمایہ گنوا کر دیکھیں

دل کی قسمت میں بہت رنج و الم ہیں لیکن
سنگباری سے یہ آئینہ بچا کر دیکھیں

کتنی بے رنگ ہوئی جاتی ہے دھرتی راہیؔ
اس کے ماتھے پر لہو اپنا لگا کر دیکھیں

--

نقش پانی پر بناتے جائیں گے
لوگ کب تک دل یونہی بہلائیں گے

جب بھی آئینے کے آگے آئیں گے
خود کو ہم کچھ اور تنہا پائیں گے

خاک بکھرے گی ہماری جب یہاں
اس زمیں کو آسماں کر جائیں گے

کھو نہ جائے اپنا احساسِ وجود
اس خموشی کو صدا کر جائیں گے

آندھیوں میں ایک دیپک کی طرح
ہم ابھی تھوڑی دیر میں بجھ جائیں گے

کتنے ارماں لے کے جاتے ہیں وہاں
کیسی حسرت لے کے واپس آئیں گے

اپنی خاموشی کرے گی گفتگو
لوگ جب اک داستاں دہرائیں گے

محفلوں کو دیتے جائیں گے لہو
اور تنہائی لیے لوٹ آئیں گے

جراتوں کے تیشے چھینے وقت نے
اب حصارِ درد کیسے ڈھائیں گے

ہے ابھی دنیا پہ راہیؔ اعتماد
ہم ابھی کچھ اور دھوکہ کھائیں گے

--

نسیم اجمل
سی-۱۲۰- چتارہ پارک - نئی دہلی

موجِ مے نے نہ کسی آرزوئے خواب مجھے
غم وہ دریا ہے جو ہوتا نہیں پایاب مجھے

دیکھنے والوں کی نظروں نے دیا مجھ کو فریب
اک کی آنکھوں کا سکوں کر گیا غرقاب مجھے

جانے کن لمحوں کی ڈولی میں ہو وہ جلوہ ناز
دے کے غم بھول گئی ساعتِ شاداب مجھے

آرزوؤں میں کہاں اپنی تمنا کا وجود
ڈھونڈتا پھرتا ہے خوابوں میں گرداب مجھے

بارشِ سنگ سے پھولوں کو بچاتے ہوئے
بارشِ سنگ سے کرتے رہے سیراب مجھے

مشتاق جاوید
۱۹/۹۰ مچھی پاڑہ۔ بیہالہ۔ کلکتہ ۳۴

غزل

میں سبز گھاس ہوں پتھر تلے دبا مجھکو
تو زعفران کسی طرح سے بنا مجھکو
تو دشت میں لیئے جاتا ہو کیوں صدا مجھکو
غبار تھا میں اڑا لے گئی ـــــ ہوا مجھکو
شکستگی کی صدا دور تک چلی بھی گئی
مری شکست کی تصویر مت دکھا مجھکو
مکین شہر! عمارت تجھے مبارک ہو
پکارتا ہے پہاڑوں کا سلسلہ مجھکو
ہر اک قدم پہ مرا ہی سراغ پانے کو
تلاش کرتی پھری ہے مری صدا مجھکو
یہ دھوپ چھاؤں کا نقشہ بہت پرانا ہے
اب ایسا کر کوئی منظر نیا دکھا مجھکو
بھلا کہ! منھ پہ ترے صاف صاف کہہ ڈالا
اگر ہے جرم تو پھر دے کوئی سزا مجھکو
کہیں میں ریگِ رواں میں ڈوب ہی جاؤں
تو تشنہ کامی کے احساس سے بچا مجھکو
میں اپنی ذات کے اندر ہی چھپ کے بیٹھا ہوں
کہ اپنے قتل کا لینا ہے خوں بہا مجھکو

شاہد عزیز
بجتو گمانی ۔ اودے پور

آگہی کا سفر

کیا کروگے ـــ میرے سفر کی کہانی کو سن کر
میرے سفر کی کہانی ....
تمہارے سفر کی کہانی سے بالکل جدا ہے
تمہیں کیا بتاؤں ....
تمہیں کیا پتہ ....
کتنے برس پانیوں میں چلا ہوں
کتنے برس اپنی آواز کو ـــ
ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو چکا ہوں
سلگتے ہوئے ریگزاروں میں ....
سورج کی کرنوں سے تنہا لڑا ہوں
اپنے احساس کا بوجھ لادے ـــ
اکیلا چلا ہوں
تمہیں کیا بتاؤں ....
تمہیں کیا پتہ .....
کتنا دشوار تھا
آگہی کا سفر

امتیاز انجم
باغ فرحت افزا۔ بھوپال

غزل

غم ضرور بدلے گا اپنا پیرہن یارو
آج پھر چمک اٹھی دل کی انجمن یارو
کس کا ذکر کرتے ہو کیسا بانکپن یارو
تم نے صرف دیکھا ہو پھول سا بدن یارو
وہ جو سامنے آئے زندگی مہک اٹھی
خوشبوئے وفا پایا اُن کا پیرہن یارو
آکے اپنے ساحل تک یونہی لوٹ جاتی ہے
کاش ہم سے ٹکراتی موج پر فتن یارو
کتنے زخم پنہاں ہیں کاش دیکھتے تم بھی
یوں وطن میں رہتا ہوں جیسے بے وطن یارو
صبح کی کرن تک ہے بے حسی کا سناٹا
رات اوڑھ کر آئی موت کا کفن یارو

غزلیں

افسر جمشید
ماہنامہ روبی - ۱۰ انصاری روڈ - دہلی - ۲

تیسری آنکھ سے ہم نے دیکھا نہیں
جسم ہی جسم ہیں کوئی چہرا نہیں

سرخ سا اک سمندر ہے چاروں طرف
ہم نے یہ خواب راتوں کو دیکھا نہیں

زندگی دفن ہے اب مرے جسم میں
اور اس قبر پر کوئی کتبہ نہیں

سیکڑوں عکس ہیں شیشۂ ذہن میں
اب تمھارا تصور بھی تنہا نہیں

میں نے امکان کی ہر لغت دیکھ لی
آخری لفظ کے کوئی معنی نہیں

ہم بدن کے سفر میں کہاں آگئے؟
اب کوئی خود کو محسوس کرتا نہیں

روشنی ہی سے جمشید پہچان ہے
رنگ کا اپنا کوئی بھی چہرا نہیں

محمد احمد نقوی
اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول - اجمیری گیٹ - دہلی ۶

ٹکرا کے چٹانوں سے گزر جائے ہے آواز
احساس کو چھو لے، تو ٹھہر جائے ہے آواز

پتھر کی طرح سخت ہوں، بے جان ہوں پھر بھی
خنجر کی طرح دل میں اتر جائے ہے آواز

توڑے ہے سکوتِ شبِ تنہائی کہیں دور
شیشے کی طرح گر کے بکھر جائے ہے آواز

اک میں ہی نہیں گوش بر آواز ہے دنیا
اب دیکھنا یہ ہے کہ کدھر جائے ہے آواز

خود اپنی ہی آہٹ پہ ٹھٹکتی ہوئی ہر گام
سوکھے ہوئے پتوں پہ گزر جائے ہے آواز

ہر دور میں ارباب ہم آواز سے ملنے
صدیوں کی مسافت ہے مگر جائے ہے آواز

ہوتا ہے بھلا کون ہم آہنگ کسی سے
کھو جائے ہے راہوں میں جدھر جائے ہے آواز

اشکوں کے سمندر میں اگر ڈوب کے نقوی
ابھرے ہے تو کچھ اور نکھر جائے ہے آواز

احمد تنویر
علی مرزا روڈ - رمنہ - مظفر پور - ۲

سوچتا ہوں تیر کے دریا میں دیکھ آؤں ذرا
کتنی گہرائی میں ہے سایہ مرا بیٹھا ہوا

پوچھتا تھا ایک اک منظر سے اپنا ہی پتا
دشت و دریا اور پہاڑوں سے گزرتا قافلہ

ریت کے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ رکھ کر دیکھئے
جسم کی ساری حرارت کا پتہ چل جائے گا

جانے کیسا خوف تھا، کہ کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ
اس کے قدموں کی صدا سے بند دروازہ ہوا

آج پیلی دھوپ سارا جسم جھلسا جائے گی
کہہ گئی ہے مجھ سے یارو صبح کی ٹھنڈی ہوا

لمحہ لمحہ پھیلتا وہ دائرہ بھی ٹوٹ کر
آڑی ترچھی سی لکیروں کا مقدر بن گیا

غزلیں

رزاق عادل

انصار لائبریری۔ انصار روڈ۔ مالیگاؤں

تمیز اٹھ گئی اچھائی کیا بدی کیسی
لہو لہان ہوئی بیسویں صدی کیسی

گھٹا کے ساتھ سمندر کی پیاس برسی تھی
مچل گئی ہے مرے گاؤں کی ندی کیسی

یہ زندگی جسے سب لوگ پیار کرتے ہیں
ملی ہے کون سے یگ میں دروپدی کیسی

مٹے گا کون یہاں سب کے سب تو بزدل ہیں
ہمارے عہد میں تہذیب سرمدی کیسی

وجود کھو دیا اس بیج نے مگر عادل
پھلوں کے بوجھ سے ہیں ڈالیاں لدی کیسی

تابش حلیمی

کامٹی۔ ناگپور

مکان دل میں ہے مہمان اجنبی کی طرح
اب اس کی یاد بھی ہے مہرباں اسی کی طرح

ہر ایک راہ گذر ہے ترے بغیر اداس
کہاں ہے شہر میں رونق تری گلی کی طرح

فلک سے آگ برسنے کا ہے عجیب سماں
فضائیں کانپ رہی ہیں کسی کے جی کی طرح

بہار آتے ہی پھر ٹوٹنے لگے ٹانکے
ہر ایک زخم ہے خنداں تری ہنسی کی طرح

پسینہ جسم کا پوچھیں گے پیڑ کے سائے
نکل کے دھوپ میں دیکھو تو چاندنی کی طرح

ستارہ اوج پہ جن کا ہے آج کل، تابش
بکھریں گے گرد وہ سورج کے مشتری کی طرح

حبیب احمر

بتوسط اکاڈمی جرنل ہنو۔ رانچی

بدن کی دھوپ میں جلتا ہوا لہو مجھ سے
حسین سائے کی کرتا ہے آرزو مجھ سے

جو ٹوٹ جاتا تعلق کا آئینہ کسی دم
زبانِ سنگ میں کرتا وہ گفتگو مجھ سے

یہ بن رہا ہے خیالات میں بھنور کیسا
گزر رہی ہے کوئی موجِ جستجو مجھ سے

نہ بول اپنی خموشی کو اب زباں دیکر
نہ چھین میرے سوالوں کی آبرو مجھ سے

برہنہ وقت کے سورج نے کر دیا احمر
فضول سائے کی کرتا ہے آرزو مجھ سے

******

की पूर्ति में तीव्रता और दृढ़ता

******

लित वर्ग की ओर विशेष ध्यान

रियों में हरिजनों को १८ प्रतिशत अंश तुरन्त दिया जायगा

प्रतिशत पुलिस कान्सटेबुलों के रिक्त स्थान हरिजनों के लिए क्षित किए गए हैं

के अन्त तक चार लाख हरिजन परिवारों के लिए आवास-भूमि आवंटन सम्पन्न कर दिया जायगा

मार्च तक ८७५ गांवों में हरिजनों के लिए एक करोड़ की लागत से ९,७१० मकान तैयार कर दिये जायेंगे

के उत्पीड़न के मामलों में स्थानीय पुलिस तथा से जवाब-तलब किया जायगा

सरकारी तथा गैर सरकारी डिग्री कालेजों के छात्रावासों में स्थान हरिजन छात्रों के लिए आरक्षित कर दिये गये हैं।

प्रतिक्रियाओं का दमन करके ही रहेगा।

प्रकाशित, मुद्रक, सील द्वारा

KITAB Registered with the Registrar of Newspaper at R. No. L-1781
JAN -FEB. 1974 LUCKNOW-3 Reg. No. LW/N.P.-90




NEW DELHI-110025

اپریل مئی جون ۱۹۷۲ء

• حیات اللہ انصاری • سہیل عظیم آبادی • عابد سہیل
• ڈاکٹر قمر رئیس

شمارہ
۱۲۷

اپریل، مئی - جون ۷۲ء

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

کپور مارکیٹ لکھنؤ ۳

افسانے

نظمیں

غزلیں

تبصرے

ایڈیٹر [illegible] • [illegible] • نذر سالانہ • سالانہ خریداری • [illegible]
[illegible] • ادارہ [illegible] • ۱۶ روپے • ۲۵۱ • روپے • کپور مارکیٹ [illegible]

پہلا ورق

عصرِ حاضر کے بعض ادیب چند باتیں بڑی شد و مد سے کہتے رہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ادب کا موضوع انسان کا سماجی وجود یا اس کے سماجی مسائل نہیں ہوتے بلکہ اسکی ذات کا وہ جوہر ہوتا ہے جو سماجی ماحول اور رشتوں سے آزاد ہے۔ اس کی روحانی زندگی کے وہ مسائل ہوتے ہیں جو ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں۔
دوسرے یہ کہ موجودہ دور برق رفتار تغیرات کا دور ہے۔ انسانی وجود بھی ہر لحظہ اس تغیر کی زد میں ہے۔ اس کی آگہی پُرآشوب، اس کا ذہن حشر ساماں اور اس کا احساس تند خو ہو گیا ہے۔ گزشتہ زمانوں کے ادب میں انسان کا جو پیکر نظر آتا ہے آج کا انسان اس سے بہت مختلف ہے۔ اس لئے ادب میں اس کی زندگی اور اس کے تجربات کا اظہار نئے اسالیب نئی زبان اور محاورہ کا متقاضی ہے —— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج کا فنکار ہر عقیدہ، ہر نظامِ فکر، ہر فلسفہ اور ہر ازم سے بیزار ہے۔ وہ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، چھو کر اسے آزادانہ طور پر پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ دوسری طرف فلسفۂ وجودیت کو نئے فنکاروں کے ذہن و فکر کی کلید کہا جاتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ اس طرح کے دعوے غلط ہیں یا صحیح بلکہ یہ کہ انکی افراط نے ادب میں بے جہتی اور بے اعتمادی کی جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے کیا اسے صحت مند کہا جا سکتا ہے؟ ان تصورات میں باہمی طور پر جو تضاد اور بُعد ہے کیا اس سے نزاع کی سی کیفیت پیدا نہیں ہو رہی ہے؟ چند سال قبل ہمارے ادب میں جو تخلیقی اُبال تھا۔ جس جوش و خروش سے لکھا جا رہا تھا جو تجربے ہو رہے تھے آج اس میں ٹھہراؤ اور اضمحلال سا کیوں ہے؟ کیوں نئے ادیب اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں؟ کیوں انکی انفرادیت کے نقوش اب دھندلے نظر آتے ہیں؟ کیوں اب نئی حقیقت کے دعوے اور نعرے فارمولے لگنے لگے ہیں؟
اب وقت آ گیا ہے کہ ان مسائل پر سنجیدگی سے سوچا جائے

ایسا لگتا ہے کہ سالِ گزشتہ کی طرح یہ سال بھی اردو کے لئے نامبارک سال ہے۔ اس سال کے آغاز [illegible] کے کئی محسنوں اور نامور ادیبوں سے محروم ہو گئے۔ دہلی میں سلام مچھلی شہری، بمبئی میں [illegible] میں [illegible] بہار میں [illegible] شمسی اور حیدرآباد میں سجاد مرزا ہم سے رخصت ہو گئے۔ [illegible] خلوص اور سنجیدہ انہماک کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی [illegible] ۔ انکی معصومیت [illegible] اور حسن سے ان کا [illegible]

نئے تجربات کی جرات ان کی تخلیقی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہے۔ یہی ان کی انفرادیت اور امتیاز بنے۔ مہندر ناتھ نے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں اپنے لیے امتیازی جگہ بنالی تھی۔ وہ کئی ترقی پسند پرچوں کی ادارت سے وابستہ رہے۔ اپنے مسلک اور کردار سے وفاداری ان کا ایمان تھا۔ وہ ہمیشہ خاموشی اور عزم و استقلال سے لکھتے رہے۔ اپنی ایک کہانی 'ایک ہی راستہ' میں انہوں نے کہا ہے کہ اس عہد کے ادیبوں کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ محنت کش انسانوں کے مقدر سے اپنے آپ کو وابستہ کر دیں۔

حال ہی میں حکومت اتر پردیش، اردو اکیڈمی لکھنؤ اور غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی طرف سے اردو ادیبوں کی تصانیف پر انعامات کا اعلان ہوا ہے۔ انہیں سے چند ادیب کتاب کے مستقل قلمی معاونین ہیں مثلاً قاضی عبدالستار، کوثر چاند پوری، رام لال، رتن سنگھ، وحید اختر، شاذ تمکنت، فضا ابن فیضی، بشیر بدر، نور پرکار، من موہن تلخ وغیرہ۔ ادارہ انکو اور دوسرے تمام ادیبوں کو جنھیں انعام ملا ہے مبارک باد پیش کرتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو اکیڈمی ہر سال جن کتابوں کو انعام کے لیے چنتی ہے انکی درجہ بندی کے پیچھے یا تو کوئی اصول ہوتے نہیں اور اگر ہوتے ہیں تو ان کا تعلق کتابوں کے معیار یا انکی قدر و قیمت سے نہیں ہوتا۔ نتیجہ میں اردو زبان و ادب کی ایسی بے لاگ سرپرستی، بعض باصلاحیت ادیبوں کے ساتھ بے انصافی کی صورت میں [illegible] ہوتی ہے۔ اسی بے انصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے گزشتہ سال عمیق حنفی نے اپنا انعام واپس کر دیا تھا۔ اس سال بھی کچھ ادیبوں کی حق تلفی ہوئی ہے۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب خون جگر صرف کرنے والے سنجیدہ اور باصلاحیت ادیب ان انعامات کے لیے امید وار ہونے سے گریز کریں گے۔ اور یہ انعامات صرف تیسرے درجہ کے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو اکادمی یہ صورتِ حال پیش نہ آنے دے گی۔

کتاب کے دو عظیم محسن چند ماہ قبل ہم سے بچھڑ گئے۔ یہ دو محسن تھے تصدیق سہاوری اور شعیب انصاری۔ تصدیق صاحب اکثر و بیشتر رسالہ کے بارے میں اپنی تفصیلی رائے سے ہمیں مطلع کرتے لیکن ہر بار ان کا اصرار یہ ہوتا کہ یہ رائے صرف مدیر کتاب کے لیے ہے، اشاعت کے لیے نہیں۔ دھیرے دھیرے وہ کتاب سے اس حد تک محبت کرنے لگے تھے کہ بمبئی سے بیدی، باقر مہدی، اختر الایمان وغیرہ کی تخلیقات اور اہم ادبی جلسوں کی روداد ہمیں برابر بھیجتے۔ انتقال سے چند ماہ قبل، بلکہ جس دن ان پر قلبی دورہ پڑا تھا اسی دن انہوں نے باقر مہدی سے اپنی ایک گفتگو ہمیں بھجوائی تھی۔ ادھر کاغذ کی نایابی کی وجہ سے ہمیں ضخامت میں کمی کرنی پڑی ورنہ اب تک یہ گفتگو شائع ہو چکی ہوتی بہر حال اب یہ چیز جلد ہی شائع ہو گی۔ تصدیق صاحب کو ادب اور ادیبوں سے جو شغف تھا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ انصاری صاحب بھی روزِ اول سے کتاب کے خریدار تھے۔ اچھے ادب کے شیدا تھے، کی اشاعت میں پابندیٔ وقت کے خواہاں، جنگ آزادی کے سورما، خدا ترس، دیندار۔ خدا ان دونوں حضرات کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

قرۃ العین حیدر
۲- آشا محل۔ نوروجی گمادیا روڈ بمبئی ۲۶

ملفوظاتِ حاجی گل بابا بیکتاشی

رات بھر میرے دریچے کے نیچے آفذ بائیجانی ترکی مرغابی ہوا کی صبح صفوانہ میری آوازیں مدھم پڑیں اور کوہ قاف کے دھندلکے میں ڈوب گئیں۔

جب سورج نکلا میں نے سرائے کے باہر آکر آسمان پر رُخ کو تلاش کیا۔ لیکن رُخ کے بجائے ایک فاختہ ہلاوات کی سمت سے اڑتی ہوئی آئی۔ فاختہ کی چونچ میں ایک عدد خط تھا۔ صحن میں آکر وہ اس سماوار پر بیٹھ گئی جو انگوروں کی بیل کے نیچے ایک کونے میں تپائی پر رکھا تھا۔

فاختہ نے پتلیاں گھما کر چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پھدک کر سماوار سے اتری لفافہ میرے نزدیک گرایا اور کوہ ارارات کی طرف پھر سے اڑ گئی۔

سرائے کے مالک نے بغیر دودھ کی چائے فنجان میں انڈیل کر مجھے دی اور بولا "ہانم۔ شاید رُخ نے آپکو اطلاع بھیجی ہے کہ اس نے اپنی فلایٹ پوسٹ پون کی۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ایسا ہے کہ یہ ان دکھیاروں میں سے کسی ایک کا خط ہے جو اپنے لاپتہ عزیزوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اس قسم کے پیغام مشرق و مغرب دونوں طرف سے اکثر ملا کرتے ہیں۔"

"کوئی تعجب نہیں کیونکہ جنگیں ہر سمت جاری ہیں" سرائے کے سفید ریش مالک نے جو بالکل تاشقند کا حاجی مراد معلوم ہوتا تھا اور روسی بلاؤز کی جیب میں ایک عدد صرف نقلی پستول رکھتا تھا، اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے دریافت کیا۔ "ہانم۔ یہ والی جنگ کون سی تھی؟"

میں نے فنجان تخت کے کنارے پر رکھ کر خط پڑھا۔

تب میں نے طے کیا کہ وقت آگیا ہے کہ تلاش شروع کرنے کے لیے بالکل ابتدا کی طرف واپس چلا جائے۔

چنانچہ میں نے اپنا روزمرہ کا ماسک چہرے سے اتارا۔ حاجی مراد کو خدا حافظ کہا اور ارارات کی سمت چل پڑی جو سامنے جگمگا رہا تھا لیکن بہت دور تھا۔

میں دن بھر چلا کی۔ بہت سی وادیاں اور منزلیں طے کیں۔ عین غروبِ آفتاب کے وقت صنوبروں میں گھرا ایک شفق رنگ چشمہ نظر آیا۔ اس کے کنارے ایک نیلی آنکھوں اور سرخ داڑھی والا فقیر مراقبے میں مشغول تھا۔ میں نے بغور دیکھا۔ وہ خواجہ سبز پوش نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ان علاقوں کا دستور ہے۔ اس بزرگ نے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس کی سفید نمدے کی کلاہ اور دھاری دار چغے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگلے وقتوں کا بیکتاشی درویش ہے۔

اب میں نے دیکھا کہ آفتاب اور بدرِ کامل دونوں افق پر موجود ہیں۔ صنوبروں پر رات کے پرند نغمہ زن ہوئے۔ پھر سورج اور چاند دونوں جھیل کے پانیوں میں گر گئے۔ جھیل کا رنگ سیاہ ہو گیا۔

اس بزرگ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور "یا ہو" کا نعرہ بلند کیا جو مجھے معلوم تھا کہ بیکتاشی فقراء کے سلام کا طریقہ ہے۔

دفعتاً اس پیر مرد نے بولنا شروع کیا۔ [illegible] ایک

فقیر مرنی ٹیپ ریکارڈر چلا دیا ہو۔ اس نے کہا "میں اس عجیب روشنی میں سفر کرتا ہوں جو نہ زمین کی روشنی ہے نہ آسمانوں کی۔ جو انوار الٰہی کی سات روشنیوں سے مل کر بنی ہے۔ سنو کہ زندہ ابھی سے مر چکے ہیں۔ اور مُردے زندہ ہیں۔ کھوپڑیاں چمکتے غاروں میں گا رہی ہیں جب اُن کی آوازیں سمندروں کا شور بن جاتی ہیں میں اپنے تکیے پر منتظر رہتا ہوں۔

"میں رات دن خوف الٰہی کی چکی پیستا ہوں اور خالق کی رضامندی کی چکی میں سے دانہ نکالتا ہوں۔ اے ہانم۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"افندم" میں نے عرض کی۔ "ایک اجنبی عورت نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور ایک طوفانی دریا کے کنارے رہتی ہے اور اس نے لکھا ہے "دریاؤں کی موجیں لوٹ لوٹ آتی ہیں۔ لیکن وقت نہیں لوٹتا کیونکہ زمین بھی گردش میں ہے۔ خزاں کی ہوائیں چلیں۔ اور جنگلوں میں اونچے درختوں کے پتے سرخ ہو گئے۔ شاخیں کھڑکھڑائیں اور دلدلوں میں جنگلی بطخیں چلا رہی ہیں دماغ باقی ہیں۔ اور جسم ختم ہو گئے۔

"عرصہ دو سال کا ہوا میرا شوہر غائب ہو گیا میں باؤری سب سے پوچھتی پھرتی ہوں کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ خاتون۔ آپ کو ترکوں کی سرزمین میں شاید کوئی واقف اسرار مل جائے۔"

جس وقت میں یہ خط پڑھ کر سنا رہی تھی شمشاد کے درخت کے نزدیک کھڑے اس بزرگ نے ہاتھ سامنے باندھ کر سر جھکا رکھا تھا۔

تب اس فقیر نے ہاتھ آستینوں سے نکالے اور نظریں اٹھائیں اور کہا۔ "ملک ہنگری میں میرے جد امجد حاجی گل بابا نقشبندیؒ کی درگاہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بخارا اور استانبول اور البانیہ اور رومانیہ سے لوگ اس مزار پر انوار کی زیارت کے لیے پاپیادہ ہنگری جایا کرتے تھے۔ اے ہانم۔ اب میں وہاں جاتا ہوں۔ اور واپس آکر تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔"

درویش نے ایک صنوبر کے سائے میں کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد آنکھیں وا کیں اور یوں گویا ہوا "میں نے ڈینوب کے کنارے اس شکستہ درگاہ پر ماضی اور مستقبل کا نظارہ کیا۔ سنو۔ جب میرا پردادا حاجی عدنان آفندی ایک کارواں کے ہمراہ ملک خطا جاتا تھا یار قند کے نزدیک اسے یکتاش قلی یعنی بندہ خدا کے سلسلے کا ایک نوجوان فقیر ملا۔ اس نے حاجی عدنان کو پلٹ کر دیکھا۔ اور بولا "آغا۔ فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط رہو"۔ اس کے بعد وہ شاہراہ کے کنارے آباد ایک نقشبندی خانقاہ کے دروازے میں غائب ہوا اور اسی لمحے دوسری طرف نکل گیا اور سمرقند میوزیم میں داخل ہو گیا۔ اب وہ سمرقند، ازبک سوشلسٹ سوویٹ ریپبلک کے عجائب خانے کے ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے اور اس کی آنکھیں کانچ کی ہیں۔ ہانم۔ میرے ساتھ آئیے۔"

درویش نے اپنا عصا سنبھالا اور جھکا جھکا سپرے سائے کی مانند میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم جھیل وان کے کنارے ایک تکیے پر پہنچے یہ تکیہ ایک چوبی عمارت تھی جس کی چھت سرخ رنگ کی تھی اور چاروں طرف سیب کے درخت تھے۔ اس قلندر نے کہ اس لفظ کے معنی ہیں "خالص سونے کی روح"، مجھے سیڑھیوں پر کھڑا چھوڑ دیا اور ہوا کے جھونکے کی مانند اندر چلا گیا۔

جب وہ دیر تک باہر نہ آیا تو مجھے بہت ڈر لگا۔ میں دبے پاؤں دریچے کے نزدیک پہنچی اور اندر جھانکا۔

تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک چوکور کمرہ ہے جس کا فرش چوبی ہے اور چھت نیچی جس کے شہتیر سیاہ رنگ کے ہیں فرش پر ایک آذربائیجانی غالیچے پر دو بالکل ہمشکل درویش آمنے سامنے خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک کونے میں چینی کا ایک فرنچ اسٹوو رکھا ہے جس پر گلاب کے پھول سجے ہیں۔ ایک شہتیر سے ایک طنبورہ آویزاں ہے اور فرش پر ایک نے رکھی ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی روحانی بانسری کی نمائندہ ہے۔

دونوں درویش چپ چاپ بیٹھے رہے۔ [illegible] میں سے ایک افغان اور [illegible] کی طرف رخ کیا جو مجھے معلوم تھا کہ مدینہ منورہ کی سمت تھی۔ درویش [illegible] آذربائیجانی

بھیڑوں کی اُون سے بُنا گیا تھا ایک چھوٹا سا پتھر نکالا۔ کہ المصطفیٰ اکثر بھوکے رہنے کی وجہ سے اپنے پیٹ سے پتھر باندھے رہتے تھے۔ اور بیکتاشی فقرا اس سنت رسول کی پیروی کرتے ہیں۔ درویش نے بیکتاشی طریقت کی ایک رسم شروع کی۔ اس نے پٹکے کی گرہ باندھی اور کھولی اور پھر باندھی اور کھولی اور دہرایا "میں شر کو باندھتا اور خیر کو کھولتا ہوں۔ میں جہالت کو باندھتا اور خوف الٰہی کو کھولتا ہوں۔ طمع کو باندھتا اور فیاضی کو کھولتا ہوں۔ میں عجز و انکساری کی درانتی سے پرہیزگاری کی فصل کاٹتا ہوں۔ میں خود آگہی میں بوڑھا ہوتا ہوں اور صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتا ہوں ——"

تب میں دریچے سے چند قدم پیچھے ہٹی اور آسمان کی طرف منہ کیا اور ایک اور بیکتاشی مناجات پڑھی —"اے وہ جس کا کوئی نام نہیں۔ اے بیکتاش جو زمانے کے ساتھ گردش کرتا ہے جو شب تاریک میں سنگِ سیاہ پر رینگتے چیونٹے کی آواز سن لیتا ہے" لیکن اب میں نے بڑی چالاکی سے اپنے پیغام کا اضافہ کر دیا۔ "اے بیکتاش! تو مظلوموں کی فریاد ہی نہیں سنتا"

لیکن میری آواز درویشوں کے وظیفے کے شور میں ڈوب گئی۔ وہ اب چلا رہے تھے۔ "اے نبی! جس پر بادل ہمیشہ اپنا سایہ کیے رہتے تھے۔ المصطفیٰ — دنیا پر رحم فرما — رحم — رحم" "کریم اللہ — یاہو"۔ بیکتاشی نعروں سے کمرہ گونج اٹھا۔

دوسرے لمحے وہ درویش کہ نام ان کا حاجی سلیم آفندی تھا، ایک صراحی اور کوزہ ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔ "خانم۔ اس بد قسمت عورت کے لیے جو کچھ میں کر سکتا ہوں کروں گا۔ لیکن علی مرتضیٰ شاہِ ولایت نے کہا ہے 'جو کچھ لکھا گیا ہے ہمیشہ موجود رہے گا۔'"

تب میں نے ایک بہت غیر متعلق بات حاجی سلیم سے کہی میں نے عرض کیا: "افندم۔ میرے وطن میں جو یہاں سے ہزاروں میل دور ہے، ہماری آبائی حویلی میں جو اب کھنڈر ہو چکی ہے، ایک تہ خانہ ہے اس تہ خانے میں پرانی کتابوں کے انبار ہیں۔ اور ایک پرانا شکستہ چینی کا فرنچ اسٹوو جس پر گلاب کے پھول بنے ہیں اور انگلیکو [illegible] جو سب ان کتابوں [illegible]

اور برطانیہ اور فرانس اور مصر اور ایران میں کسی زمانے میں بڑے شوق سے لکھی اور چھاپی گئیں — قسطنطنیہ ۱۸۷۳ء۔ لندن۔ ای سی فرد ۱۸۸۲ء۔ طہران ۱۸۹۲ء۔ قاہرہ ۱۹۰۲ء۔ اور ایک نسبتاً جدید کتاب بھی وہاں پڑی ہے۔ لندن سل اسکوائرڈ ۱۹۵۲ء۔ اور ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک گرآلود سہ پہر میں فرنگیوں کے اس بزرگ صوفی سے ان کے فیبر اینڈ فیبر رسل اسکوائر کے دفتر میں ملی تھی۔ اور انہوں نے مجھ سے رقصاں درویشوں کے متعلق باتیں کی تھیں۔ چونکہ آپ خود اس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں مجھے تو بیسے کے اس مرحوم سلسلے کے متعلق کچھ بتایئے کہ قونیہ بھی اب محض ایک ٹورسٹ اٹریکشن ہے۔"

درویش نے سر جھکایا اور رونے لگے پھر آنسو آستین سے پونچھے اور خود بھی ایک قطعی غیر متعلق بات کہی۔ "خانم"۔ حاجی سلیم نے فرمایا۔ "میں اس لیے روتا ہوں کہ قانون خداوندی کے مطابق میرا ہمزاد جو اندر بیٹھا ہے۔ میرے مرنے سے ٹھیک چالیس دن قبل مر جائے گا۔ ان چالیس دنوں میں کیا کروں گا؟ کیونکہ وہ مجھے خبردار کرتا رہتا ہے۔"

دفعتاً حاجی سلیم پھر چلائے۔ "مولائے کائنات شاہِ نجف نے فرمایا ہے۔ 'جو کچھ لکھا گیا ہے رہے گا'،"

"افندم" میں نے عرض کی۔ "اوپر والوں کی باتیں تو میں نہیں جانتی مگر جو کچھ یہاں لکھا جاتا ہے اکثر بے حد خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ ہر حرف کا ایک موکل موجود ہے۔"

درویش نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "جب اس صاحبِ زماں نے حکم نامے پر دستخط کیے تو اس کے حروف کے طاقتور موکل اڑ کر گئے اور انہوں نے تباہی پھیلا دی۔ دماغ پاش پاش ہوئے اور جسموں کے پرخچے اڑ گئے — افندم میں اس اجنبی عورت کو کیا جواب دوں؟"

"فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط رہو۔ خبردار رہو۔"

"اس اجنبی خاتون نے لکھا ہے کہ اس کے خاوند کا نام ابوالمنصور تھا۔ اور وہ تصویریں بناتا تھا۔

"کیا وہ اپنی کھوپڑی بچانے کے لیے جنگل کی سمت نہیں بھاگا؟" حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ اجنبی عورت نے لکھا ہے کہ وہ ایک تالاب کے کنارے بیٹھا جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا رہا۔"

"نہایت احمق تھا۔" حاجی سلیم نے مختصراً کہا۔

"اور ہزاروں لاکھوں انسان جنگلوں اور دلدلوں اور سرحدوں کی طرف بھاگے۔ اور زمین ان کے پیروں تلے سے نکل چکی تھی اور سروں پر تلواروں کا سایہ تھا۔"

"کوئی تلوار نہیں سوا ذوالفقارِ علیؑ کے۔" حاجی سلیم نے میری بات کاٹی۔

میں خاموش ہو گئی۔

"کیا جب قیامت آئی شخص مذکور تنہا تھا؟" حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ مرگِ انبوہ کے جشن میں شامل تھا۔"

"یہ کہاں کا ذکر ہے؟"

"ہر جگہ کا مشرق۔ مغرب۔ شمال۔ جنوب۔ بیکتاش کا چہرہ ہر سمت ہے۔"

حاجی سلیم نے غور سے مجھے دیکھا۔ "ہانم۔ کیا تم ان میں سے نہیں ہو جو ایمان لائے؟"

میں نے بات جاری رکھی۔ "اور لاکھوں سرحدوں کی طرف بھاگے۔ وہ بحالت خموشی مشرق سے مغرب کی جانب گئے اور اسی طرح سر جھکائے پھر واپس لوٹ گئے۔ تب میں نے بہت سوچا کہ یہ سب کیوں ہوا۔ اور تب مجھے یاد آیا۔ لکھا ہے: جو اپنی روح کا حج کرے اس پر اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی روح کا حج کیا پر کچھ دریافت نہ ہوا۔"

"ہانم۔ شاید تمہارے قلب پر کفر کی مہر گہری لگی ہے۔" حاجی سلیم نے کہا اور مراقی سے تھوڑا سا پانی کوزے میں انڈیلتے ہوئے ایک بیکتاشی دعا پڑھی — "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ اور محمدؐ اس کا رسول۔ اور علیؑ اس کا دوست۔ اور امام مہدیؑ آخر الزماں۔ اور موسیٰؑ کلیم اللہ اور عیسیٰؑ روح اللہ — ہانم اس پانی میں دیکھو —"

"کیوں۔ کیا آپکو جامِ جمشید مل گیا ہے؟" میں نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

"ہانم۔ پانی میں دیکھو۔"

میں نے دیکھا۔ اور کہا۔ "افندم۔ اس میں تو مجھے ایک عدد گھوڑا گاڑی نظر آتی ہے۔ یعنی اسٹیج کوچ۔ جو ایک جاپانی سے پل پر سے گزر رہی ہے۔" پھر دفعتاً میں نے ریڈیو یا ٹیلی وژن کے COMMENTATOR کی طرح جوش سے کہنا شروع کیا۔

"اور اس گاڑی میں ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک پہنے بیٹھی ہے — اور کوچوان کا چہرہ نہیں ہے — کوچوان کا چہرہ نہیں ہے — اور اب ایک ناؤ جو وسیع دریا کے دھندلکے میں رواں ہے۔ اور کنارے پر نازک سے پہاڑ اور بانس کے جھنڈ اور بید کے پودے۔ اور پہاڑی کے دامن میں بانس کا جھونپڑا۔ اس کے برآمدے میں ایک سنکی سا انسان۔ بکرے کی سی داڑھی — بیٹھا تصویر بنا رہا ہے — افندم — یہ سب تو کچھ زین سا معلوم ہوتا ہے —"

"زین بھی درست ہے۔ ہانم۔ اور غور سے دیکھو۔ ناؤ یا بجرہ گاڑیاں —؟"

"افندم — افندم —" آپ کے پیالے کا پانی سرخ ہو گیا۔

"کرم اللہ — یا ہو —" حاجی سلیم نے ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے دہرایا۔ کوزہ اٹھا کر سر جھکائے سیڑھیاں اترے سیب کے جھرمٹ سے گزرتے جھیل کے کنارے پہنچے اور دفعتاً اس مشاقی اور پھرتی سے کوزہ دور پانی میں پھینک دیا جیسے کرکٹ کے کھلاڑی گیند پھینکتے ہیں۔ پھر وہ تکیے پر واپس آئے اور سیڑھی پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔

"میں خوفِ الٰہی کی چکی پیستا ہوں۔ اور نفرت اور ظلم کو باندھتا ہوں۔ اور محبت اور دردمندی کو کھول دیتا ہوں۔ اور حلم و غضب کو باندھتا ہوں — اے ہانم ہندی — کیا یہ شخص ابو المنصور ایک انسان تھا یا ایک علامت؟"

"دونوں" میں نے جواب دیا۔

حاجی سلیم نے سر جھکا کر دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

"کیا میں اس خاتون کو لکھ دوں کہ وہ صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتی رہے؟" میں نے پوچھا۔ "افندم۔ اب میں شاہجہاں آباد واپس جاتی ہوں۔ آپ بھی استانبول لوٹ جایئے اور وہاں محلہ پیرآیا توپ کاپو میں اپنا تکیہ مرلوی آباد کیجئے یا خانقاہ اوغلو علی پاشا۔"

"ہانم۔ میرے واپس جانے کے لیے اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ استانبول کے ۲۵۶ دوسو چھپن تکیے نصف صدی ہوتے آئی ایک صاحب الزماں کے حکم سے بند کر دیے گئے۔ چند ایک کے ماڈل عجائب خانوں میں رکھے ہیں۔ یہ فقیر حقیر بھی ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے۔" حاجی سلیم نے کہا اور آنسو بہاتے رہے۔ دفعتاً میں نے نوٹس کیا کہ حاجی سلیم کی نیلی آنکھیں کانچ کی تھیں۔

"بہر حال۔ افندم۔ آپ جہاں کہیں بھی واپس جائیں اس بیکتاش سے کہہ دیجئے گا کہ ساری دنیا میں مشرق و مغرب شمال و جنوب میں اس کے قبیلوں پر بہت ظلم ہوئے اور ہو رہے ہیں ــــ اور دعا کرتے رہیے۔"

"ہم بیکتاشی محض دعا نہیں کرتے۔ ہانم۔ تم۔ نماز پڑھتی ہو۔؟ سیدھی سادی نماز؟ ہم نماز پڑھنے کو دارِ منصور پر چڑھنا کہتے ہیں۔ میں روز دارِ منصور پر چڑھتا ہوں۔ اور فنا ہوتا ہوں۔ اور زندہ ہوتا ہوں۔ چونکہ تم ایسا کبھی نہ کرو گی تمہیں کچھ معلوم نہ ہوگا۔ میں روزانہ خواہشات کو باندھتا اور قناعت کو کھولتا ہوں۔ خدا صابر ہے کیونکہ حی و قیوم ہے۔ بندہ بے صبر ہے۔ کیونکہ اسکی زندگی چند روزہ ہے۔ اور وقت تیزی سے گذرتا جاتا ہے۔"

تب میں نے ذرا بے ادبی سے کہا۔ "افندم۔ آپکو ہسپانیہ کے حاجی یوسف بیکتاشی کا نام یاد ہے؟ پندرھویں صدی عیسوی میں وہ علیہ الرحمۃ اندلس میں موجود تھے۔ جب مسلمانوں پر قہر ٹوٹا ان کا اور ان کے مریدوں کا صبر و رضا کسی کام نہ آیا۔"

حاجی سلیم نے میری بات کا مطلق نوٹس نہ لیا اور کہتے رہے "میں انوارِ الٰہی کی روشنی میں سفر کرتا ہوں۔ میں ننانوے اسمائے الٰہی کی روشنی میں چلتا ہوں۔ ہو جو بے رنگ سرخ ہے۔ احد سبز اور عزیز جو سیاہ ہے اور ودود جس کی ذات میں روشنی نہیں ــ حاجی سلیم بیکتاشی کی گفتگو ختم ہوئی ـــ"

معاً غیر مرئی ٹیپ ریکارڈ میں سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی نے اسے الٹا چلا دیا ہو۔ کیونکہ وجود متعدد حصوں میں منقسم ہے۔

حاجی سلیم سامنے دیکھتے دیکھتے اپنا لبادہ سرسراتے تکیے کے اندر جاکر غائب ہو گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں زنگ آلود موٹا قفل پڑا تھا۔

میں نے انگور کی بیلوں سے گھرے دریچے میں جاکر اندر جھانکا۔ حاجی سلیم اور انکا ہمزاد اپنے اپنے ہاتھ سامنے باندھے گم سُم آمنے سامنے دو زانو بیٹھے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ دونوں پیلے پرانے کاغذوں میں تبدیل ہو گئے۔ کوہ اراراٹ کی طرف سے ہوا کا ایک تیز سرد جھونکا آیا جس میں دریچے کے شکستہ پٹ بھڑ سے کھل گئے اور وہ دونوں درویش پرزہ پرزہ ہوکر کمرے میں بکھر گئے باہر آکر ان کے پرزے فضا میں چکر کاٹنے لگے اور خستہ فالتو کاغذوں کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔

رُخ تغلق آباد کی سر زمین پر اترا اور اپنے پنکھ پھیلا دیے۔ میں نے نیچے آکر شہر کا رُخ کیا۔ راہ میں سوچی تلاش یہاں از سرِ نو شروع کرنے سے قبل اپنے پرانے ٹوٹے ماسک کی مرمت کروانا ضروری ہے۔ گو میں زیادہ مدت بعد واپس نہیں آئی تھی لیکن شہر بدل گیا تھا۔ تب اندر پرستھ کی ایک گلی میں میں نے ایک رتھ بان سے پوچھا۔ "او بھائی رتھ بان۔ جمبو دویپ کی تازہ ترین آنچل کی۔ راجدھانی کا راستہ کدھر ہے۔" اس نے کہا "معلوم نہیں" اور گھوڑوں پر چابک لگا کر روانہ ہو گیا۔

تب میں اور آگے بڑھی۔ اور ایک نورانی شہسوار سے دریافت کیا۔ "او بھائی شہسوار اگر میں تغلق آباد پہنچ گئی ہوں تو کسی ایسے کارخانے کا راستہ بتاؤ جہاں میں اپنے ماسک کی مرمت کروا سکوں۔"

شہسوار نے جواب دیا۔ "بی بی سامنے تغلق نگار خانم کا مقبرہ ہے یعنی تھا۔ اس کے اوپر جو ایر کنڈیشنڈ عمارت کھڑی ہے

اس کے اندر وہ قدیم خاتون جو رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں میں SHE کے نام سے ایکٹنگ کیا کرتی تھی اب بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔"

لہٰذا میں اس کارخانے پر پہنچا۔ اس کے سامنے ایسا ہجوم تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔ میں نے اندر جھانکا۔ بیرونی سے جگمگاتی بہت سی عورات ایک قطار میں خوفناک مشینوں کے نیچے سر دیے ساکت و صامت بیٹھی تھیں۔ اور مزید عورات اس طرح آ رہی تھیں جیسے فرنگستان میں مردے MORTICIANS کے ہاں آتے ہیں۔

دہشت زدہ ہو کر میں الٹے پاؤں باہر نکلی تو شاہجہان آباد کی ایک گلی میں ایک چگی داڑھی والے نوجوان نے میرا راستہ روکا اور گویا ہوا۔ "اے اس قدر CONFUSED نظر آنے والی بھاری بھیلا۔ میں ایک پردیسی مسافر ہوں اور مجھے بھوک لگی ہے۔ کسی ایسی جگہ کا پتہ بتلا سکتی ہو جہاں میں دریائی مچھلی اور اچھا بھات کھا سکوں؟"

میں اسے جامع مسجد کے قریب ایک بھٹیار خانے میں لے گئی جہاں قلعے کے چبوترے "سلاطین" اور "شعرا" کی آمد و رفت رہتی تھی۔ دیکھا تو بھٹیار خانہ سنسان پڑا تھا۔ میں بہت مایوس نظر آئی تو اس اجنبی نوجوان نے کہا۔ "بانوئے محترم۔ آئیے نیو دہلی چلتے ہیں۔"

نیو دہلی کے ایک MOD ریستوران میں چگی داڑھی والا یوں داخل ہوا جیسے لنچ پانی میں داخل ہوتی ہے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ شخص نامعلوم آرٹسٹ ہے۔ اس طعام خانے میں مرد اور عورتیں بالکل یکساں نظر آ رہے تھے۔ بلکہ عورتیں مرد اور مرد لڑکیاں معلوم ہوتے تھے کہ یہ UNISEX LOOK کہلاتا ہے۔

پردیسی نوجوان نے دریچے کے قریب میز پر بیٹھ کر دریائی مچھلی منگوائی اور کہا کہ گو وہ اب ہمارا دوست اور حلیف ہے لیکن اپنا بل خود ادا کرے گا۔

تب میں نے اس سے کہا۔ "اے بھائی پردیسی مہمان میں تمہاری اس خودداری کی قدر کرتی ہوں لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ نوجوان دریچے سے باہر دیکھتا رہا جہاں ترک بادشاہوں کے خستہ مقبروں میں غریب غربا ٹاٹ کے جھونپڑے ڈالے شام کا کھانا پکا رہے تھے کیونکہ بہرحال سب کچھ زندگی ہے اور یکتاش کا چہرہ ہر طرف ہے۔

اچانک اس نوجوان نے حاجی سلیم آفندی کی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کٹھ پتلیاں رسیوں سے آویزاں اسٹیج پر اتاری جاتی ہیں۔ یہ تماشاگر ایک رسی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ دوسری کٹھ پتلی نیچے اتار دیتا ہے۔"

"یہ بھی درست ہے۔" میں نے حاجی سلیم آفندی کی مانند جواب دیا۔ پھر میں نے مستعدی سے اجنبی عورت کا خط پرس میں سے نکالا اور بولی۔ "اے بھائی مسافر۔ زندہ مردوں کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور مردے زندوں کے۔ اور تصویروں کی تصویریں باقی ہیں چونکہ تم طوفانی دریاؤں کی سمت سے آئے ہو ممکن ہے تم نے مصوّر ابوالمنصور کا نام سنا ہو۔"

مسافر کھانا کھاتا رہا۔ کیونکہ کھانا پیدائش اور موت اور ازل اور ابد کے درمیان سب سے بڑی اور ٹھوس حقیقت ہے۔ گو ہم سے کہا گیا تھا کہ بھوک کو باندھو اور قناعت کو کھولو۔ تاکہ کچھ لوگ باقی لوگوں سے زیادہ کھا سکیں۔

میں نے پھر دریافت کیا۔ "تم یہاں کاہے کی جستجو میں آئے ہو؟"

"کیا جستجو ضروری ہے؟" اس نے کہا۔ "میں یہاں نیشنل اسکول آف ڈراما میں آپکی حکومت کے اسکالرشپ پر فن تماشاگری سیکھنے آیا ہوں جس فن کے آپ لوگ ماہر ہیں۔"

"کیا تم ان لوگوں کے قبیلے سے ہو جو نقلی چہرے لگا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کوئی اور ہیں؟ کیا تمہارے ماں باپ اداکار ہیں؟"

"میرا باپ جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا تھا۔"

"کیا اب بھی وہ زندوں میں شامل ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

تب نوجوان نے اکتا کر کہا "شاید میری ماں نے آپکو بھی خط لکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے لوگوں کو خط لکھ لکھ کر میرے باپ کی کھوج میں مصروف ہیں اور یہ یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ میرے باپ کو صبح پانچ بجے طلوعِ آفتاب سے قبل مکان سے باہر لے جا کر عالمِ بالا روانہ کر دیا گیا تھا۔"

اس کے بعد اس شخص گمنام نے کھانا ختم کیا۔ سکون سے خدا حافظ کہا اور ریستوران سے باہر چلا گیا۔

میں نے دریچے میں سے دیکھا۔ نیو دہلی کی سڑکیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ اتنے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور ایک گھوڑا گاڑی قتلق نگار خانم کے مقبرے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اور سنسان سڑک پر سامنے سے گذر گئی۔ اس اسٹیج کوچ کے اندر ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک لگائے بیٹھی تھی۔ کوچوان نے شوگن عہد کا کیمونو پہن رکھا تھا۔ کوچوان نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اور اس کا چہرہ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے ماسک کو چھوا۔ اور مجھے یہ خوفناک احساس ہوا کہ میں یہ محض ظاہر ہی نہیں کرتی کہ میں کوئی اور ہوں۔ میں واقعی کوئی اور ہوں۔ اور ایک ایسی نوہ تمثیل میں شامل ہوں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

عزیز من! آج سے چھ سو برس قبل حاجی گل بابا بیکتاشی علیہ الرحمہ نے یہ معمہ اپنے مریدوں کے سامنے رکھا تھا جب وہ نیلے ڈینیوب کے کنارے عثمانی مملکتِ ہنگری میں اپنی خانقاہ کے اندر بیٹھے حکایات قدیم و جدید کے ذریعہ درس دیا کرتے تھے۔

"اور اس مقام پر میرا راگ ختم ہوا۔ اے دیناؤ۔ اب رخصت ہو۔ اور واپس جاؤ۔" مولانا جلال الدین رومی نے کہا اور نَے ہاتھ سے رکھ دی۔

میکش اکبرآبادی
میوہ کٹرہ ۔ آگرہ

تعارف

تجھے خبر ہے یہ کس سے نظر ملی تھی تری
وہ ایک مردِ قلندر کہ جو ہے شاعر بھی

دلوں کے رُخ کو سمجھتا ہے چال نظروں کی
ہے رازِ عقل سے واقف جنوں میں ماہر بھی

فریب خوردۂ عمرِ گزشتہ ہے وہ مگر
تجھے فریب نہ دیدے کہ ہے وہ ساحر بھی

کسی کی ہجو وہ لکھتا نہیں مگر جو لکھے
پناہ مانگ اٹھیں چنگیز اور نادر بھی

کسی کی مدح وہ کرتا نہیں مگر جو کرے
حبیبِ خلق بنے بادشاہِ جابر بھی

اگر وہ تیرا سراپا لکھے تو بے دیکھے
زمانے بھر کا ہو معبود تجھ سا کافر بھی

مگر اُسے یہی ملحوظ ہے کہ حسن ترا
نگاہِ اہلِ ہوس سے نہ ہو کہیں رسوا

--

عمیق حنفی
۵۷-اے آئی آر ہوسٹل۔ کرزن روڈ۔ نئی دہلی-۱

شعر سستا ہے

آج اس مہنگے سمے میں
شعر سستا ہے، لکھو، پڑھتے رہو
شعر سستا ہے
جیسے بارونق سڑک پر بے سبب آوارہ شام
جیسے "کیو" میں آگے پیچھے ہونے پر جھگڑا
جیسے گالی، جیسے نعرے
جیسے نامردانہ غصّہ
جیسے کُشتۂ روگی کی قے
جیسے پیلے رنگ میں لپٹا ہوا سرطان
جیسے موت!
شعر سستا ہے، لکھو، پڑھتے رہو
اور جب تھک جاؤ
تو خلا میں
اس کے حرفوں کا لباس
جسم لفظوں کا
آتما آہنگ کی
زندگی کی آخری خاموش جنبش کی طرح
ڈوب جانے دو

■■

سٹی بس

سٹی بس
ٹھساٹھس
سمیٹے ہوئے ایک قصبہ کا قصبہ
اِدھر اور اُدھر پائدانوں پہ اور پہلوؤں سے
اچھلتے لڑھکتے کھڑکتے ہوا بند پسینجروں کا اُبال
بہت ہانپتے کانپتے بھاگتے شہر کے منہ سے اڑتا ہوا جھاگ
نصیبوں کے مالک ہو، اندر تو گھس آئے ہو
مگر اپنی منزل کو تم بھول جاؤ
بس اتنا بھروسہ رکھو
تمہیں لاسٹ اسٹاپ پر جا کے بے شک اگل دیگی یہ۔

■■

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن۔ یوپی

غزلیں

سر بہ سر ہے آگہی، احساس کا چہرا کھلا
رکھ دیا ہے سامنے میں نے بھی آئینا کھلا

کون جانے مجھ سے ملنے کس گھڑی آ جائے وہ
رات بھر رکھتا ہوں اپنے گھر کا دروازہ کھلا

بند رکھ سکتا نہ تھا جو دکھ کتابوں کی طرح
وہ مری نظروں میں آتے ہی ورق جیسا کھلا

ہم ہیں صدیوں سے ابھی لمحوں کی گردش میں اسیر
وقت کی دیوار میں کب تھا کوئی رخنا کھلا

اس کے بدلے آگ میں مجھ کو اٹھا کر جھونک دو
میرے ناخن سے تمہارے دور کا عقدہ کھلا

بن گئی موج قدم، دیوار موج آب بھی
ہم نے جب ساحل پہ کشتی پھونک دی، رستا کھلا

اک ذرا بس التفات دوستاں کی دیر تھی
یوں کھلا میں جیسے کوئی زخم کا ٹانکا کھلا

اتنے چہروں میں ہے آخر میرا چہرا کون سا
آج تک مجھ پر نہ لوگو! بھید کچھ اپنا کھلا

میں بھی ہوں اک نسخۂ اسرار میری شرح لکھ
کم نہیں مجھ پر یہی تہمت کہ ہوں نکتہ کھلا

بن گیا آخر قلم میرا رفیق جاں فضاؔ
مدتوں کے بعد مجھ سے لالۂ صحرا کھلا

قدم قدم پہ مرے عہد کا سفر ہے نیا
نئے ہیں لوگ، نئی سمت، رہ گزر ہے نیا

اب اس کی ضرب سے خود کو بھلا بچاؤں کیا
ہر ایک ہاتھ میں اک تیشۂ ہنر ہے نیا

عذاب وقت کو آؤ خوش آمدید کہیں
نئی ہے تیغ، نہ قاتل نئے، نہ سر ہے نیا

پرانی قدروں کو اب کس حساب میں گھولیں
تمام سلسلۂ منظر و نظر ہے نیا

گھنی ہو چھاؤں تو کچھ موسم سفر بدلے
ابھی تو رابطۂ سایۂ و شجر ہے نیا

ہزار وقت نے روکا مگر قدم نہ رکے
لہو ہے گرم تو پھر زور بال و پر ہے نیا

سروں پہ دھوپ ہے قدموں میں آگ کا دریا
مرے لئے یہ تقاضائے بحر و بر ہے نیا

کچھ اور اس نے بدن کے خطوط ابھار دیئے
لباس لفظ و معانی کے جسم پر ہے نیا

کبھی فضاؔ کی اجالوں سے رسم و راہ نہ تھی
یہ نام تو سر دیباچۂ سحر ہے نیا

سہیل عظیم آبادی

نور منزل، سلطان گنج، پٹنہ

استاد

بانس منڈی میں منے استاد کا چائے خانہ اپنے ڈھنگ کی
ہی جگہ تھی۔ صبح اور شام کے وقت تو چائے خانہ میں بھیڑ رہتی
تھی۔ ویسے ہی چائے خانہ کسی وقت خالی نہیں رہتا تھا۔ دو چار
ی ہر وقت چائے خانے میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ منے استاد بھی دھن
کے آدمی تھے۔ اصول کے پکے، لیکن نیک دل، حبیب اور سلیقے
ن کرنے والے۔ ہر معاملے میں اُن کی اپنی رائے ہوتی تھی۔ اور ان کی
ے کو بدلنا آسان نہ تھا۔ ستر کے لگ بھگ عمر تھی۔ مگر کاٹھی مضبوط
ن تن کر چلتے تھے۔ اور محلے کے ہر آدمی سے ملتے تھے۔ چائے خانہ
کے دونوں بیٹے چلاتے تھے۔ اور منے استاد کا وقت نماز کے علاوہ
لوں سے باتیں کرنے میں کٹتا تھا۔ چائے خانے میں جہاں ان کی عمر
آدمی بیٹھتے وہاں وہ بھی جا بیٹھتے، اور ایسی ایسی کہانیاں سناتے کہ
سن کر دنگ رہ جاتے۔ جو لوگ تو ان کی باتوں کا جلدی یقین
نہیں آتا۔ اور سمجھتے کہ استاد اپنا رنگ جمانے کو ہانک رہے ہیں۔
محلے کے دوسرے لونڈے اُن سے کہتے کہ منے استاد جو بھی کہتے ہیں
کہتے تھے۔ پچاس سال پہلے بانس منڈی ایسا ہی محلہ تھا۔ اور یہاں
ایسے ہی لوگ بستے تھے۔ ایک دن کسی نے کہہ دیا۔ استاد چائے اور
دکانی نہیں۔ کھانے کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ مگر منے استاد
مانے نہیں۔ اور بولے۔ ارے یار! اللہ! اتنے میں پیٹ بھر جاتا
تو زیادہ لالچ کیوں کیا جائے۔ نہ میرا باپ سیٹھ تھا اور نہ میں سیٹھ
اپنا بنا ہوں۔ اللہ جو دے رہا ہے اس میں خوش ہوں۔ ان کے دونوں
بیٹے ان کی اس رائے کے حامی نہ تھے۔ لیکن کچھ بول سکنے کی ہمت بھی نہیں

کر سکتے تھے۔

منے استاد سختی سے نماز کے پابند تھے۔ کسی وقت کی نماز قضا
نہیں ہوتی تھی۔ جو مسلمان نماز نہیں پڑھتا تھا اس کو وہ اچھا آدمی
نہیں سمجھتے تھے۔ اور نماز پڑھنے والوں سے بہت خوش رہتے تھے۔ جب
کبھی اللہ رسول کی بات نکل آتی تو اللہ کا شکر ادا کرتے اور کہتے کہ
اس نے اپنی خاص مہربانی سے بچا لیا۔ ورنہ اُن کی دنیا بھی دوزخ
بن جاتی اور آخرت میں بھی دوزخ میں جلتے۔ اور اپنے استاد دلاور خاں
کی دل کھول کر تعریف کیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اس میں شک نہیں کہ
دلاور خاں اپنے زمانہ کے نامی بدمعاش مشہور تھے، لوگ ان کو اچھا
آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن وہ بہت شریف آدمی تھے۔ کبھی کسی کو نہیں
ستاتے تھے۔ اور غریبوں کی مدد دل کھول کر کرتے تھے۔ اپنی بیوی کے
علاوہ کبھی کسی دوسری عورت کی طرف انھوں نے نہیں دیکھا۔ اپنے بچوں
کو ہمیشہ سمجھایا کرتے تھے کہ دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنی ماں بہن سمجھو۔
دلاور خاں سرحدی پٹھان تھے۔ اُن کی پھلوں کی دکان تھی۔ مگر یہ دکان
محض دکھانے کے لئے تھی۔ ان کا اصل کاروبار کوکین کا تھا۔ اپنے بارے
میں بتایا کرتے تھے کہ ان کا باپ بہت غریب آدمی تھا اور دلاور خاں
کی پھل کی دکان میں کام کرتا تھا۔ ماں مر چکی۔ باپ مرنے لگا تو اس نے خانصاحب
کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیا۔ دلاور خاں نے اسے بیٹے کی طرح پالا۔ اور
اسے اپنی تعلیم بھی دی۔ سارے کرتب بھی سکھائے۔ مگر بعد میں انکی رائے
بدل گئی۔ اور انھوں نے چائے خانہ کھول دیا۔ بیاہ کر دیا اور اکثر رہتے
کو کہا اور سختی کے ساتھ کہا کہ کوکین چرس گانجے کے گندے کام میں کیا

اٹھا نہ ڈالا۔ اس کام میں پیسے تو ہیں مگر چین نصیب نہیں۔ زندگی اور عزت ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔

منے استاد پچاس سال پہلے کے قصے سنایا کرتے تھے۔ جب بانس منڈی بڑے بڑے استادوں کا اڈا تھا۔ شہر کے لوگ ان کو بدمعاش کہتے تھے۔ اور ان سے ڈرتے تھے۔ بڑے بڑے نامی لوگ تھے۔ جما خاں، کالو، ٹینگر، دھنی رام، روہن اور دلاور خاں۔ ان سب کے بہت سے چیلے اور پٹھے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا رہتا تھا۔ اور ہر روز پولیس دوڑتی رہتی تھی۔ یہ لوگ سرکار کے قانون کو توڑتے تھے۔ لیکن اپنے بنائے ہوئے قانون کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ اور کسی دوسرے کام میں دخل نہیں دیتے تھے۔ کسی کا افیون کا کاروبار تھا تو کسی کا گانجے کا، کسی کا چرس کا تو کسی کا بھنگ کا۔ اور سب کی ٹولی میں مضبوط گٹھیلے جوان تھے۔ منگلو حجام آکر بانس منڈی میں رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جیب کترا ہے۔ اور اس کے بہت سے چیلے ہیں تو سب نے مل کر کہا کہ یہ محلہ چھوڑ دے جیب کترے میں کوئی بہادری نہیں۔ اور منگلو چپ چاپ دوسرے محلے میں چلا گیا۔ نہ جاتا تو کوئی اسے مار کر ٹھنڈا کر دیتا۔ دلاور خاں ایسی چھوٹی باتیں پسند نہیں کرتے تھے۔

منے استاد جب بانس منڈی کے قصے سناتے تھے تو بڑے درد کے ساتھ لمبی لمبی سانسیں لیتے۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ زیادہ کھپریل کے مکان تھے۔ عام طور پر غریب لوگ رہتے تھے۔ دو چار ہی پکے مکان تھے اور پیسے والے لوگ تھے۔ لیکن محلے میں کوئی بھوکا نہیں سوتا تھا۔ جتنے پیسے والے تھے وہ غریبوں کی فکر کرتے تھے۔ کہنے کو تو بدمعاش لوگ تھے مگر بڑی آن بان والے اور غریبوں سے ہمدردی رکھنے والے تھے۔ غریبوں بیوہ اور یتیموں کی مدد کرتے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تعریف وہ اپنے استاد دلاور خاں کی کرتے تھے۔ دلاور خاں کی بات کسی میں نہیں تھی۔ وہ اپنے اصولوں کے پکے تھے۔ رحیما ان کا بڑا چہیتا بیٹا تھا اس کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ وہ کہیں سے ایک لڑکی کو بھگا لایا۔ اور دلاور خاں کو خبر مل گئی۔ انھوں نے اسی وقت رحیما کو بلایا۔ اور مسجد سے مولوی صاحب کو بلا کر اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب اگر ایسی شکایت سنی تو دو ٹکڑے کر دوں گا۔ رحیما نے سب کے سامنے توبہ کرائی۔ اور وعدہ لیا کہ آئندہ کسی دوسری عورت پر بری نظر نہیں ڈالے گا۔ مگر رحیما بگڑ چکا تھا۔ اس نے ایک بار کہیں پانچ سیر افیون خریدی اور اوپر اوپر بیچ دی۔ ٹینگر استاد نے شکایت کی۔ یہ اس کے کاروبار میں دخل دینا تھا۔ دلاور خاں نے رحیما کو بلایا اور نفع کے سارے روپے ٹینگر کو دلوا دیے۔ صرف اس کا روپیہ اسے دے دیا۔ اور یہ کہہ کر اسے نکال دیا کہ تو اعتبار کے لائق نہیں رہا۔ اس شہر سے کہیں اور چلا جا۔ اور وہ چلا بھی گیا۔

منے استاد مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ان پٹھوں کے الگ الگ کام تھے۔ اور ہر کام کرنے والے کو اس کے کام کی بہت دنوں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک کام کرنے والا دوسرا کام نہیں کرتا تھا۔ کچھ لوگ تھے، جن کا کام تھا کہ پتہ چلائیں مال کہاں سے مل سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کام شہر شہر گھوم کر گاہک ڈھونڈنا تھا۔ بہت تجربہ کار لوگ مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ کچھ جاسوس ہوتے تھے۔ جن کا کام تھا یہ پتہ چلانا کہ پولیس سے خطرہ ہے یا نہیں۔ اس کام کے لئے صرف ان لوگوں کو رکھا جاتا تھا جو کچھ پڑھے لکھے اور سمجھ دار بھی ہوتے تھے۔ ان کا کام پولیس افسروں سے دوستی کرنا اور ان سے قریب رہنا ہوتا تھا۔ اور یہ لوگ دوسرے لوگوں سے کم ملتے تھے۔ زیادہ تر پھلوں کی دکان میں گاہک بن کر آتے تھے اور پھل خریدتے وقت اشاروں میں دلاور خاں سے باتیں کر لیتے تھے۔

ایک دن چائے خانے میں بات نکل آئی۔ دھوبی گھاٹ کا نامی بدمعاش ناجا رنڈی کے گھر میں پکڑا گیا۔ منے استاد نے کہا کہ بازاری عورتوں کے پاس جانے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ استاد کہا کرتے تھے اور اپنے لوگوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹا اگر سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر زندہ رہنا ہے تو استادوں کے بنائے ہوئے قانون کو سختی کے ساتھ مانو۔ پیسے کے لیے بازار میں بیٹھنے والی عورت کے چکر میں کبھی نہ پڑو۔ رنڈی کا کیا اعتبار۔ اس کو پیسہ چاہیے تم پیسہ دو تو تمھاری۔ اور پولیس والے پیسہ دیں تو ان کی۔ رنڈی سے ہمیشہ دور رہو۔ اور عورت کے لیے کمزوری پیدا نہ ہونے دو۔ ورنہ مارے

جاؤ گے۔

منّے استاد بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے۔ استاد نے تعلیم پوری دی۔ ہر چیز سکھائی لیکن کبھی کوئی کام نہ کرنے دیا۔ کسی نے پوچھا کہ کیا تعلیم دیتے تھے تو منّے استاد نے بتایا۔ تعلیم بڑی سخت ہوتی تھی۔ ہر کام کی تعلیم الگ الگ تھی۔ جو لوگ پولس کی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے ہوتے تھے اور ان کا انگریزی جاننا ضروری ہوتا تھا۔ ان کو سکھایا جاتا تھا کہ کس طرح ملیں اور لوگوں سے دوستی کریں، اور ان کی باتوں سے اپنے مطلب کی بات نکال لیں۔ پھر اُن کو کچھ اشارے اور اصطلاحیں سکھائی جاتی تھیں۔ اور وہ پھل کی دکان پر اشاروں اشاروں میں استاد سے باتیں کر لیتے تھے۔ اور استاد پھلوں کے ساتھ ان کی تنخواہ بھی دے دیا کرتے تھے۔ گاہک ڈھونڈنے والوں کی تعلیم الگ تھی لیکن سب سے سخت تعلیم ان لوگوں کو دی جاتی تھی، جو مال لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ اُن کی تعلیم میں سال دو سال لگ جاتے تھے۔ ان کو ڈنڑ بیٹھک کرنے اور دوڑنے کی مشق کر کے دم بچانا ہوتا تھا۔ نہ جانے کب کتنی دور بھاگنا پڑے۔ دلاور خاں کے ساتھ ٹھہرنا سب کے بس کا روگ نہ تھا۔ بہت سے بیچ ہی میں بھاگ جاتے تھے۔ اینٹ پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر ہر طرف سے سخت بنانا پڑتا تھا۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر ذرا زور سے اور اس کے بعد پوری طاقت کے ساتھ ہتھیلی، مُکّا اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کے کناروں میں گھٹے بنانے پڑتے تھے۔ اتنے سخت کہ مُکّا مار کر اینٹ توڑ دیں۔ اور ہتھیلی کے کنارے سے لکڑی۔ پھر اپنے لوگوں سے ربط قائم رکھنا۔ جب پٹھا پوری طرح تیار ہو جاتا تھا تو پہلے پرانے پٹھوں کے ساتھ اُسے بھیجا جاتا تھا۔ مال لے جانے کا کام سب سے سخت تھا۔ پولس سے مڈبھیڑ کا خطرہ ہر وقت رہتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ ہر طرح تیار رہتے تھے۔ پستول سے گولی چلانے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ لیکن تاکید تھی کہ آخری اور مجبوری کی حالت میں پستول کا استعمال کرنا۔ کسی پر گولی اسی وقت چلانا جب کوئی چارہ نہ رہ جائے۔ ہم لوگوں کا کام جان مارنا نہیں۔ اپنا کام کرنا ہے۔ اور کہتے تھے کہ گرفتار کسی حال میں نہ ہونا۔ جب کوئی راہ نہ رہے تو خود کو گولی مار لو۔ اور عزت سے مر جاؤ۔ پولس کے ہاتھ پڑ کر ذلت اور تکلیف مت اُٹھاؤ۔ اپنے بارے میں دلاور خاں کہتے تھے۔ میرے ریوالور میں سات گولیاں رہتی ہیں۔ چھ دوسروں کے لئے اور ساتویں اپنے لیے۔ وہ کہتے تھے کہ پولس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ذلت نہیں اُٹھاؤں گا۔ جس راستے پر سر اٹھا کر چلتا رہا ہوں، اس پر کمر میں رسی اور ہاتھ میں ہتھکڑی ڈلوا کر سر جھکا کر نہیں چلوں گا اور یہی انھوں نے کر دکھایا۔

ایک دن پوچھنے پر استاد خاں نے اپنے استاد دلاور خاں کے مرنے کی کہانی سنائی۔ بڑی لمبی اور گہری سانس لے کر اُنھوں نے بتایا کہ لگ بھگ پچاس سال پہلے مسٹر ہارڈمین سپرنٹنڈنٹ پولس ہو کر شہر میں آیا۔ تو اس کے سر میں سما گئی کہ بانس منڈی کو برباد کر دے۔ نہ جانے کن لوگوں نے اس فرنگی بچے کے کان بھر دیے۔ بڑی خوفناک شکل تھی اس کی۔ لمبا چوڑا آدمی، سرخ سر کے بال اور سرخ گھنیری مونچھیں۔ کرنجی آنکھیں اور پھولے پھولے گال۔ بڑا دلیر اور مضبوط ارادے کا آدمی تھا وہ بھی۔ ایک دن وہ کچھ پولس افسروں کو لے کر بانس منڈی میں آگیا اور بیچ سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ہم نے سنا ہے کہ اس محلہ میں بڑا بڑا بدمعاش رہتا ہے۔ ہم دیکھے گا کون کتنا بڑا بدمعاش ہے ہم شریف آدمی کے ساتھ بہت شریف ہے۔ اور بدمعاش کے ساتھ بدمعاش۔ ہم سب کو تین مہینے کا ٹائم دیتا ہے۔ یہاں جو دھندا ہوتا ہے اسے ختم کیا جائے۔ اس کے بعد ہم کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ جس کو پکڑے گا اس کو کڑی سزا دے گا۔ مگر اس کو ختم کریگا۔" وہ چلا گیا تو لوگ ہنسے۔ ایسی دھمکیاں وہ پہلے بھی سن چکے تھے لیکن دھمکی دینے والے افسر بھی رام ہو گئے تھے۔ تین مہینے تک تو ہارڈمین سچ مچ کچھ نہیں بولا۔ استاد نے مجھے تو چائے خانہ کھلوا دیا اور الگ کر دیا۔ اور بولے یہ آدمی سچ مچ خطرناک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیری زندگی برباد ہو۔ ابھی تو کچا ہے اور تیرا باپ مرتے وقت تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر گیا ہے۔ تجھے سکھا دیا ہے مگر اپنے کام میں نہیں لگاؤں گا۔ اور خود ہارڈمین سے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگے۔ کہتے تھے کہ اس فرنگی نے پٹھان کو للکارا ہے تو اس کو جواب ملے گا۔ میں اس کی دھمکی میں آنے والا نہیں ہوں۔ اور ہارڈمین نے سچ مچ تین مہینے تک کسی کو کچھ

نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد اس نے سختی برتی۔ موقع پاکر کسی کے گھر پر چھاپہ مارتا اور جو ملتا اس کو گرفتار کرلیتا۔ تھانے میں لے جاکر سخت سزائیں دیتا۔ اس نے ملن کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ دوسروں کے انگ بے کار ہو گئے۔ بہت سے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بعض لوگوں نے دلاور خاں کو بھی رائے دی کہ کسی دوسرے شہر میں جا بسیں۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ ہارڈین خان کے گھر پر کئی بار چھاپہ مارا لیکن استاد کو پکڑ نہیں سکا۔ مگر ایک رات اس نے چھاپہ مارا۔ استاد اس وقت گہری نیند میں تھے۔ شور ہوا تو اُٹھ بیٹھے اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ انھوں نے ہارڈین پر گولی چلا دی۔ وہ زخمی ہو گیا۔ پھر دنادن گولیاں چلنے لگیں۔ استاد نے دو چار کو زخمی کیا۔ مگر ایک گولی ان کی چھاتی میں لگی اور وہ ڈھیر ہو گئے۔ زندہ گرفتار نہیں ہوئے۔ مر گئے لیکن اپنی بات پوری کر گئے۔ قصہ کہتے کہتے استاد رو پڑے۔ وہ بھی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ مگر پولس کے رجسٹر میں ان کا کہیں نام نہ تھا اور چائے خانہ تھا اس لئے چھوٹ گئے —— اور بانس منڈی اُجڑ گئی۔

کبھی کبھی لوگ پوچھ بیٹھتے۔ آپ نے سب کچھ سیکھا مگر الگ رہے تو بولے۔ استاد کا حکم۔ انھیں بھی اس کی حسرت رہ گئی کہ سب کچھ سیکھا مگر کیا کچھ نہیں۔ محنت ہی سب ونت برباد ہوا۔ ان کو یہ جاننے کا موقع ہی نہیں ملا کہ واقعی انھیں کچھ آتا بھی ہے یا نہیں۔ پھر تو انکی زندگی ہی بدل گئی تھی۔

محلے میں منے استاد کا رعب تھا۔ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے لوگ ان کا لحاظ بھی کرتے تھے۔ اور کبھی منہ دیکھی بات نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی غلطی کرتا تو اس کو ٹوک دینا اور سمجھا دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور کہہ دیتے تھے کہ اگر بات نہیں مانوگے تو خود دیکھو گے۔ لوگ ان کی بات مان بھی لیتے تھے۔ بانس منڈی اچھے لوگوں کا محلہ بن گیا تھا۔ ہر طرح کے لوگ تھے اور اپنا اپنا کام کرتے تھے۔ محلے کی پرانی بدنامی ختم ہو چکی تھی اور بھلے لوگوں کا محلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر استاد کہا کرتے کہ اب وہ آپس کی ہمدردی اور اپنا پاس نہیں رہ گیا۔ ہر آدمی اپنی اپنی فکر میں ڈوبا رہتا ہے کسی کو دوسرے کی فکر نہیں۔

محلے کے نوجوانوں پر استاد منے خاں کی خاص طور پر نظر رہتی تھی۔ کون لڑکا کیا کر رہا ہے۔ چال چلن کیسا ہے۔ صحت کیسی ہے۔ کام کا آدمی بن رہا ہے یا بگڑ رہا ہے۔ اور اگر کسی میں کوئی خرابی دیکھتے تو اس کو سمجھانے سے نہیں جھجکتے۔ ان کا دل صاف تھا۔ اس لئے پروا نہیں کرتے تھے کہ کوئی بُرا مانے گا۔ وہ بھلائی ہی چاہتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر ان کے چائے خانے میں بھی کوئی زیادہ وقت برباد کرتا تو اسے ٹوک دیتے تھے۔ اور محلے کے نوجوان بھی ان کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ان کو اپنا بزرگ مانتے تھے۔

نوری قصاب کا بیٹا قمر جوان ہوا تو اچھے بدن کا جوان نکلا۔ اور ورزش بھی کرتا تھا، نورو کی دکان چائے خانے سے نزدیک ہی تھی۔ قمر کبھی چائے خانے میں آجاتا۔ تو استاد اسے اپنے پاس بٹھاتے۔ اس کی تعریف کرتے، اس کا حوصلہ بڑھاتے۔ محنت کرو اور اچھی صحبت میں رہو۔ ورزش کرتے ہو تو کسی استاد کی خدمت کرو۔ بے استاد ادھورا رہ جاتا ہے۔ نام پیدا کرو۔ قمر بھی اُن کی باتیں غور سے سُنتا اور ان کی ہر بات میں ہاں ہاں کرتا جاتا۔ لیکن نورو کو بیٹے کی پہلوانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹا کاروبار سنبھالے اور وہ آرام کرے۔ اس لیے قمر کو صبح کے وقت دکان پر جانا پڑتا تھا۔

لیکن نورو بیمار ہوا اور مر گیا۔ استاد نے قمر کو دلاسا دیا اور حوصلہ بڑھایا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب کے باپ ایک دن مرتے ہیں۔ سب کو ایک دن مرنا ہے۔ اب تم پر زیادہ ذمہ داری آگئی۔ قدم پھونک پھونک رکھو۔ قدم قدم پہ کھائی ہے۔ ذراسی غلطی آدمی کو برباد کر دیتی ہے۔ اور وہ بھی ہاں ہاں کرتا گیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد قمر بہک گیا۔ باپ کے کمائے پیسے ہاتھ لگے، کچھ محلے کے اور کچھ دوسرے محلے کے بے فکرے ساتھ لگ گئے۔ اور ڈھیر سے پیسوں اور طاقت کا غرور ہو گیا۔ اور بری صحبت میں پڑ کر برائیوں میں ڈوب گیا۔ محلے میں شکایتیں ہونے لگیں۔ منے استاد کو بڑا دکھ ہوا۔ ایک ہونہار نوجوان بگڑ رہا ہے۔ ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ چائے خانے میں آگیا تو کنارے لے جاکر اُسے دیر تک سمجھاتے رہے۔ اور وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلے استاد نے سنا تھا کہ قمر دو ہڈیوں کے

محلے میں گھومتا ہے۔ اور رات رات بھر غائب رہتا ہے۔ پھر خبر ملی کہ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور رنڈیوں کو اپنے گھر پر بلا لیتا ہے۔ اور اس کے دوست احباب ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔ منے استاد کو بہت افسوس ہوا۔ مگر انھوں نے سمجھ لیا کہ اب اسے سمجھانا بیکار ہے۔ جب تک اس کے پاس پیسے ہیں، آوارہ لونڈے اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور جب یہ برباد ہو جائے گا تو سب اپنی اپنی راہ لیں گے۔ وہ ایسے تماشے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔

لیکن قمرو اور اس کے دوستوں نے زیادہ ہاتھ پاؤں نکالے۔ قمرو کا گھر آوارہ لونڈوں کا اڈا بن گیا اور شکایت ہونے لگی۔ ایک دن منے استاد سے عبدل بیڑی والے نے شکایت کی کہ قمرو کے ساتھی اس کی بیٹی کو روپے دکھا رہے تھے۔ وہ گھر میں گھس گئی تو ایک نے کہا کب تک چھپے گی۔ ایک دن زبردستی اٹھا لے جائیں گے۔ وہ قمرو سے شکایت کرنے گیا۔ تو الٹا اس نے گالیاں دیں اور دھمکایا۔ یہ سنتے ہی منے استاد کو غصہ آ گیا۔ اور وہ بولے "جا کر کہہ دے۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ گنڈا گردی نہیں چلے گی۔ اس محلے میں رہنا ہے۔ یا نہیں" چائے خانے میں بہت سے لوگ تھے۔ کسی نے استاد کی بات قمرو سے کہہ دی۔ اُسے بھی غصہ آ گیا۔ اپنے دوستوں کو لے کر چائے خانے میں پہنچا۔ اور منے استاد کو للکار کر بولا "بڈھے میں لحاظ کرتا ہوں۔ مگر تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے ——— لوگوں نے استاد کہہ کر دماغ خراب کر دیا ہے۔ کیا کرے گا میرا۔ میرا جو جی چاہے گا کروں گا۔ دیکھوں کوئی میرا کیا بگاڑے گا۔"

منے استاد ہکا بکا رہ گئے۔ بہت سے لوگ چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ کچھ بول بھی نہیں سکے۔ قمرو اپنے دوستوں کے ساتھ چائے خانے سے نکلتے ہوئے بولا۔ "کہہ دیا میں نے میری باتوں میں کچھ مت بولا کرو اگر بولوگے تو تمہارے لئے اچھا نہیں ہوگا ——"

منے استاد کے ہونٹ کانپنے لگے۔ مگر انھوں نے غصہ ضبط کیا اور بولے۔

"ارے لڑکے تیرے لیے کہتا ہوں۔ یہ اچھی بات نہیں۔ اگر محلے میں پھر ایسی شکایت سننے میں آئی تو تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔!"

قمرو تن کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"تم میرا کیا بگاڑ لوگے یا محلے کا کوئی آدمی کیا بگاڑے گا۔"

منے استاد کو غصہ آ گیا اور وہ کڑک کر بولے۔

"نکلتا ہے یہاں سے یا اٹھوں۔ ایک تھپڑ میں سیدھا ہو جائے گا۔"

منے استاد اٹھے تو کچھ لوگوں نے انھیں بٹھا دیا اور سمجھایا۔ اور کچھ لوگ قمرو کو پکڑ کر چائے خانے سے باہر لے گئے۔ قمرو نے جاتے جاتے منے استاد کو دھمکا کر کہا۔

"جتا دیتا ہوں بڈھے۔ میرے معاملے میں پڑے گا تو اچھا نہیں ہوگا۔ ساری استادی نکال کر رکھ دوں گا۔ بڑا رعب جما رکھا ہے استادی کا ——"

منے استاد غصے میں انگوٹھا کھڑے ہوئے اور چیخ کر بولے

"ٹھہر حرام زادے۔"

لیکن قمرو کو پکڑ کر لوگ لے گئے۔ قمرو جاتے جاتے بولا۔

"اچھا بڈھے سمجھ لوں گا ——"

اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن دوسرے دن سویرے سویرے جب منے استاد گھر سے چائے خانے آ رہے تھے۔ تو قمرو اپنی دکان میں بیٹھا تھا۔ دکان میں کچھ گاہک تھے اور کچھ اس کے لفنگے دوست۔ قمرو نے جیسے ہی منے استاد کو دیکھا۔ للکار کر بولا۔

"کل گالی دی تھی۔ ٹھہر جا بڈھے ——"

منے استاد رک گئے۔ قمرو گوشت کوٹنے کا چھرا لے کر ان کے سامنے آ گیا اور بولا۔

"اب بتاؤں بڈھے۔ کل گالی دی تھی۔"

منے استاد نے قمرو کو دیکھا۔ اور سیدھے سادے ڈھنگ سے کہا۔

"جا جا۔ اپنا کام کر۔"

قمرو اینٹھ گیا۔ اور بولا۔

"میں گالی کا بدلہ لوں گا۔ کل کیا سمجھ کر گالی دی تھی!"

منے استاد نے کہا۔

"جا ——— شامت تو نہیں آئی ہے تیری ——"

منے استاد کا کہنا تھا کہ قمرو نے چھرے سے بھرپور وار کر دیا ——

مٹے استاد نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر وار خالی جانے دیا۔ اور بولے۔

"ابے جاتا ہے کہ بیچ بچ تیری شامت آئی ہے۔"

قمر نے دوسرا وار کر دیا۔ مٹے استاد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے لیکن جب تک کوئی کچھ بولے۔ قمر نے تیسرا وار کر دیا۔ مٹے استاد کے دونوں بیٹے بھی آ گئے تھے لیکن وہ ابھی دور ہی تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ مٹے استاد نے وار خالی دے کر قمر کو ایک تھپڑ مارا۔ تو وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ اور چار دانت منہ سے نکل کر زمین پر گر پڑے۔ لوگ دنگ رہ گئے۔ اس عمر میں استاد میں اتنی پھرتی اور اتنی طاقت باقی تھی۔

مٹے استاد نے قمر کو سمجھا کر کہا۔

"اب جا۔ اگر پھر کبھی کوئی بدمعاشی کی تو ایک تھپڑ میں جان نکال دوں گا۔"

اور اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر چپ چاپ چائے خانے میں چلے گئے۔

■■

شہریار
۷۔بی۔ شبلی روڈ۔ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ

شکستِ طلسم

یہاں کچھ پھول تھے
کچھ تتلیاں تھیں
رنگ اور خوشبو کی بارش تھی
نہیں کچھ بھی نہیں تھا

وہم تھا میرا
خلا کو تکتے تکتے
تھک گئی تھیں
میری یہ آنکھیں

غزل

دیارِ خواب سے کب خالی ہاتھ آئے تھے
کٹورے آنکھوں کے شبنم سے بھر کے لائے تھے

کسی بگولے پہ لیکن فریب چل نہ سکا
ہوا نے جال تو چاروں طرف بچھائے تھے

طلسم خانۂ امید سے رہائی پر
میں رو پڑا تھا مگر لوگ مسکرائے تھے

عجب سفر تھا کہ جیسے اُجاڑ رستوں پر
سنہری دھوپ کہیں تھی نہ سبز سائے تھے

تمام رات اندھیروں میں اب بھٹکتے رہو
چراغ تیز ہواؤں میں کیوں جلائے تھے

بشر نواز
محلہ گھاٹی - اورنگ آباد

وقت کی مملکت میں

میں وقت کی مملکت کا باسی
نفس کی موہوم ڈور تھامے، فنا کے آتش فشاں دہانے پہ رقص کرتا ہوں
خود آپ اپنے کو جمع کرنے میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں
میں جیسے میداں ہوں، اس لڑائی کا، پہلے دن سے
جو مجھ میں اور مجھ میں چل رہی ہے
وہ لمحہ جسکو میں خود سے منسوب جانتا ہوں
پتہ نہیں کیوں، نہ جانے کیسے
پرائے دلمیں دھڑکنے لگتا ہے دور افق میں ستارہ جیسے
پرایا ہوتا ہوں جس گھڑی میں
اُسی گھڑی آپ اپنے اندر مچلنے لگتا ہوں، جیسے نبضوں میں خوں کی گردش
جو اپنے تنہا وجود کا کوئی جزو کاٹوں
تو ایسے لگتا ہے وقت کی لمحہ لمحہ بُنتی طویل چادر کے تانے بانے بھی کٹ رہے ہیں
کمان کھینچی کسی نے ایسے کہ اسکے دونوں سروں کی پہچان کھو گئی ہے
کھلی دشا میں بکھرتے منظر
پہاڑ صحرا ندی سمندر
ستارے پتھر درخت آنگن
عزیز اغیار دوست دشمن

وجود میں میرے دھیرے دھیرے اتر کے تبدیل ہو رہے ہیں
حواس سارے حدود و تعین کا ہر احساس کھو رہے ہیں
میں سیلِ گراں دھنتوں میں بے سمت بے تحاشا ہوا ہوں شاید
افق سے تابہ افق بھٹکتی صدا ہوں شاید

▬

طلحہ رضوی برق
اپچ۔ ڈی کالج، مگدھ یونیورسٹی۔ آرہ

غزل

جمع کچھ صبر آزمایا دوں کا شیرازہ کرو
پھر جگاؤ دردِ دل، زخمِ جگر تازہ کرو

تم تو اہلِ عشق ہو خود بے نیازِ دینِ دل
درگزر بینش کے خرد والوں کا آوازہ کرو

وقت ہو آئینۂ حسنِ قبول اس کے لئے
ہر عمل کے رُخ پہ یوں اخلاص کا غازہ کرو

سطحِ دریا تک کہاں آتی ہے موجِ تہہ نشیں
خندہ روئی سے نہ حالِ دل کا اندازہ کرو

برقؔ جب ٹھہرے ہو جرمِ آگہی کے مرتکب
زندگی کو آشنائے تابِ خمیازہ کرو

▬

قمر احسن
سی ۲۶۔ قدوائی نگر ایسٹ۔ نئی دہلی ۲۳

بریدہ جسموں کو چمکانے والا بوڑھا

چٹانوں پر سُنہری دُھوپ پھیل چکی تھی۔ پہاڑی گھاس کے تختوں میں چھوٹے چھوٹے کیڑے پُھدک رہے تھے ـــــ پاس کے اُونچے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر ایک کوا مسلسل چیخ رہا تھا۔

دُور سے ـــــ ناہموار راستوں پر اُچکتا، پھلانگتا ایک بوڑھا، راستہ میں کچھ تلاش کرتا چلا آرہا تھا ـــــ

بُوڑھا کچھ دُور تک چلتا۔ پھر جُھک کر کچھ دیکھتا۔ کراہتا ہوا گھٹنوں پر دونوں ہاتھ ٹیک کر پھر اُٹھتا ـــــ اور سامنے دیکھتا ہوا گردن ہلا کر پھر چلنے لگتا۔

ـــــ اب وہ صرف نظریں جھکا کر نیچے دیکھتا اور مطمئن سی گردن کی جنبش کے ساتھ آگے بڑھ آتا۔ ایک نظر سامنے دیکھتا۔ اور پھر اپنے قدموں کے سامنے کچھ دیکھنے لگتا۔

اس کی کمر پر پشت سے ہو کر ایک موٹے سے چمڑے کے تسمہ میں ایک تھیلا بندھا ہوا تھا ـــــ داہنی طرف ایک کثیف سا تھیلا لٹک رہا تھا ـــــ سر پر دہقانوں جیسی ایک پگڑی اڑسی ہوئی تھی ـــــ جسم کے اوپری حصّہ پر ایک میلی سی صدری تھی ـــــ نچلے حصّہ میں ایک بڑے گھیر کی شلوار ـــــ جس کے گھٹنوں میں دو پیوند لگے ہوئے تھے جو جیب کا بھی کام دے رہے تھے۔ اس کے اندر کچھ کھڑ بڑاہٹ ہو رہی تھی۔

اس کے داہنے ہاتھ میں ایک بہت زیادہ سیاہ چمکتی ہوئی ٹیڑھی سی لکڑی تھی ـــــ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں پھنسی ہوئی تھیں، جن پر عجیب ڈراؤنی سی شکلیں بنی تھیں ـــــ دونوں ہاتھوں کی کلائیوں پر فیروزی رنگ کی تسبیح نما بہت سی مالائیں پڑی تھیں ـــــ ایسی ہی ایک سیاہ دانوں کی مالا اس کی گردن میں بھی تھی، جس میں ایک جگہ ایک پرانی 'نعلی'۔ ایک جگہ ایک سیاہ سا 'پَر' لگا ہوا تھا، اور درمیان میں دو تصویریں لٹک رہی تھیں ـــــ ایک جانور کچھ 'سور' سے مشابہ تھا۔ دوسرا بلی یا بڑا سا نیولا معلوم ہو رہا تھا۔

بوڑھا اسی طرح ایک نظر زمین پر ڈالتا۔ اور پھر مطمئن انداز میں سامنے دیکھتا ہوا چلا آرہا تھا۔

گھاس کے تختوں میں چھپے ہوئے کیڑے اس کی آہٹ پر پُھدک کر دُور چلے جاتے تھے ـــــ بوڑھے کے سر اور چہرہ پر بہت سے مچھر اور پتنگے چکرا رہے تھے۔

کوا اسے دیکھتے ہی اور زور زور سے چیخنے لگا ـــــ کبھی بے چین ہو کر درخت کی سب سے اُونچی شاخ پر بیٹھتا اور کبھی اُڑ کر درخت کے آس پاس چکر لگاتا۔ اور شور مچاتا ہوا درمیانی شاخ تک آتا ـــــ پھر ـــــ اچانک ہی گھبرا کر اور زیادہ چیخنے لگتا۔

دُور سے ایک بادامی رنگ کا کتا بھونکتا ہوا ادھر ہی آرہا تھا جیسے ہی وہ اس بوڑھے کے پاس پہونچا۔ یکدم ٹھٹک گیا۔ چند ثانیوں تک بوڑھے کو آنکھ بند کر کر کے دیکھتا رہا ـــــ پھر بکی سی 'بھؤ' کہہ کر اپنے سارے رُوئیں کھڑے کر بیٹھا۔ اور جدھر سے آیا تھا اسی

طرف بھاگ چلا۔

——— اس تمام عرصہ میں بوڑھا زمین کی طرف ایک ایک نظر پھینکتا ہوا بڑھتا آ رہا تھا

——— کوا اسی طرح چیخ رہا تھا۔

بوڑھا اب اس درخت کے نزدیک آ چکا تھا۔ اب اس کی نظریں بے چین سی زمین پر پھسل رہی تھیں۔ پھر بوڑھا سر ہلاتا ہوا درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا اور پشت سے تھیلا اُتار کر بیٹھ گیا — بغل والا تھیلا اب اسی سیاہ لکڑی پر رکھا تھا اور پگڑی اس کے زانو پر تھی۔

بوڑھا خاموشی سے اپنی گھیردار شلوار میں کچھ تلاش کر رہا تھا پھر تھیلے میں سے کچھ ٹکڑے نکال کر چبانے لگا — پھر تسمہ والے تھیلے میں سے ایک بوتل نکال کر اس میں رکھا سیال پینے لگا۔

اوپر والی شاخ پر بیٹھا کوا — اب خاموشی سے بوڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گھاس میں چھپے ہوئے کیڑے اب آہستہ آہستہ بوڑھے کی طرف رینگ رہے تھے۔

اچانک درخت کی درمیانی شاخوں میں حرکت ہونے لگی اور کچھ شور سا اُٹھا۔ اور بوڑھا چونک کر درخت کی اندھیری شاخوں میں گھورنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن سورج کی کرنیں سیدھی آنکھوں میں گھسی آ رہی تھیں، اس لئے اس نے ایک ہاتھ کا چھجہ سا بنا لیا — اور پھر درخت کی شاخوں کو گھورنے لگا۔

"ک۔ کون۔ کون ہو تم —؟" وہ کھڑا ہو گیا۔

درخت کی شاخوں میں جنبش ہوئی تو اوپر والی شاخ سے کوا پھر چیخنے لگا، اور اُڑ کر پھر فضا میں چکرانے لگا۔

بوڑھا — شاخ بہ شاخ نیچے آتے ہوئے سایہ کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ سایہ درخت کی سب سے نچلی شاخ پر آ کر رُک گیا تھا۔ اتنا نیچے کہ بوڑھا ذرا سی کوشش پر اسے ہاتھ سے چھو سکتا تھا —،

"کون ہو تم — ؟ کون —؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"بابا — زور سے پیاس لگی ہے — اور بھوک بھی —!"

بوڑھے نے ایک لمحہ اس آخری شاخ سے لپٹی ہوئی خوبصورت لڑکی کو دیکھا، اور سر ہلاتا ہوا اپنے تھیلوں پر جھک گیا۔ کچھ ٹکڑے اس نے ایک تھیلے سے نکالے اور وہی بوتل دوسرے تھیلے سے نکال کر اس شاخ سے لپٹی ہوئی لڑکی کے ہاتھوں میں دے کر آسودگی سے دیکھنے لگا ———

لڑکی نے جلدی سے دو تین ٹکڑے منہ میں ڈالے اور بغیر چبائے ہوئے انھیں نگلنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب آنکھوں سے پانی بہنے لگا تو اس نے بوتل سے سیال اپنے حلق میں اُنڈیل لیا — اور اپنی اُبکائی روکنے کے لئے درخت سے چمٹ گئی۔

"بابا —! یہ ٹکڑے کتنے خشک، کڑوے اور بدبودار ہیں — اور سیال سے بھی عجیب بدبو آ رہی ہے — جیسے قصائی باڑہ سے آتی ہے۔"

بوڑھا — خالی خالی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کوا — اب خاموشی سے سامنے کی چٹان پر بیٹھا ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

گھاس کے کیڑے رینگتے رینگتے اب بوڑھے کے سامان کے گرد ناچ رہے تھے۔

دُور ایک چٹان کی آڑ میں وہ پہلا والا کُتا، پانچ اور کتوں کے ساتھ بڑے غور سے بوڑھے کو گھور رہا تھا — اور وہ سب رہ رہ کر گھبراہٹ میں اپنے چاروں طرف دیکھنے لگتے تھے ———

بوڑھے نے لڑکی سے پوچھا۔

"بیٹی تم کون ہو —؟ کہاں سے آئی ہو؟ یہاں پہاڑی پر کیوں بیٹھی ہو —؟؟"

لڑکی نے بڑی زور سے اُبکائی لی — اور سُرخ سُرخ گوشت کے تین سالم ٹکڑے سرخ قے کے ساتھ باہر نکل پڑے ——— تھوڑی دیر تک لڑکی اوغ۔ اوغ کرتی رہی۔ پھر دامن سے منہ خشک کر کے۔ دانتوں سے زبان کھُرچ کھُرچ کر تھوکنے لگی۔

بوڑھا صرف سوالیہ انداز میں اسے گھور رہا تھا۔

لڑکی نے کہا — "بابا — کیا پانی نہیں ہے —؟"

بوڑھا خاموش رہا۔

لڑکی خاموش ہوکر سوچنے لگی — پھر بولی

"بابا — میں شہرِ دخانیہ کی شہزادی ہوں۔!"

"شہرِ دخانیہ —؟ لیکن وہ تو بہت دُور ہے۔ وہاں کی شہزادی تم —؟ یہاں —؟؟"

بوڑھے نے حیرت کا اظہار کیا — تو لڑکی رونے لگی۔

"ہاں ہاں —! لیکن تم یہ سب جان کر کیا کروگے —؟ (وہ بڑبڑانے لگی) — کیا انجام ہوگا — کیا اس سے کچھ مختلف — جو میرے اہلِ شہر کا ہوا۔"

بوڑھا اب بھی خاموش تھا۔

لڑکی نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پھر بڑبڑانا شروع کیا۔

.... ہمارے پاس کوئی ایسا عمل ہوتا۔ جس سے ہم مستقبل کے بارے میں جان کر قدم اُٹھا سکتے ...... کیا صرف تاریکی ہی ہم سب کا ازلی مقدر ہے۔ کیا ہم تاریکی ہی کو روشنی فرض کر لیتے ہیں —

لڑکی کی آنکھوں میں روشنی واپس آنے لگی۔ اور اچانک ہی اس کی آنکھیں بوڑھے کو مخاطب کر لیتی ہیں۔

"تو کیا بابا — سارے موجودات کا وجود صرف ہمارے فرض کر لینے سے ہے۔ ورنہ موجود واقعی موجود نہیں ہوتا —؟"

بوڑھا اب بھی خاموش رہا۔

لڑکی نے پھر پوچھا — (آنکھوں کی روشنی آہستہ آہستہ پھر معدوم ہونے لگی)

"تو کیا — جب ہم نہ رہیں گے تو بھی کسی کے فرض کر لینے سے موجود ہو سکتے ہیں اور وہ درختوں سے لپٹی ہوئی پرچھائیاں — جنہیں اب ہم مفقود سمجھ چکے ہیں پھر وجود میں آجائیں گی —؟"

وہ بوڑھا اب حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"پرچھائیاں —؟؟"

"ہاں بابا —!! پرچھائیاں —!!!"

وہ پرچھائیوں کا شہر تھا — سارا دن ساری پرچھائیاں ایک موجودِ مفروضہ کی طرح موجود رہتیں لیکن رات ہوتے ہی ان سب کی آنکھوں، کان اور ناک سے گاڑھا کثیف سیاہ دھواں خارج ہونے لگتا تھا — جس کا سلسلہ کئی گھنٹوں تک رہتا۔ اور وہ سب سکون سے بیٹھے دُھوئیں کا اخراج کرتے رہتے تھے۔ پھر اپنے قریب کے کسی درخت، ستون اور برج سے چپک کر رات بسر کر لیتے — اور صبح ہوتے ہی وہ دھیرے دھیرے پھر اپنے قالب میں واپس آنے لگتے۔ اور رات کے مسکنوں سے اُتر کر کڑوی کڑوی انگڑائی لے کر ایک دوسرے کو صبح بخیر کہتے تھے یا آنکھیں چُراتے تھے جب تک کہ دوپہر نہ گزر جائے۔

اچانک ایک دن — ہم میں سے ہی ایک چیخ پڑا — دوڑو —! تیار ہو جاؤ —! کہ آج یومِ جمعہ ہے۔ دجّال اپنی اکلوتی آنکھ لئے نمودار ہو چکا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے دوسرے ہاتھ میں شہد بھری ہوئی روٹیاں۔ اب ہمارا بین المالکی دورِ ادبار آچکا ہے۔ اس لئے کہ آفتاب — وہ دیکھو سوا نیزے کی طرف مائل ہے — ہاں —" ہوکے رسے گا ظہور" — "نکلے گی پھر برق طور" — "یا غری — ی — سب نوا۔ آ۔ آ۔ آذ — ہو نگا — ہے کرم — کرم نگاہ کرم — کرم نگا —" یقین نہ ہو تو دیکھ لو —! آج ابھی سے گاڑھا، کثیف دھواں سرسوں کے پھولوں پر محیط ہے — ہے کہ نہیں —؟

ہم سب خوف کے بادل میں بھیگتے ہوئے سرسوں کے پودوں کی تلاش میں نکل پڑے — کہ شاید واقعی! — لیکن اسی درمیان رات آگئی۔ اور ہم سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر کر اپنے اپنے کانوں، ناک اور آنکھ سے گاڑھا، کثیف دُھواں خارج کر کے طویل درختوں سے لپٹ گئے۔

لیکن اسی رات۔ تیسرے پہر کی نوبت بجے کافی دیر ہو چکی تھی، کہ اچانک شہر کے ایک حصّے سے کھڑ کھڑ کی آواز اُبھری۔ تو ہم سب اپنے کٹے ہوئے کانوں کو لے کر دوڑ پڑے۔ اسکا

وقت شہر کے ایک حصہ سے گھنگھروؤں کی آواز اُبھری۔ چھن چھن — اور پھر بہت سے ستارے فضا میں کوندے، لپکے اور سمٹ کر غائب ہوگئے۔ کچھ ہی وقفوں بعد بہت سی خواب آمیز سسکیاں اُبھرنے لگیں — ذرا ذرا سے وقفہ سے ساری رات یہ ہنگامہ جاری رہا اور ہم سب ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے یہ کیا ہو رہا ہے — ؟؟

صبح — جب ہم سب پھر متشکل ہونے لگے تو یہ دیکھ کر ہم اپنی بے ساختہ چیخوں کو نہ دبا سکے کہ ہم میں سے بہت سے ساتھی اب ہم میں نہیں ہیں — اور بہت سے ساتھی — بریدہ — حیران و پریشان کبھی ہمارے گرد و پیش نظر دوڑا رہے تھے اور کبھی خود کو دیکھ رہے ہیں جیسے وہ اپنی شناخت کی نشانیاں ہم میں تلاش کر رہے ہوں — ان میں کسی کا ایک کان ہے کسی کے دونوں نہیں — کسی کا ایک ہاتھ غائب ہے کسی کے دونوں — کسی کی ایک ٹانگ ہے — کسی کی کمر سے نکلا حصہ غائب ہے، کسی کا صرف کمر کے نیچے کا حصہ موجود ہے — کسی کا سارا سر غائب ہے کسی کے آدھا سر لگا ہوا ہے ——

ہم نے بعد میں محسوس کیا کہ ہم سورج بلند ہونے تک مسلسل چیختے رہے ہیں۔

اور جب دوپہر ہوئی تو سارے شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اور وہ سب بریدہ جسموں کے مالک اپنی ادھوری یاس سے ہمیں دیکھتے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔

تنگ آکر ہم رات کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں رات کیا تبدیلی لاتی ہے۔ کیا یہ سب یونہی رہیں گے، یا ان کے باقی ماندہ اعضاء بھی حل ہو جائیں گے یعنی دھوئیں کا امتزاج کر کے پرچھائیاں بن کر اپنے قریبی درختوں، ستونوں اور برجوں سے لپٹ کر تب بسری کر سکیں گے۔ ...

رات ہوتے ہی — سب ہمارے اعضاء دھواں اُگلنے لگے تو ہم چیخ چیخ کر پراگندہ ہونے پر مجبور ہو گئے اس لئے کہ وہ سب — بریدہ لوگ — اسی طرح کھڑے حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے بریدہ اعضاء رات کی سیاہی میں دمادم چمک رہے تھے۔ ہم سب خوف زدہ ہو کر دور دراز کے درختوں کی تلاش میں بھاگ چلے۔ اور اسی ہیجان میں رات کے دو پہر گزار دیئے۔ لیکن تیسرے پہر کی نوبت بجتے ہی — اچانک شہر کے مختلف حصوں سے پھر وہی سنسناہٹ کی آواز اُبھرنے لگی۔ اور گھنگھرو بجنے لگے۔ پھر اسی طرح کچھ وقفوں سے روشنی کے جھماکے ہونے لگے، ایسا محسوس ہوا جیسے سارا شہر مل کر بہ آواز بلند سانس لے رہا ہو۔

ہم بچے کھچے — مفرور لوگ — گڑگڑا کر نہ جانے کیا مانگنے لگے۔ اس لئے کہ اس وقت اپنے ہی منھ سے نکلتے ہوئے الفاظ ہمارے لئے بے معنی ہو رہے تھے — سنسناہٹ، گھنگھروؤں کی آواز اور روشنیوں کے جھماکے سارے شہر کا گشت لگا رہے تھے — دبی دبی سسکیاں ہمارے اردگرد اپنا حصار بناتی جا رہی تھیں۔

اچانک ہمارے ایک قریبی درخت کی طرف ایک بہت طویل و عریض شے لپکتی ہوئی نظر آئی۔ سیاہ اور پُراسرار — سنسناہٹ کے ساتھ ہی گھنگھرو بھی بڑھتے چلے آ رہے تھے — درخت کے پاس آکر یکدم وہ شے نیچے کی طرف جھپٹ پڑی۔ بہت سے گھنگھرو ایک ساتھ بجے اور روشنی کے بہت سے جھماکے ہوئے —

ہم سب حیرت اور خوف سے اپنے اپنے اندھیرے مسکنوں سے چمٹ گئے تھے —

اسی وقت ہمیں ایک ساتھ بہت سی سسکیاں سُنائی دیں — اور تب ہم نے دیکھا کہ وہ سیاہ اور پُراسرار شے گھسٹتی ہوئی ایک دھبّہ کی طرح دُور ہوتی جا رہی ہے — پھر وہ غائب ہو گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ہم اپنی اپنی کپکپاہٹ پر قابو پا کر دیکھنے کے قابل ہوئے — تو دُور اندھیرے میں ہمیں ویسے ہی بہت سے بریدہ جسم چمکتے ہوئے نظر آئے۔ جو کبھی اپنے بچے کھچے اعضاء کے ساتھ بے چینی سے حرکت کرنے لگتے۔

ہم سب نے خوف و مایوسی کی تاریکی کی صبح کے لیے منتیں

مانیں ــــ اور صبح ــــ اپنے اپنے جسموں میں واپس لوٹتے وقت سب ہی دعا خواں ہوتے گئے ــــ کہ اب ہمارے شہر میں کبھی کوئی رات نہ آئے۔

سارا دن ہم سب اپنے آپ سے خوف زدہ، تحفظ کے بارے میں سوچتے رہے ــــ یہاں تک کہ پھر شام آگئی ــــ ہم سب نے لاکھوں کوشش کی ــــ کہ آج ہم اپنے موروثی عمل کو روک سکیں۔ یعنی گاڑھا سیاہ اور کثیف دھواں ہمارے مسامات سے نہ خارج ہو۔ اور ہمارے کان، ناک اور ہماری آنکھیں بیا بیوں کی پر کیف سرسراہٹ سے محفوظ رہیں ــــ تاکہ ہم پرچھائیاں بن کر اپنے قریبی درختوں، ستونوں اور برجیوں میں پناہ گزیں ہونے کی ضرورت ہی نہ محسوس کریں ــــ اور اس ہیبت ناک سیاہ دھبہ کو پھر نہ دیکھنا پڑے (رشابر)۔ تب شاید ہم اپنے معدوم امن کو پھر سے حاصل کر کے خوف زدگی کے اس نیلے دریا سے باہر آسکیں۔

لیکن ہم مجبور ہوتے گئے کہ شام ہوتے ہی اخراج کا عمل شروع ہوگیا ــــ سارا شہر چیخ چیخ کر رونے لگا ــــ روک دو ــــ ہمیں مات نہ دو ــــ رات کا عذاب۔ ہم پر سے ساقط کر دو ــــ کہ ہم مجبور و بے بس ہیں ــــ لیکن ہمیں تسلّی کون دیتا کہ سب اخراج کے عمل میں مصروف تھے۔

اور رات میں ــــ ہم سب کی قوت سامعہ نوبت کی تیسری آواز کو ہی گھیرے رہی۔

تیسری نوبت کے ساتھ ہی ــــ شہر کے ایک حصّہ سے سنسناہٹ سنائی دینے لگی ــــ تو ہم خاموش و بے بس ایک ٹک فضا میں گھورنے لگے ــــ

اچانک دُور سے ایک پرچھائیں بھاگتی ہوئی نظر آئی ــــ وہ اپنے راستے کے تمام درختوں، ستونوں اور برجیوں کے نیچے ٹھہر ٹھہر کر کچھ چیخ رہی تھی ــــ اس کی پھنسی پھنسی آواز اس قدر مدھم تھی کہ ہم صرف اس کے ہلتے ہوئے ہاتھ ہی دیکھ سکتے تھے ــــ اسی طرح وہ اس اونچے درخت کے نیچے آئی جو ہم اہل قلعہ کے لئے مخصوص تھا ــــ وہ نیچے سے ہی ــــ ہاتھ اور گردن ہلا کر چیخنے لگی ــــ جب ہم نے چیخ کر کہا کہ ہم کچھ نہیں سمجھ سکے ہیں ــــ تو وہ ہیجان سے رونے لگی ــــ اسی وقت ہماری نظریں سامنے اٹھ گئیں۔ ساری پرچھائیاں پراگندہ ہو کر اپنے اپنے مسکنوں سے باہر آگئی تھیں اور مختلف سمتوں میں بھاگ رہی تھیں ــــ وہ نیچے کھڑی ہوئی پرچھائیں ــــ اچانک ہی اضطراب میں ان کی طرف دوڑی اور ہاتھ ہلا کر سب کو پُرسکون رہنے اور ٹھہر جانے کی درخواست کرنے لگی ــــ کہ اس پراگندگی میں ــــ اور بھی شکار کئے جاسکیں گے ــــ لیکن پرچھائیاں نظروں سے غائب ہوتی گئیں ــــ تب وہ پھر ہماری طرف پلٹی ــــ اور چیخنے لگی ــــ

یقین کرو ــــ میں نے خود دیکھا ہے ــــ ہماری مکمل تباہی آچکی ہے۔ اس سے فرار ناممکن ہے ــــ وہ ایک بوڑھا ہے ــــ بوڑھا ــــ!

کون ایک بوڑھا ہے ــــ؟

ہم سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

وہ ــــ وہی گھنگھروؤں والا۔ روشنی کے جھماکوں والا ــــ جسموں کو بریدہ کر کے چمکانے والا ــــ وہ بوڑھا ہے ــــ اس کے سر پر پگڑی ہے ــــ جب وہ چلتا ہے تو شور ہوتا ہے ــــ اس کے پاس دو تھیلے ہیں ــــ تیسری نوبت پر وہ ظاہر ہوتا ہے، اور فصیل شہر کے پاس کھڑے ہو کر پشت سے ایک لمبا سا جال نکالتا ہے۔ ــــ اس جال میں بہت سے چاندی سونے کے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں ــــ اس جال کی گھنڈیوں میں ہیرے اور لعل شب چراغ ٹکے ہوتے ہیں ــــ پھر وہ اپنا جال فضا میں لہراتا ہے ــــ تب پہلے سنسناہٹ ہوتی ہے ــــ اسی کے ساتھ گھنگھرو بجنے لگتے ہیں ــــ پھر آگ کی چنگاریوں کی طرح وہ ہیرے اور لعل چمکنے لگتے ہیں ــــ ــــ تب وہ ــــ جال کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے ــــ وہ سنسناتا ہوا معینہ نشانہ کی طرف لپکتا ہے ــــ اور ساری پرچھائیاں اس جال میں قید ہو جاتی ہیں ــــ تو وہ ڈوری کو آہستہ آہستہ اپنے پاس کھینچ لیتا ہے ــــ تب ــــ تب وہ اپنے گھٹنے سے ایک چمکتی

وہ ڈبیہ نکالتا ہے اور جال سے پرچھائیاں نکال نکال کر ڈبیہ میں بند کرتا جاتا ہے ــــ میں نے خود دیکھا ہے کہ پرچھائیاں بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پھر جب اس کے پاس ڈبیاں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ دوسرے تھیلے سے ایک کوڑا نکالتا ہے اور جال میں مقید پرچھائیوں کو بے تحاشا مارنے لگتا ہے۔ اور وہ پرچھائیاں بے بسی سے تڑپتی ہوئی چیں۔ چیں کرتی ــــ اپنے مختلف اعضا کھوتی رہتی ہیں ــــ جہاں جہاں سے وہ کوڑا ان کے اعضا کاٹ دیتا ہے۔ وہاں وہاں چمک پیدا ہو جاتی ہے ـــــــ اور وہ ــــ انھیں ناکارہ کر کے رات میں بھٹکنے۔ چکنے اور کسی آئندہ فیصلہ کا انتظار کرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے ــــ اور خود نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔

میں نے خود سنا ہے ــ وہ کہہ رہا تھا ــــ کہ کل وہ آخری بار شہر دخانیہ آئے گا اور ساری پرچھائیوں کو گرفتار کر کے لے جائیگا۔

پرچھائیں ــ آنا لیسے ہر ساری پرچھائیاں اپنے اپنے مسکنوں سے کود کود کر مختلف سمتوں میں بھاگ چلیں ــــ ۔ تھوڑی دیر بعد صرف ہیں اس سب سے اونچے درخت پر بیٹھی رہ گئی۔

صبح ہوتے ہی جب میں پھر متشکل ہونے لگی تو قلعہ کی طرف جانے کے بجائے اس دروازے کی طرف دوڑ پڑی ــــ اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں ــــ ۔ جانے میرے بقیہ اہل شہر کہاں ہیں۔ کیا وہ بھی گرفتار ہو گئے ــ ، یا ــ اپنے بریدہ جسموں کو چھپاتے ہوئے کسی حکم اور فیصلہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ؟؟ ــ

بابلہ! کیا وہ ساری پرچھائیاں کسی مفروضہ کے تحت معدوم ہوئی ہیں ــ کیا جب ہم ان کے وجود کو فرض کر لیں گے تو وہ سب پھر موجود ہو جائیں گی ــ یا وہ سب کسی تجربہ کا شکار ہوئی ہیں۔

بوڑھا ــ خاموشی سے درخت سے لپٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھ کر آسمان ــ دیکھنے لگا ــ

کوّا ــ سامنے کی چٹان پر بیٹھا تھا ــ

پہاڑی گھاس کے کیڑے اب ایک قطار میں ہو کر واپس جا رہے تھے۔

بادامی رنگ کا کتّا اپنے پانچ ساتھیوں سمیت اور نزدیک آچکا تھا۔

سُورج ـ چٹانوں کے آخری سرے پر لرز رہا تھا۔

کوّا ـ ایک طرف اُڑ گیا۔

بادامی رنگ والا کتا ـ مع پانچ ساتھیوں کے ـ کچھ دیر بوڑھے کو دیکھتا رہا ـ پھر ہلکی سی "لف" کر کے ـ ایک سمت ـ بہت تیزی سے بھاگ نکلا ـ

لڑکی ـ شاخ پر بیٹھ گئی ــــ اس کے منھ، کان، ناک اور آنکھ سے سفید سفید بھاپ نکلنے لگی ــــ پھر وہ بھاپ ـ گاڑھے سیاہ اور کثیف دھوئیں میں تبدیل ہو گئی ــ اور تیزی سے اخراج ہونے لگا ـ

بوڑھا ــــ اپنے تسمہ لگے ہوئے تھیلہ پر جھکا ہوا تھا ــ

غزلیں

اجمل اجملی

۶۱ چوپال۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ہر گھڑی رہتا ہے اب خدشہ مجھے
پی نہ جائے وقت کا دریا مجھے
جب بھی ملتا ہوں وہی چہرہ ملے
بد دعا دیتا ہے آئینہ مجھے
گو حقیقت تھا مگر اے زندگی
خواب سا تو نے سدا دیکھا مجھے
چھوڑ آیا ہوں سلگتی ریت میں
جانے کیا کہتا ہو نقش پا مجھے
اس کے دل میں خود وفا ناپید تھی
دوستی کی بھیک کیا دیتا مجھے
ڈوبتی بجھتی ہوئی آواز ہوں
ساتھ والو غور سے سننا مجھے

■ ■

یوسف عثمانی

بجے سنگھ پورہ، اورنگ آباد

ہم آج تک نہ کبھی کھل کے زندگی سے ملے
ملے تو ایسے ملے جیسے اجنبی سے ملے
نظر اٹھائی جدھر عکس ہی نظر آیا
ہم آج تک نہ کسی اور آدمی سے ملے
یہ شاہرا ہوں کے نقش قدم، فریب نظر
سراغ زیست فقط آپ کی گلی سے ملے
خلا میں ہلکی نہ ہوں گی ہوس کی زنجیریں
کہ ان کے حلقے ہیں فطرت کی خود سری سے ملے
اگرچہ لطف کے دریاؤں نے کیا سیراب
ثمر سکون کے لیکن نہ گمرہی سے ملے
زمانہ کیسے نہ پاس ادب کرے یوسف
ہمارے سلسلے جا کر ہیں جب ولی سے ملے

جون ایلیا
کراچی

غزل

تو اپنے آپ سے بھی جُدا چاہیے ہمیں
تیرا جمال تیرے سوا چاہیے ہمیں

اندازۂ صدائے جرس سے حصول کیا
واماندگاں ہیں، دستِ صبا چاہیے ہمیں

ہر لحظہ جی رہے ہیں دوا کے بغیر ہم
چارہ گرو! تمہاری دعا چاہیے ہمیں

پھر دیکھیے جو حرف بھی نکلے زبان سے
اک بار پوچھ بیٹھیے، کیا چاہیے ہمیں

جانا نہیں ہے گھر سے نکل کے کہیں، مگر
ہر راہ رو کے گھر کا پتا چاہیے ہمیں

دم گھٹ کے رہ گیا ہے فضا نا فضا یہاں
آشفتگی طلب ہیں، خلا چاہیے ہمیں

کہنے کو حق نگر ہیں، حقیقت ہے آرزو
سچ پوچھیے اگر تو خدا چاہیے ہمیں

مدت سے ہم کسی کو نہیں دے سکے فریب
اے شہرِ التفات، دغا چاہیے ہمیں

... آذری سے مزاج کے با وجود
اس آن بھی یقینِ فنا چاہیے ...

ہم ... تبسم کی صورت ...
نو رنگ بن کے آ، کہ ردا چاہیے ہمیں

■■

جدنام نظو
معرفت روبی انٹرپرائزز۔ باٹم برج۔ گیا

ایک نظم

پھر وہی بیوی کا بستر وہی پھیلا ہوا جسم
ایک اک سانس میں مجبوری کا احساس رواں
ایک اک نبض میں رسموں کے لہو کی جھنکار
مہر کی ڈور میں لپٹی ہوئی ماں باپ کی جھوٹی عزت
میرے سر پر ہے سوار ——————
پیار کے بول "وہ ریشا کی سی ساڑی لا دو"
خواہش جسم کی آواز "بس اس ماہ کی تنخواہ ملے"
ایک اک سانس میں مجبوری کا احساس رواں
نام ہونٹوں پہ کسی پیاری سی صورت کا نہ آئے
ایک پتھر سا ہے سینے پہ جو ٹلتا ہی نہیں
دم نکلتا بھی نہیں
سانس چلتی بھی نہیں
زرد رسموں کی یہ زنجیر کہاں ٹوٹے گی؟
میری بچی یہ فرشتوں کی سی آنکھوں والی
جانے زنداں کا صلہ ہے کہ دعاؤں کا ثمر
کچھ بھی تو یاد نہیں
خواہشِ جسم ہر اک رات بھلا دیتا ہے
رسم، مجبوری، مہر
ایک اک سانس میں مجبوری کا احساس رواں

■■

قاسم یوسف

۹- ۹ پی۔ ۱۹ بی۔ ٹی۔ آر لائنس۔ چتور (اے پی)

ناحق ہم مجبوروں پر...

میں چلا جا رہا ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں مجھے پتہ نہیں۔ تمھیں معلوم ہے۔ لیکن ...... تم بتاؤ گے نہیں۔ اس لئے کہ کہیں میں راستہ نہ بدل دوں، کہیں تمھیں نہ جھٹلا دوں۔ تم نے مجھے وہ پرندہ بنا دیا جسے دیکھ کر یم راج نے سوچا تھا "اس کی موت کی جگہ دُور ہے اور وقت کم"

تو نے اپنے آپ کو مکّار کہا ہے۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میرے اطراف دُنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک یہ کیسی کیفیت کالی تنہائی تھی جو بگولے کی طرح میرے من کو چکر دے رہی تھی۔ یہ کیسی تاریکی تھی کہ میری صدیوں کی قدموں کی چاپ اسی کیچڑ میں دفن ہوگئی تھی۔ یہ کیسا سناٹا تھا کہ نہ کاخ ہے نہ کو، نہ دشت کی پنہائی۔ ازل سے میں ایک خواب کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا کہ کسی لمحے صبح کی تاریکی سے ٹھوکر کھا کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ اس تاریک ویرانے میں دو سفید پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کھسکتا کھسکتا ان کے قریب پہنچا۔ اور انھیں ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔

"ہم نے تمھاری چیخیں سُن لی ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو ہم تمھیں ایسی دنیا میں لے چلیں گے جہاں خوشی ہی خوشی ہوگی اور بہار کے ڈیرے سدا تنے ہوئے رہیں گے۔ ہر طرف نور ہی نور ہوگا۔"

میں خوش ہوا اور جھومنے لگا۔ انھوں نے ایک تنکا میرے حوالے کیا اور کہا کہ میں اسے اپنے دانتوں سے پکڑ لوں اور وہ خود اس تنکے کے دونوں سروں کو اپنے پنجوں میں لے کر اڑیں گے۔

ہم ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ خوبصورت پرندے خوشی سے گاتے ہوئے پرواز کر رہے تھے اور مجھے چپ رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ میں ان کے نغموں کو سن کر محظوظ ہوتا رہا۔ وہ مجھے ہماری منزل کے باغوں، نہروں، فواروں اور خوشیوں کے بارے میں مزہ لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ میں آنکھیں بند کئے اس کے تصور ہی سے خوش ہو رہا تھا۔ اس طرح یہ سفر بڑا ہی مسرور کن رہا۔ وہ خوبصورت پرندے مجھ سے کہنے لگے۔

" دیکھو پیارے! اب تم ایک ایسے شہر سے گزرو گے جہاں کی ہر چیز حسین ہوگی اور ہر منظر خوبصورت۔ لیکن تم اس کی خواہش میں کھو نہ جانا، کیونکہ وہ تمھیں اپنی منزل سے دُور لے جائے گا۔"

میں نے ان سے اشاروں میں کہا کہ میں وہی کروں گا جو تم مجھ سے چاہو گے، وہ خوش ہو کر پھر سے نغمے الاپنے لگے۔

ہوا میں خنکی پیدا ہونے لگی اور گلاب کی خوشبو سے بوجھل ہونے لگی، میں نے آنکھیں کھولیں اور نیچے دیکھا۔ کتنی حسین جگہ ہے یہ، بہتی ہوئی چاندی کی ندیاں، پہاڑوں سے گرنے والی پگھلی ہوئی چاندی۔ اونچے اونچے درخت جو اپنے معشوق کے خیال میں جھوم رہے تھے جیسے انھوں نے شراب چڑھا رکھی ہو۔ یہاں کے لوگ

کتنے خوش نظر آ رہے ہیں، کیسے ناچ رہے ہیں۔ ان کے چہروں سے یہ کیسا نور جھلک رہا ہے۔ جنگلوں میں ہرنوں کا چھلانگیں مارنا کتنا حسین لگ رہا ہے۔ ایک آبشار کے پاس بہاتی ہوئی لڑکیوں کی طرف میں نے اشارہ کر کے ان پرندوں سے پوچھا "یہ کیا ہے۔؟"

میں ان کا جواب نہ سن سکا کیونکہ اس عمل سے میرے منھ سے تنکا چھوٹ گیا اور میں فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا گرنے لگا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ خدایا یہ میں نے کیا کیا۔؟!!

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک کنوئیں میں پایا کتنا ٹھنڈا تھا یہ پانی۔ کتنا شیریں، بس اس میں ڈبکیاں مارنے لگا۔ میں بہت خوش تھا۔ اتنے میں مجھ سے کوئی چیز ٹکرائی اور مجھے اوپر گھسیٹنے لگی۔ میں ہاتھ پیر مارنے لگا۔ مگر بچنے کا کوئی امکان نہ تھا میں جال میں پھنس چکا تھا، اور جب اوپر آیا تو بہت سی آنکھیں مجھ پر جھپک گئیں۔ کسی کے ہاتھ میں بھالا تھا، کسی کے تلوار، کوئی کلہاڑی لیے تھا، کسی کے زہریلے دانت تھے، کسی کے دل میں جہنم، کسی کی آنکھوں میں شعلے تھے، اور کسی کے سر پر سینگ۔ انھوں نے مجھے جال سے نکالا۔ اور پھر جانے کیا کیا کرنے لگے۔ کسی نے میرے کپڑے اتارے، کسی نے میرے بال جلائے، کسی نے .... میں کہہ نہیں سکتا کہ انھوں نے کیا کیا میں نے آنکھ اوپر اٹھائی تو کسی نے اوپر پرواز کرنے والے پرندوں کو گولی مار دی۔ وہ دو تین قلابازیاں کھا کر جانے کہاں اڑنے چلے گئے۔ اے خدا! میں نے اسے کیا کہا تھا اور یہ کیا ہوا۔ آخرکار ان لوگوں نے میری سنگسار کر دی اور مجھے جیل کوؤں کے حوالے کر دیا۔

رات کے سناٹے میں جب میں گھبرانے لگا تو عیسیٰ آئے اور انھوں نے مجھ میں روح پھونکی اندر نے ستاب عطا کیا اور سب کے آخر میں خضر آئے اور انھوں نے موسیٰ اور الہ دین کی امانت مجھے سونپی اور یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ میں انھیں بھلائی کے لئے استعمال کروں۔ بھلائی ـــ جانے کیا چیز ہے۔

اب میرے ساتھ ساری دنیا تھی، سارا جہاں تھا، میں جو کرنا چاہتا تھا کیا۔ چراغ سے میں ساری دنیا بدل سکتا تھا، اور عصا کی مدد سے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ کر سکتا تھا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ مُردوں کو جِلانے میں کوئی مزہ نہیں ہے تو میں زندوں کو زندہ کرنے لگا وہ زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ جو میری بات نہیں مانتا تھا اسے اپنے جادو کی مدد سے اذیت دینے لگا۔ اس لئے سب میرے چراغ سے ڈر کر میرے عصا کے گرویدہ ہونے لگے۔ میں نے آسمانوں کو چھو جانے والی عمارتیں تیار کیں۔ سارے حسین منظر، ساری خوبصورت چیزیں میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیں۔ اور جب میں ان خوشیوں میں مست ایک دن سو رہا تھا تو کسی نے میرا چراغ چُرا لیا۔ جب میں سنبھلا تو وقت گزر چکا تھا۔ اب میرا عصا بھی گھن کھا چکا تھا اور اسے دیمک چاٹنے لگی تھی۔

اس وقت مجھے اپنی منزل کا خیال آیا۔ یہ تو میری منزل نہیں ہے۔ میں کہاں کھو گیا۔ میں دوڑنے لگا۔ جب میں کسی جنگل سے گزر رہا تھا تو ایک گیدڑ نے مجھے کھا لیا۔ جب میں پانی میں تیر رہا تھا تو مگرمچھ نے مجھے چبا ڈالا۔ اور جب میں صحرا میں بھٹک رہا تھا تو سورج نے مجھ پر تیر پھینکے۔ میں گھٹتا گیا۔ میں گھٹتا گیا۔ پہاڑوں سے میں نے سر ٹکرایا۔ چڑیلوں کے دانتوں کے نشان اپنی شہ رگ میں محسوس کرتا۔ کانٹوں سے چبھتا، سناٹوں سے گلے لگاتا، ریت میں دھنستا، طوفان میں پھنستا جا رہا تھا تو میں کچھ نہ تھا۔ ایک دن جب آنکھیں بند کئے آبلوں کا درد سہتا، خون کے آنسو بہاتا جا رہا تھا تو ناگہاں ایک صلیب سے ٹکرا گیا۔ میرے چاروں طرف خنجر کھڑے خونیں نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ ان کی چیزوں کو میں نے برباد کیا، اور پھر میں پگھلنے لگا۔ میرا خون بہنے لگا، گوشت گھلنے لگا۔ ہڈیاں راکھ بن گئیں۔ اور آخرکار میں راکھ کا ایک ڈھیر تھا۔ کسی نے پھونکا اور میں پھیل گیا، اور پھیلتا گیا۔ میں دور بھاگنا چاہتا ہوں مگر جا نہیں سکتا کیونکہ میں ہوا ہوں، میں ڈرتا ہوں کہیں عزرائیل مجھے آواز دیں تو میں جم نہ جاؤں۔ اس وقت تک مجھے بھٹکنا ہے اور بکھرنا....

جب میں تیرے پاس لایا جاؤں گا تو تو ایک زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھے گا اور میں قہر آلود نگاہوں سے۔ میرے چاروں طرف میرے دشمن ہوں گے اور میں تجھے دیکھتا رہوں گا، تو کہے گا "اسے خلوت میں لے چلو" میں خوش نہیں ہوں گا۔

تو نے اپنے آپ کو ستار کہا ہے۔ ــــ

فاروق راہب
نیو ڈسٹرکٹ ایگریکلچرل آفس۔ موتی ہاری۔ بہار

ٹوٹی ہوئی عورت

وہ آرہا تھا۔

"نہیں! میں اس کا سامنا نہیں کروں گی!!"

وہ انتہائی مدھم آواز میں خود سے مخاطب ہوئی اور ہتھیلیوں میں منھ چھپا کر سسکنے لگی۔ لیکن اس کے ذہن کی بھٹی میں تپتا ہوا یہ سوال "کیا وہ ایسا کرسکے گا؟!" اس کے وجود کو پگھلا رہا تھا ——— وہ سوچوں کے ساگر میں ان مایوس لہروں کو گن رہی تھی جو اپنے ساحل کو کبھی نہ پاسکیں گی! ویسے کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کے پاس بھی آئے ——— لیکن اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس سے ضرور ملے گا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ اسے فراموش نہ کرسکے گا۔ اور اس کے جانے کے بعد پھر وہی آگ برساتے لمحات ہوں گے اور وہ شعلوں کے درمیان گھری ہوئی راکھ بن جانے کی منتظر! ——— کاش وہ نہ آئے! لیکن وہ آئے گا اور وہ اسے روک بھی نہ سکے گی ——— اس بار تو وہ اس کا استقبال بھی نہیں کرسکتی۔ ایسا کرتے وقت وہ کتنی مضحکہ خیز لگے گی! کہیں وہ بھی اسے دیکھ کر قہقہہ لگانے لگا تو وہ وہیں مر جائے گی۔

"نہیں، نہیں، نہیں! ——— کوئی اسے میرے پاس آنے سے منع کردے!!"

وہ چیخ پڑی۔ لیکن دم گھونٹتے ہوئے تاریک کمرے کے آہنی پنجے میں وہ بالکل اکیلی تھی! انگاروں کے بستر پر دن رات گزارنے کے لئے اس کا ساتھ بھی کون دیتا! وقت بدلے یا نہ بدلے لوگ ضرور بدل جاتے ہیں! ——— وہ بھی بدل گیا ہوگا! لیکن اسے بدلنا نہیں چاہیے ——— کون جانے ——— سارے لوگ، تو گرگٹ کے سمان ——— لیکن وہ ان سارے لوگوں سے الگ ہے!

"ہائے سنی (Sunny)!"

وہ دھڑام سے دروازہ کھول کر داخل ہوا اور اس کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔

"تم کبھی آدمی نہ بن سکو گے!"

"تم نے مجھے آدمی بنانے کی کوشش بھی تو نہ کی!"

"تم آدمی بن ہی نہیں سکتے!"

"اس بار پکا آدمی بن جاؤں گا، قسم سے! بنا کر تو دیکھو!"

اور وہ وہیں دھم سے فرش پر آلتی پالتی مار بیٹھ گیا

"اُف"

"وہ دانت پیستی اور پیر پٹکتی کمرہ سے باہر نکل آئی۔ لیکن اس کے قہقہوں نے اس کا دور تک تعاقب کیا تھا ——— اور یہی قہقہے اس کی زندگی تھے جن کی دھمکی آج بھی اس کے ذہن پر محفوظ تھی اور وہ آج بھی اس کے لئے اتنی ہی پاگل ہوسکتی تھی ——— لیکن کل اور آج میں اتنا فرق تھا کہ وہ اب اپنی دیوانگی کا مظاہرہ کرسکتی تھی! ——— تو کیا وہ اپنے اندر کی آگ میں یونہی خاموش سے جھلس کر راکھ بن جائے گی ——— ؟! ہاں! اسے راکھ بن ہی جانا چاہیئے۔ یونہی تڑپ تڑپ کر گھٹ گھٹ کر مر جانا چاہیئے۔ کسی پر بوجھ بننے سے کیا فائدہ ؟! جب اپنا ہی آئینہ منھ چڑانے لگے اور اسے توڑ دینے کی خود میں سکت نہ ہو تو اس کے سامنے سے ہٹ ہی جانا بہتر ہے! لیکن وہ خود کو اس کے سامنے سے کیسے ہٹا سکے گی؟! پہلے آئے بھی تو ——— نہیں، آئے گا تو ضرور!! ——— وہ اس کی عادت ہے

بخوبی واقف تھی۔ وہ اپنی طویل غیر حاضری کے دوران کئی بار آ چکا تھا اور جب بھی آیا اس سے ملاقات ضرور کی ــــ لیکن کل اور آج کے درمیان کا فاصلہ ناقابلِ عبور بن چکا ہے! وہ خود آج وہ نہیں ہے جو کل تھی! ــــ کاش! وہ جیسے آئے دھرتی پھٹے اور وہ اس میں سما جائے تاکہ اس کی آنکھوں کا بدلا ہوا منظر وہ نہ دیکھ سکے ــــ لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ دھرتی اس کے لئے اتنی نرم نہیں ہو سکتی۔ کوئی اسے اس سے نہیں بچا سکتا۔ وہ آئے گا ہی اور اپنے مخصوص رومانٹک انداز ہی میں پہنچے گا۔

"ہائے سی!"

"ہنہ! آ گئے!"

وہ جل کر کہتی

"کہو تو چلا جاؤں؟"

"بلایا کس نے تھا؟"

"کیوں آخری وقت میں عاقبت خراب کر رہی ہو؟"

"چپ! جھوٹ نہ لا کرو میرے سامنے؟"

لیکن اب تو اس کی زندگی ایک دکھتا ہوا پھوڑا بن گئی تھی اور وہ گزرتے ہوئے لمحات کے بڑھتے ہوئے نشتر سے تلملا رہی تھی۔ اس کا سارا سکون چھن چکا تھا۔

"میں جب تمہیں ایک دن اپنی باہوں میں سمیٹ لوں گا ناسی! تو تمہاری ساری شوخی، سارا تیکھاپن، حوا ہو جائے گا!"

"آئینہ دیکھا ہے؟"

"وہ تو اب بھی دیکھ رہا ہوں۔"

اس کی منتظر نگاہوں سے وہ شرما گئی تھی ــــ لیکن کیا وہ آج بھی اتنا ہی شوخ و چنچل ہو گا؟ کیا وہ اس کے سامنے آج بھی ہمیشہ کی طرح ہی آئے گا؟! ــــ اس [illegible] سے ڈاکٹر ہیٹ ــــ [illegible] اعضاء بن جائیں۔ [illegible] تھے۔ اور اس بے جگری کی بھیڑ [illegible] تھی! [illegible] گرد کھڑے ہجوم [illegible]

"نہیں، وہ ہنستے مسکراتے چہروں کے بیچ آنسو بن کر جائے گی! لیکن وہ تو خود اس تک پہونچ جائے گا! وہ جانتی تھی کہ وہ اسے ڈھونڈ ہی لے گا ــــ لیکن اس کی اس حالت کا پتہ چل جانے کے بعد بھی کیا وہ ایسا کر سکے گا ــــ؟ زخموں پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ وہ وہی رنگ ہو!

"لیکن اب وہ کیوں مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا ہے؟"

وہ اپنے آپ پر جھنجھلا اٹھی۔ وہ اسے بھول جانا چاہتی تھی۔ اس کی ہر چھاپ اپنے دل و دماغ سے مٹا دینا چاہتی تھی لیکن اسے بھلا دینے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی۔ اس سے چپکے ہوئے اس کے نقوش اور گہرے ہو جاتے ــــ جو کچھ بھی ہوا انجانے میں ہی تو ہوا! وہ تو اسے بس گریز کرتی ہی تھی۔ وہی تو ــــ نہیں سوفی صد اس کا اپنا قصور تھا۔ وہ خود اس کے لیے بے چین رہتی تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ وقت اس سے بھیانک کرنے پر تلا ہوا ہے! اس کا تمام جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا اور ذہن کی رگیں پھٹ جانے کی حد تک تن گئیں۔ وہ اپنے اس زخم کو نہیں یاد کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اب تو اس کے سارے احساسات ہی زخم بن چکے تھے۔ کبھی کبھی چھوٹا سا زخم بھی اپنے اندر کتنی ٹیسیں رکھتا ہے! ویسا ہی زخم اس کے ایک پاؤں میں گھٹنے سے ذرا نیچے ہو گیا تھا اور ایک دن ڈاکٹر نے اس کا پاؤں گھٹنے سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا اور لوگوں نے اس کے ہاتھوں میں بیساکھیاں تھما دی تھیں۔

"نہیں ــــ!!"

وہ چیخ پڑی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی ــــ

بے جان سہاروں پر خود کو ڈھونا اس کے لئے وبالِ جان بن گیا تھا لیکن بیساکھیاں اس کے لئے حقیقت بن چکی تھیں اور حقیقت سے انکار کتنا مشکل ہے! ــــ اس لئے اپنے پرائے کے مذاق کا ہدف بننے سے پہلے اس نے خود کو اپنے کمرے میں قید کر دیا ــــ کسے اپنا کہتی ــــ؟ اسے کون اپنا کہتا؟ ــــ اب تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ طوفان کے ایک ہی جھونکے سے گلشن اجڑ چکا تھا، آشیانے کے سارے تنکے بکھر گئے تھے ــــ اجڑے گلشن میں، برباد آشیانے میں آتا بھی کون ہے! ــــ

اور یہ سانحہ اس کی غیر حاضری ہی میں تو ہوا —— وہ سنے گا تو اسے ایک جھٹکا لگے گا —— اسے تو معلوم بھی ہو چکا ہوگا —— وہ اسکے بعد بھی اس بوجھ کو اٹھائے گا؟ —— وہ خود اسے ایسا نہ کرنے دیگی. کسی کی زندگی سے کھیلنے کا اسے کوئی حق نہیں! وہ اس کے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔ اس کے متعلق سوچنا ہی گناہ ہے —— لیکن وہ ان خیالوں کو کیا کرے جن کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں۔ وہ انہیں کہاں ڈھکیل دے. کس کونے میں پھینک دے —— ہر طرف، ہر جگہ وہی تھا۔ اسی کی تصویر چھپاں تھی۔ اس سے نجات کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر کے ہار گئی تھی —— لیکن کسی کی یاد پر پابندی تو نہیں! کسی کی سوچوں پر کوئی قابض تو نہیں ہو سکتا! —— بس یہ سوچیں ہی تو آسرا تھیں۔ انہی پر بھروسہ کر کے اسے ساری عمر گزار دینی تھی —— لیکن اس کا سامنا کرنا کتنا محال تھا! وہ اس کے سامنے کیسے کھڑی رہ سکے گی؟ اب تو وہ ٹوٹ چکی تھی، بکھر چکی تھی، وہ اسے پوچھنے ہی کیوں لگا۔ آئے گا بھی تو حسبِ دستور نبھانے —— وہ بھی اس سے کھل کر گفتگو نہ کرے گی۔ اس سے رحم کی بھیک کی طالب نہ ہوگی۔ اپنے چہرے سے، اپنی آنکھوں سے ذرا سا ظاہر نہ ہونے دے گی تاکہ وہ سمجھ لے کہ وہ کتنے مضبوط دل کی ہے۔ وہ اپنی موجودہ حالت میں بھی پر اطمینان زندگی گزار رہی ہے! اسے کسی کی پرواہ نہیں کسی کو کوئی ضرورت نہیں کہ اس کی فکر کرے۔ لوگ تو خواہ مخواہ کسی کے ساتھ اپنی ہمدردی جتا کر اس کی مصیبتیں اور بڑھا دیتے ہیں —— اسے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیئے.

"میں خوش ہوں، بہت خوش ——"

"میلو آنٹی! میری اچھی آنٹی!!"

ندآ ہی گیا۔ اس کے بعد ہی اس کے کانوں سے اپنی ماں کے "ارے ارے" کہنے کی آواز ٹکرائی اور سمجھ گئی کہ وہ اپنی عادت کے مطابق انہیں انھیں آغوش میں بھر کر بھینچ رہا ہوگا۔ وہ ہوشیار ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ اس کے بعد اپنے انکل سے ملے گا اور فوراً ہی ادھر کا رخ کرے گا۔ اب وہ آہی رہا ہوگا۔ اسے کھڑی ہو کر اس کا استقبال کرنا چاہیئے تاکہ اسے اس کی گھبراہٹ کا پتہ چل سکے اور وہ جیسے ہی بیساکھیوں پر مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی اس کے کمرے کا دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا اور وہ آندھی کی طرح داخل ہو کر اپنے مخصوص دلآویز لہجے میں چلّایا

"ہائے سنی!"

اور وہ چڑے بغیر نہ رہ سکی.

"تم آج بھی جانور ہو!"

اس کا زندگی سے بھرپور قہقہہ گونجا اور خاموشیاں جھنجھنا اٹھیں وہ اس کے بہت قریب آیا اور اس کی ناک کو انگلی سے چھوتے ہوئے آنکھوں میں اتر کر پہلی بار گمبھیر لہجے میں بولا۔

"شہلا ڈیر! جب تک تمہارا اعظم زندہ ہے، تمہیں کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں!"

اور اس نے اس کی بیساکھیاں پھینک کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا

■■

غزلیں

ہوش مجروح

رتن سین ڈگری کالج۔ بانسی۔ بستی

پیکرِ سنگ، تراشیدۂ آذر کہیے
پھول سے جسم کو کس آنکھ سے پتھر کہیے
دل کا اصرار، ستمگر کو ستمگر کہیے
دیدۂ شوق بضد نور کا پیکر کہیے
ہونٹ جیسے کہ کوئی نیم شگفتہ غنچہ
آنکھ ایسی کہ چھلکتا ہوا ساغر کہیے
ایسی پیشانی کہ محجوب ہو سورج کی جبیں
زلف ایسی کہ شبِ تار کا محور کہیے
وہ تبسم کہ کریں بجلیاں جھک جھک کے سلام
وہ تکلم کہ سرودِ مئے کوثر کہیے
اُف وہ قامت کہ پکار اٹھے صنوبر کہکر
ہائے وہ روپ کہ بس دیدنی منظر کہیے
اولاً سنگ نہ اس پھول کو کہیے مجروح
سنگ اگر کہیے تو پھر سنگِ مقدر کہیے

شاہد کلیم

سنٹرل اکسائز۔ گیا

صلیبِ وقت پہ چڑھ کر میں جاودانی تو ہوا
کہ اور کچھ نہیں، پیغمبرِ جہاں تو ہوا
یہ اور بات ہے گزرا نہ حادثہ کوئی
اندھیری رات میں آسیب کا گماں تو ہوا
اس ایک گھر کے جلانے سے کچھ نہیں حاصل
تمام شہر کا منظر دھواں دھواں تو ہوا
اداس اداس بیاباں ہی دیکھتا ہوں میں
مری نگاہ میں اک اور بھی جہاں تو ہوا
میں اپنے گھر میں اکیلا ہی تھا مگر شاید
کسی کے ہونے کا ہر اک نفس گماں تو ہوا

رام پرکاش راہی

سی۔۱۰۰ قدوائی نگر۔ نئی دہلی۔۲۳

صبح ہوتی ہے تو پھر شام سے جی ڈرتا ہے
حسنِ آغاز کے انجام سے جی ڈرتا ہے
جرأتِ شوق کو کچھ ایسے ڈسا ہے غم نے
آج میخانے کے ہر جام سے جی ڈرتا ہے
نہ علامت ہے نہ تشخیص نہ چارہ جس کا
جانے کس رنجشِ بے نام سے جی ڈرتا ہے
ڈھل گیا خوفِ خدا حسنِ بتاں میں شاید
ورنہ کیوں صورتِ اصنام سے جی ڈرتا ہے
زلف بر دوش پہ چہرے مجھے معذور رکھیں
دھوپ اور چھاؤں کے کس نام سے جی ڈرتا ہے
کوئی تکتے نہ پکارے مجھے راہی کہہ کر
دوستو اب مرا اس نام سے جی ڈرتا ہے

کوثر ستار
آنند بھون۔ سول لائنز۔ علی گڑھ

دوراہا

"سالمہ"، "شادی" اور "مستقبل" یہ تینوں الفاظ فاروقی صاحب کی موت کے بعد بیگم فاروقی کے ذہن میں کوڑا جال شاہی کھیلتے رہے ہیں۔ تغری ناٹ تغری کی یہ گولیاں بارہا اس معمر، سنجیدہ، حساس، ذہین اور دُور اندیش عورت کو جاں کنی میں مبتلا کر چکی ہیں اور آج سالمہ کی انیسویں سالگرہ کا دن تو رات بہت جاگنے کے بعد آرام کرنے کی اذیت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ چہرے پر قوس و قزح کے سے رنگ بجائے شداد کی جنت کے اس جگہ پہونچا رہے ہیں جہاں کسی امریکی دیت نامی نے سائیلنس بم چھوڑ دیا ہو اور گونگی آگ کے فضا میں تحلیل ہوتے ذرّے وجود کو بھون رہے ہوں کیونکہ ان کے بھانجے امجد اور ہونے والے داماد نے لندن سے پارسل کے ڈبے کے ساتھ یہ تیر بھی مارا ہے کہ اس سال کے آخر میں وہ انڈیا پہونچ رہا ہے ۔۔۔ ایک بار پھر یہ خبر بیگم فاروقی کے لئے بہت سے سوالیہ نشان لے کر آئی، ذہن کا ٹیپ ریکارڈ حرکت کرنے لگا۔

"اکلوتا امجد دس سال کی عمر میں ہی لندن چلا گیا تھا، سالمہ اس وقت بہت چھوٹی تھی، اب دونوں ہی پہاڑ کی اس چوٹی پر ہیں جہاں اپنا ایک طرزِ زندگی، اپنی ایک رائے اپنا ایک نظریہ، اپنی ایک پسند اور اپنی ایک خواہش ہوتی ہے۔ ہر طرزِ زندگی، ہر رائے، ہر نظریہ، ہر پسند، ہر خواہش اپنے تمدن، اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کی کھیتی میں اُگتا ہے۔ امجد مغرب میں ہے، کون جانے وہ کیا بن چکا ہے اور سالمہ باوجود ہندوستان کے جدید ماحول میں پرورش پانے کے مشرقی ہی نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے ایک روایت پرست خاندان میں بڑی ہوئی ہے، اس کے علاوہ شعوری کم گوئی اور سنجیدہ خاموشی کا 'نشتر' بر وقت زبان پر اس طرح برقرار رہا کہ آج تک اس کا اندر میں تک نہ دیکھ سکی۔ اگر ایسا ہے تو ذہنی تضاد کا یہ ایٹم بم کبھی بھی پھٹ سکتا ہے، اور اس کی کرچیں نہ صرف ان دونوں کو بلکہ دیگر لوگوں کو بھی زخمی کر سکتی ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے ان کا سارا جسم اس طرح لرزنے لگا جس طرح "سپر سے جیٹ" کے گزرنے سے عمارتیں لرز اٹھتی ہیں۔

وہ بڑبڑائیں۔

"تو کیا رشتے کے یہ تار ٹوٹ جائیں؟ لیکن سالمہ کے لئے امجد جیسا لڑکا بھی تو ملنا دشوار ہے جس میں اتنے گن ہوں، حسب، نسب، تعلیم، شکل و صورت، دولت، قرابت۔ شاید اس رشتے کے خلاف سوچنا بھی تو مصداق اس اندھے فقیر کے ہے جو سب کچھ مل جانے کے بعد بھی ہوس کی گوڑی پیٹتے رہے۔"

اس طرح کے بہت سے مسائل امریکی اور روسی اپولوز کی طرح خیال کے محور پر گردش کرتے رہے، یہاں تک کہ وقت کی تمام شکنیں صاف ہو گئیں اور امجد انڈیا پہونچ گیا۔

بیگم فاروقی جو عرصے سے اندیشوں اور وسوسوں کی آلنوگیس کی سی فضا میں بھٹک رہی تھیں وہ فوراً ہی نتیجہ کی صاف منزل پر پہونچنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے امجد سے پہلی ہی ملاقات کے دوران

"وجدانی ایکسپریس" کی رفتار سے سوالوں کی بوچھار شروع کر دی، یہ
سوالات خالی خولی نہیں تھے مگر ان کا ساٹھ سالہ تجربہ، مشاہدہ اور
مطالعہ سب ہی کچھ سمٹ آیا تھا سوالات کی اس 'کیو' میں انھوں نے
امجد کے مذہبی نقطۂ نظر، مغربی تہذیب اور کلچر سے امجد کی دلچسپی اس
کے آئندہ رہائش کے پروگرام کو پیش نظر رکھا تھا، کیونکہ اپنی سابقہ
نسل خلافت کے بزرگوں کی طرح ان کی روایتی رائے یہ تھی کہ انگلستان
جانے کے بعد فرد، اس کے رشتے، اس کا مذہب اس کا اپنا معاشرہ،
اس کی تہذیب، اس کا وطن سب کچھ لاشعور کی ایک گتھی بن کر رہ جاتے
ہیں۔ امجد جو اسی خاندان کا ایک ٹیلینٹ ہے، خالہ بی کی اس بات چیت
تک فکر کی تمام سیڑھیاں طے کر کے پہونچ گیا۔ ساتھ ہی اس کی گول اور
گہری آنکھیں اپنے گرد و پیش کا طواف کرنے لگیں، معاً اسے خیال آیا،
سالمہ کو دیکھنے سے پہلے سالمہ کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ خالہ بی
کی تسلی کر دوں۔

"میں نے لندن میں اٹھارہ برس گزارے ہیں مگر میں وہاں
مستقل نہیں رہ سکتا"

یہ کہتے ہوئے امجد نے حلق کی خشکی دور کرنے کے لئے تھوڑا
سا تھوک نگلا۔ اس عمل کے دوران ڈرائنگ روم کے اس دروازے
کی طرف، راویہ نگاہ کر لیا جو اندر کھانے کے کمرے کی طرف کھلتا تھا اور
جہاں سے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرتی ہوئی سالمہ کبھی ادھر سے ادھر
جاتی ہوئی نظر آسکتی تھی۔ آس کو ٹھیک کرنے کے بعد امجد نے اپنے
پھر ہونٹوں کی مشین کا سوئچ آن کر دیا۔

"لندن کی اس مصنوعی پرپیچ، چمکدار، دار بستگی، ناچ رنگ،
عریاں اور بے باک زندگی سے دلچسپی صرف اس حد تک رہی کہ تنہائی
کو یاد کر سکوں ... کی لئے کرنے کی ہر آنچ سے ہاتھ سینکے ہیں لیکن مجھے
سب کچھ وقتی محسوس ہوا۔ وقتی .... لمحاتی ... اور عارضی"
ایک ٹھنڈی آہ کی آواز سے کمرہ گونج گیا باتوں کا سلسلہ
پھر شروع ہوا

"ہاتھ ناپنے کے بعد جب میں ہوش و حواس گنوانے کی رفتار سے
زیادہ منکر ہو گیا رہتا تھا تو اپنا وطن، اس کے فطری اور قدرتی مناظر،
اس کے باسی، اس کا اپنا ایک ست رنگا کلچر، باضابطہ تہذیب اور
رکھ رکھاؤ والا تمدن، اپنا خاندان، اس کے رسم و رواج اور روایات
ایک خاص مذہبی فضا، امّی، ابّو، سالمہ، دوست احباب اور پڑوسیوں
تک کی یادیں مجھے آواز دیتی تھیں"

یہ جملے ادا کرتے ہوئے امجد کی آواز کے تار جھنجھنا گئے اور بیگم
فاروقی کے چہرے پر بحر الکاہل سکون کی موجیں ہاتھ پیر مارنے لگیں۔
فضا میں سالمہ کے مستقبل کی ایک ننھی سی ٹیوب لائٹ روشن ہو گئی اس
احساس سے

"اگر امجد یہی ہے تو پھر مسئلہ کیا۔ دیوانوں کی خوب
گزرے گی"

شاید ایسا ہی ہوتا اگر شادی کے بعد سالمہ کے اندر چھپی ہوئی لڑکی
نہ جاگ اٹھتی شادی کی پہلی ہی رات سالمہ نے کافی بے باکی سے
امجد سے پوچھا۔

"سنا ہے آپ ہندوستان مستقل رہیں گے"

ہاں"

امجد نے اپنی انگلیوں سے اس کی انگلیوں میں قینچی ڈالتے
ہوئے کہا۔

سالمہ، "لیکن مجھے تو یورپ اور اس کی زندگی پسند ہے"
"بری تو مجھے بھی نہیں لگتی، مگر میں وہاں مستقل نہیں
رہ سکتا"

امجد نے گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے مزید اضافہ کیا۔
"میں تو اس زندگی سے اوب گیا ہوں سالمہ"
"اور میں اس دقیانوسی زندگی سے"
یہ کہہ کر سالمہ کی نگاہیں امجد کے چہرے کو پڑھنے لگیں اور امجد جو
ایک سیدھے سادے ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی سے اس جواب
کے لئے تیار نہ تھا، آئینہ کی طرح سالمہ کو تکنے لگا۔ پھر خود ہی ماحول کی
بے وجہ خاموشی کو توڑنے کے لئے اس نے سالمہ کو لوری دینے والے
انداز میں سمجھایا

"اب تو اپنا ہندوستان بھی اور خاص طور پر دہلی یورپ کے

کسی پیرس سے کم نہیں۔"

"ہونہہ! آپ کے لئے نا! آپ لوگوں کے لئے، آپ لڑکوں کے لئے۔"

یہ لہجہ اپنے ماحول، تمدن، کلچر اور فضا کے خلاف بغاوت کی بہت سی شہادتیں دے رہا تھا۔ امجد خاموش اور گمبھیر آنکھوں سے سالمہ کے انگوٹھے میں، چمکتی ہوئی آرسی کو دیکھنے لگا، جس میں اس کو یہ عبارت نظر آئی۔

"یہ سب کچھ ہم جیسے بعض نیم ہندوستانی اور نیم انگلستانی کلچر کے فقیر خاندانوں کے گھٹے ہوئے اور کچلے ہوئے ماحول کا ایک ردعمل ہے جس کی مریض سالمہ بھی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ کبھی فرصت میں تبادلۂ خیال ہوگا۔ اس مسئلے کو کسی اور دن کے لئے اٹھا رکھو۔"

آرسی سے نگاہ اٹھاتے ہوئے لمحوں کے تکدر کو ختم کرنے اور فضا کو ہموار بنانے کی غرض سے اس نے یہ کہتے ہوئے

"ڈارلنگ! اس سطحی بحث کو کسی اور دن کے لئے اٹھا رکھو"

سالمہ پر ایک جنسی حملہ کیا اور اپنی آہنی باہوں میں سالمہ کو بھرتے ہوئے جہاں جہاں ممکن ہوا، بوسوں کے پرنٹ چھاپ دیئے۔ سالمہ جو اس وقت مخالفت اور مقابلے کی ہر صلیب پر چڑھ جانے کو تیار تھی، ایک جھٹکے کے ساتھ امجد کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔ لیکن امجد کے رجائیت پسند من نے ہار نہیں مانی۔ اس بار اس نے نفسیاتی آلے سے جراحی شروع کی اور سالمہ کی زبان میں گفتگو کی کوشش کرنے لگا تاکہ سالمہ کے دل رنگیلی لکڑیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو شعلوں کی آنچ دے کر بھسم کر دے اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ جائے۔ اس نے نہایت دھیمے اور لہجے میں اس کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا۔

"اچھا سلو بتاؤ تم کو یورپ کیوں پسند ہے۔؟"

اس جملے نے سالمہ کے دلربا ساز کے تار چھیڑ دیئے جیسے وہ اسی سُر کے سننے کی منتظر ہو جب امجد کی آواز کو اپنی آواز سے دیکھا تو بے قراری کا ہوا تھی وہ بے تحاشہ انداز میں بولی۔

"مجھ کو یورپ ہر اعتبار سے پسند ہے امجد۔ ہر طرح سے۔

".... خاص طور پر وہاں کے لوگ، ان کا کلچر! کس قدر فطری، حقیقی اور آزادانہ ماحول ہے ان کا! ...... کتنی بے باک، کتنی جدت پسند، کتنی آرٹسٹی، کتنی تیکنیکی اور ایڈوانس زندگی ہے ان یورپ والوں کی۔ اک ذرا ہپیّوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ کیسی خودمختار، من مانی، عیش پرست اور رومان پرور دنیا میں رہتے ہیں۔ ایک مدت سے یہ زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا میرا دل اور آپ! .... آپ اس زندگی سے اوب گئے ہیں نا۔"

یہ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی زبان کا بریک فیل ہو گیا اور ایک برقی شاک کے جھٹکے سے اس کا جسم سرہانے سے پائنتی آ پڑا جس کے قریب ہی ایک کھڑکی کھلی تھی وہ اس کی جالیوں میں سے دور بہت دور رات کی سیاہی میں صبح کی نور تلاش کرنے لگی۔!

افتخار بیگم صدیقی

معرفت ڈاکٹر وسیم نکہت۔ ڈی ۳۵۔ ماڈل ٹاؤن۔ دہلی-۹

ایک نظم

(۲۱ دسمبر کو ایک خطرناک آپریشن سے قبل)

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہیں یہ شام میری زندگی کی شام نہ ہو
یہیں تک آ کے نہ رک جائے کاروانِ حیات
یہی فسانۂ ہستی کا اختتام نہ ہو

مجھے خبر ہے کہ انجام زندگی کا ہے موت
یہ جانتی ہوں کہ ہر راہِ زندگی اک دن
عدم کی منزلِ آخر یہ جا کے رکتی ہے
یہ ایسا جام ہے ہر ایک کو جو پینا ہے
تو کیوں نہ اس کو پئیں ہنستے مسکراتے ہوئے

میں سوچتی ہوں کہ اچھا وہی مسافر ہے
کہ جس کے سامنے آئے ہوئے گرم نہ دھوپ
نہ جس کے لب ہوں شکایت گزارِ تشنہ لبی
نہ جس کے پاؤں ہوں افگار آبلہ پائی
نہ خم ہو جس کی کمر بارِ دوش و ترد سے
کرے نہ جس کو ہراساں سفر کی تنہائی
جو دھوپ چڑھتے ہی منزل پہ جا کے سو جائے

یہ سب درست سہی پھر بھی یہ حقیقت ہے
حیات کچھ بھی ہو لیکن حیات نعمت ہے

کچھ ایسے رشتے ہیں جو ٹوٹ ہی نہیں سکتے
دعا کو اٹھے ہوئے بڑھتے کانپتے ہاتھ
خموش سہمی سی معصوم ملتجی آنکھیں
یہ روکتی ہوئی باہیں، بکاستے ہوئے لب
حصار بن کے ہر اک سمت ایسے رہتے ہیں
کہ جن کے گھیرے سے باہر نکل کے کوئی بھی
خوشی سے موت کا یہ جام پی نہیں سکتا
کبھی کبھی مرے دل میں ۔۔۔۔۔۔

▬▬

حسن رضا

قاضی پورہ ۔ کھنڈوہ (ایم پی)

غزل

تحفہ اپنی خودغرضی کا انسانوں میں بانٹ گئی
دنیا پیار کی نازک رسی تیز چھری سے کاٹ گئی

تنہائی کی رات میں چمکے تارے نرم اجالوں کے
دل کے خلا کو آج اچانک یاد کسی کی پاٹ گئی

راکھ بھری ہے الماری میں ورق ورق ریزہ ریزہ
رفتہ رفتہ عقل کی دیمک سرد کتابیں چاٹ گئی

آس کی کشتی دریا میں ہچکولے کھاتی پڑی رہی
جوشِ جنونِ موج اٹھی اور سارے کنارے کاٹ گئی

دھوپ نے مجھ پر آج رضاؔ کچھ ایسا رنگ چڑھایا ہے
داخل ہو کر جسم کے اندر خون رگوں سے چاٹ گئی

▬▬

شفیع جمال
ایم۔کے۔ بکس اینڈ اسٹال، کچہری بازار، مظفرپور (بہار)

بھیگا ہوا وہ

وہ جیسے ہی صندوق سے باہر نکلا اور زندہ رہ جانے کا احساس لاشعور سے شعور تک آیا، اس نے محسوس کیا کہ جسم بخار سے تپ رہا ہے بھبکتی ہوئی شعاعیں ناک کے نتھنوں اور منھ کے دہانے سے نکل رہی ہیں۔ ایسا روز ہی ہوتا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا، پانی کے اڑتے ہوئے چھینٹے دیکھتا، اور نہ چاہتے ہوئے بھی بھیگنے لگتا۔ اور اپنے صندوق تک آتے آتے وہ اس قدر بھیگ کر لت پت ہو جاتا کہ کپڑوں کا ہر تار بوند بوند ٹپکنے لگتا۔ ایسے میں وہ بوجھل قدموں سے گزرتا۔ اور وہ سارے دن خود کو بخار میں جلتا محسوس کرتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ خود بخود اس کے اندر کوئی مٹی کا ڈھیلا سرک جاتا، تو اندر کا پانی رِس رِس کر باہر آنے لگتا اور وہ اپنے ہی پانی میں ڈوبتا ابھرتا، اور بھیگتا رہتا۔ ایسے موقعوں پر وہ خود کو لعنت ملامت کرتا۔ غصہ میں خود کو حقیر سمجھتا۔ نفرت سے اپنی آنکھیں مروڑ لیتا، اپنی انگلیوں میں سوئی چبھو لیتا اور آئینہ کے سامنے کھڑا بڑبڑاتا ——— "کیوں میں ایسی مٹی سے تخلیق ہوا، کہ پانی دیکھا، یا ذرا سا پانی کا چھینٹا پڑا، اور لگے بھیگنے۔ عجیب بھربھری مٹی ہے کم بخت۔ آخر وہ لوگ کہاں تخلیق ہوئے تھے اور وہ کیسی مٹی تھی کہ جسم پتھر، آنکھیں کانچ، ٹانگیں لکڑی اور زبان پلاسٹر کے ٹکڑے ہو گئے ——— پانی کیا ——— ؟ پانیوں کے سمندر سے بھی خائف نہیں۔ بالٹی بالٹی بھر پانی جسم پر انڈیل دیا جائے مگر بے چارہ پانی خود پھسل کر گر جائے۔ اُف یہ بھربھری مٹی ——— !!

اس نے صندوق سے نکل کر پہلے اپنی نبض ٹٹولی، دونوں گال چھوئے اور بڑبڑایا ——— "خواہ مخواہ بھیگتا پھرتا ہوں، بےکار ہی بخار میں تپنے کا کرب برداشت کرتا ہوں۔ مگر اب ——— اب نہیں۔ اب تو یہ الزام بھی نہیں لوں گا کہ خواہ مخواہ بھیگ بھیگ کر لوگوں سے چانگ پیچ وانگ کرتا ہوں۔" اس نے اپنے فیصلے سے مطمئن ہو کر ڈسٹر اٹھایا اور اپنے چہرے کے سارے شکن مٹا دیئے۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر قطرہ قطرہ کر کے سیمنٹ کا پورا ڈبہ نگل لیا۔ اب وہ پر سکون ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے آئینہ پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ایک مٹھی خشک سیمنٹ لے کر سارے چہرے اور جسم پر ملی، تاکہ جسم کی نمی اس میں جذب ہو جائے۔

آج وہ بازار میں نکلا، گلیوں سے گزرا، سڑکوں کی پیمائش کی، اور خود کو پانی کے چھینٹوں سے بچا کر اپنے صندوق تک لے آیا۔ آج وہ مطلق نہیں بھیگا تھا۔ اپنے خشک جسم کو تان تان کر دیکھتا رہا۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ بھی بہت جلد، پتھر کے جسم، کانچ کی آنکھوں، لکڑی کی ٹانگوں اور پلاسٹر کی زبان کا مالک ہو جائے گا۔

مگر آج جب وہ اپنے صندوق میں گھسا تو اسے لگا کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے، یہ گیلا گیلا سیلن بھرا صندوق؟ اسے یہ سب کچھ اوپرا لگا، مگر یہ احساس کہ اب وہ بھیگا ہوا نہیں رہا۔ وہ خشکی چاہتا ہے، اسے ایک دن پتھر کا ہو جانا ہے، اس لئے اسے گیلا نہیں رہنا چاہئے۔ یہ اسے مضطرب کر رہا تھا۔ مگر ذہن میں بہت سارے چور اور لٹیرے بیٹھ گئے تو صندوق اور مسجدوں [illegible]

پھندوں بھرے صندوق میں خشک ہو ہی جائے گا۔ وہ خود کو سمجھاتا رہا۔ تلملاتا رہا۔ مگر اضطراب ختم نہیں ہوا، اور اپنی اکھڑی سانسیں اسی الجھن میں گڈمڈ کر کے سورج کی روشنی دیکھنے لگا تھا۔ ساری رات وہ تاریکیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔

سورج کو دیکھ کر وہ صندوق سے نکل آیا۔ اسے بخار نہیں تھا، بلکہ جسم اتنا سرد ہو چکا تھا کہ نقطۂ انجماد کا گمان ہو رہا تھا۔ بدن اتنا ہلکا کہ۔۔۔ ابھی ابھی ہوا کا سُرخ، سبز، یا سیاہ جھونکا اسے اُڑا لے جائے گا۔ پاؤں تالے پر رکھتا تو چابی پر جا پڑتے۔ سر بہت بڑا ہو گیا تھا۔ وہ باہر جا رہا تھا، مگر نہ جانے کیسے آپ ہی آپ اندر آ گیا اس نے سخت الجھن اور اکتاہٹ کے ساتھ اپنی کلائی میں انگلی ڈبو دی۔ اُف ۔۔۔ خون تیزابی ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر انگلی باہر کھینچ لی تو ۔۔۔ پوٹاشیم سائنائیڈ کی تیز زہریلی بھاپ ناک کے نتھنوں میں گھس کر اس کے حواس معطل کر گئی۔ اور جب کافی دیر بعد ہوش نے سر سہلایا تو اس نے اٹھ کر جلدی سے ڈسٹر لیا اور اپنے جسم کا خشک سیمنٹ جھاڑ دیا۔ حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی زمین پر ایک کلو سیمنٹ کا محلول پھیل گیا تھا۔ جسم کی جلن برقرار تھی۔

آج بھی وہ بازاروں، گلیوں اور سڑکوں سے گزرا۔ قدم قدم پر پانی کے چھینٹے پڑتے رہے وہ ایک ایک قطرے کو جذب کرتا رہا اور بھیگتا رہا۔ صندوق کی طرف واپس آتے وقت وہ پانی سے شرابور ہو گیا، جسم کی جلن مٹ گئی تھی۔ اور اس کا سارا جسم کافی وزنی ہو چکا تھا۔ بھاری جسم اپنے پیچھے پاؤں کے گہرے نشانات چھوڑ آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ صندوق میں لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا آج صرف چھتیس گھنٹوں نہیں بلکہ چھتیس صدیوں بعد گہری نیند آ رہی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سو چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ ہے اور ۔۔۔۔۔ بازاروں، گلیوں اور سڑکوں سے پاؤں کے گہرے نشانات اس کے صندوق کی طرف روشنی کی شعاعیں منعکس کر رہے ہیں۔ اور آج ۔۔۔ وہ تاریکیوں میں نہیں بلکہ روشنیوں کے دائروں میں آرام کی نیند سو رہا ہے۔

--

شبنم مسیح الزماں
۱۱۶ - سبزی منڈی، الہ آباد

میراث

کھانے سے فارغ ہو کر سلطانہ بیگم نے اطمینان کی سانس لی اور پاندان اپنی طرف گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ لڑکیاں کھانا کھا کر پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی پان سے رتی بھر دلچسپی نہیں تھی، اُلٹا وہ بعض اوقات ماں کا مذاق ہی اُڑاتی تھیں جنھیں پاندان سے اس طرح محبت تھی جیسے وہ ان کی سب سے چہیتی اولاد ہو۔ فرید صاحب کے دفتر چلے جانے اور کام کاج سے فرصت پا لینے کے بعد وہ گھنٹوں اس کی دیکھ بھال میں صرف کرتیں۔ یہی تو تنہائی کے چند گھڑیاں ہوتی تھیں جب وہ پان کا پورا پورا لطف اُٹھا سکتی تھیں۔

ابھی انھوں نے الائچی چھیلی ہی تھی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ دھیرے سے کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ سلطانہ بیگم پر نظر پڑتے ہی اس نے دونوں ہاتھ ملنے کے لئے اُٹھا دیئے اور جھجکتی ہوئی قریب آ گئی۔

"میں مالتی شرما ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتیں، لیکن فرید صاحب اکثر شرما جی کے ساتھ میرے گھر آتے رہتے ہیں۔ انھیں سے آپ کا بہت ذکر سُنا ہے" وہ ذرا سا مسکرائیں۔

"اچھا تو آپ مسز شرما ہیں" سلطانہ بیگم نے بظاہر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ حالانکہ انھیں اس وقت جب اللہ اللہ کر کے ذرا پاندان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا تھا، مالتی کا آنا بہت ناگوار ہو رہا تھا۔ "فرید صاحب تو شرما جی کا ہر وقت تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ آپ سے بھی غائبانہ تعارف تو تھا ہی، ہاں ملاقات نہیں ہو سکی تھی"

"میں نے تو کئی بار فرید صاحب سے کہا بھی کہ اپنی مسز کو لے کر آیئے لیکن معلوم ہوا کہ آپ کہیں نکلتی ہی نہیں" وہ پھر مسکرائیں۔ لیکن سلطانہ بیگم کو نہ جانے کیوں ایسا لگا جیسے مالتی بھی زبردستی ہنس رہی ہیں۔ "اور میں بھی کچھ ایسا مصروف رہی کہ گھر قریب ہونے کے باوجود نہ آ سکی۔ کبھی کوئی ایسا موقع بھی نہیں پڑا کہ آنا ہوتا"

"چلئے اچھا ہوا کہ آپ نے موقع کا انتظار چھوڑ دیا ورنہ شاید آج بھی نہ آتیں" وہ مجسم اخلاق بن کر بولیں۔

"نہیں آج تو..." اچانک ان کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔ "ایک گلاس پانی مل سکے گا؟"

"ارے کریمن بوا! ذرا ایک گلاس شربت تو لے آنا"

"نہیں نہیں تکلیف نہ کیجئے۔ ابھی ابھی کھانا کھایا ہے۔ بس پانی پلوا دیجئے"

"اس میں تکلف کی کیا بات ہے..."

"نہیں صرف پانی ــــ اصل میں آج تو میں ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ کسی دن آرام سے آئی تو ایک نہیں دو گلاس پلا دیجئے گا"

پانی پی کر مالتی شرما نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور یہ اطمینان کر کے کہ آس پاس کوئی نہیں ہے، دھیرے سے بولیں۔

"...ان کیسی گئی ہوئی ہیں۔؟"

"...ہاں! ریکر اور نفیسہ پڑوس میں کھیل رہی ہیں۔" شکیلہ اور ریحانہ کا ... ہے:

"آپ کے بس یہی تین بچے ہیں؟"

"ہاں بہن! لڑکے کی ہم دونوں کو بہت خواہش تھی، لیکن جو خدا کی مرضی۔ میں تو یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ خوش اور تندرست رکھے تو ہمارے دل کو سکون رہے۔"

مسز ثریا کچھ دیر خاموش رہیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا دماغ کسی زبردست کشمکش میں پھنسا ہوا ہے۔

"آپ کی ایک اور لڑکی بھی تو تھی — میرا مطلب ہے ایک لڑکی کو کچھ حادثہ پیش آگیا تھا۔؟"

"ہاں بہن!" سلطانہ بیگم کی آنکھیں اچانک چھلک اٹھیں۔ "کیا منحوس دن تھا۔ ایک برات کے ساتھ ہم سب ایک چھوٹے سے قصبے میں گئے ہوئے تھے۔ میں اندر رسموں میں مصروف تھی اور بچے باہر روشنی وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ یوں بھی ریحانہ شکیلہ کے ساتھ تھی، اس لئے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ تو لگ بھگ تین بجے ناچ گانے ختم ہوئے اور رخصتی کا وقت آیا تو بچوں کی تلاش شروع ہوئی۔ شکیلہ تو جلد ہی ایک کونے میں سوتی مل گئی لیکن میری ریحانہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔" ان کے آنسو بہہ نکلے۔ "قریب ہی پانی سے بھری ایک نہر تھی۔ ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو یہی خیال ہوا کہ میری بچی شاید اسی میں ....." ان کی سسکیاں تیز ہونے لگیں۔ مسز ثریا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ جلدی سے انھوں نے سلطانہ بیگم کو پانی لا کر دیا۔ اور چپ چاپ ان کا سر سہلانے لگیں۔

"اس واقعے کو بارہ سال ہو رہے ہیں۔ خدا نے ہمیں دو بیٹیاں اور دیں پھر بھی جس وقت اس کی یاد آجاتی ہے دل تڑپ اٹھتا ہے، لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالتی ہوں کہ خدا کو میری ناشکری پر غصہ نہ آجائے۔ بس اتنا ضرور ہے کہ اس دن کے بعد سے آج تک کسی تقریب میں نہ جا سکی۔ کہیں بھی جانے کا وقت آتا ہے تو دل کانپنے لگتا ہے۔ کسی کے سامنے اس حادثہ کا نام بھی نہیں لیتی۔

کہ کہیں منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو ..... لیکن ....." وہ اچانک ٹھٹھک گئیں۔ "آپ کو اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"کل آپ نے سنا ہوگا محمود صاحب کی لڑکی کی شادی تھی۔ میں بھی اس میں گئی ہوئی تھی۔ وہیں کالا پور سے مراثنیں اور ناچنے والیوں کی ایک ٹولی بھی آئی ہوئی تھی۔" مسز ثریا اٹک اٹک کر بولیں اور پھر کچھ سوچنے لگیں۔

"لیکن اس سے میری ریحانہ سے کیا تعلق۔؟" سلطانہ بیگم جھنجھلا گئیں۔

"ناچ گانے کے بعد دولہا کو اندر بلایا گیا۔ میں بھیڑ بھاڑ سے گھبراتی ہوں اس لئے جب سارا مجمع دولہا کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا تو میں پریشان ہو کر باہر انگنائی میں تنہا بیٹھ گئی۔ اسی وقت ناچنے والیوں میں سے ایک کم سن لڑکی دھیرے سے میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی کہ میں احمد فرید نام کے کسی شخص کو جانتی ہوں۔ میں نے کہا، ہاں۔ وہ پھر کچھ کہنے چلی لیکن ایسا لگا جیسے اس کی آواز ختم ہو گئی ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس طرح مجھے گھور رہی تھی جیسے میں میں نہ ہوں کوئی مافوق الفطرت ہستی ہوں۔ پھر وہ بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ "آپ جانتی ہیں — میرے اللہ تیرا شکر ہے۔" اچانک اس نے چونک کر پوچھا: "ان کی بیوی آئی ہیں۔؟" میں نے بتادیا کہ آپ لوگ کہیں نکلتی ہی نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتی، دو مراثنیں باتیں کرتی ہوئی ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ ان کو آتا دیکھ کر جیسے وہ ہوش میں آگئی۔ میری جانب اس نے فوراً پیٹھ کرلی، اور بظاہر بے تعلق سی ہو کر کانپتی ہوئی آواز میں تقریباً سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "پرسوں رخصتی کے بعد موقع ملے گا۔ مجھے ان کے پاس پہونچا دیجئے، زندگی بھر احسان نہیں بھولوں گی۔" وہ شاید کچھ اور کہتی لیکن دونوں مراثنوں کی نظر اس پر پڑ گئی اور انھوں نے اسے پکار لیا۔ جاتے جاتے اس نے پھر عجب بے چینی سے اپنی درخواست دہرائی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیوں اتنی پریشان ہے۔ میرے پوچھنے پر وہ ایک لمحہ کو پھر میری طرف ... "جی ان کی بیٹی ہوں۔" کہہ کر وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی ...

ے چلی گئی۔ کل پتا چلا پھر مجھے وہاں جانا ہے اس لئے [illegible]
کر لی چلوں۔ آپ کو دیکھا نہیں تھا، اس لئے کچھ تحریک پیدا ہوا، وہ
اس کی صورت آپ سے اتنی ملتی ہے کہ ....."

"ریحانہ میری بچی!" سلطانہ بیگم تڑپ اُٹھیں۔ "مجھے ابھی لے چلئے۔ فوراً لے چلئے۔ ارے میری بچی کو وہ کم بخت اٹھا لے گئے اور میں یہی سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ وہ ڈوب گئی۔ کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہوں گی اس ننھی سی جان نے۔ خدارا دیر نہ کیجئے اُٹھئے جلدی چلئے۔" انھوں نے کھڑے ہوتے ہوئے مالتی کو گھسیٹا۔

"بیٹھئے تو....."

"مجھے کچھ اور نہیں سننا۔ بس فوراً مجھے میری بچی سے ملا دیجئے۔"
ان کے ٹھنڈے برف ہاتھوں کی گرفت مالتی شرما کی کلائی پر سخت ہونے لگی۔

"آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ ذرا سا لیٹ جائیے۔ اور پھر یہ بھی سوچ لیجئے کہ وہ کیسی زندگی ..... میرا مطلب ہے جذبات میں آپ کہیں کوئی ایسی بات نہ کر جائیں جس کی وجہ سے سارے خاندان کی....."

"آپ چلئے تو۔" سلطانہ بیگم نے پھر بات کاٹی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"لیکن اس وقت تو وہ لوگ نہ جانے کہاں ہوں گی۔ محمود صاحب کے یہاں رخصتی کے وقت آئیں گی۔ آپ ابھی آرام کر لیجئے۔ صبح میں آ کر آپ کو لے جاؤں گی۔ اطمینان سے مل لیجئے گا۔" یہ کہتی ہوئی مالتی شرما اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔

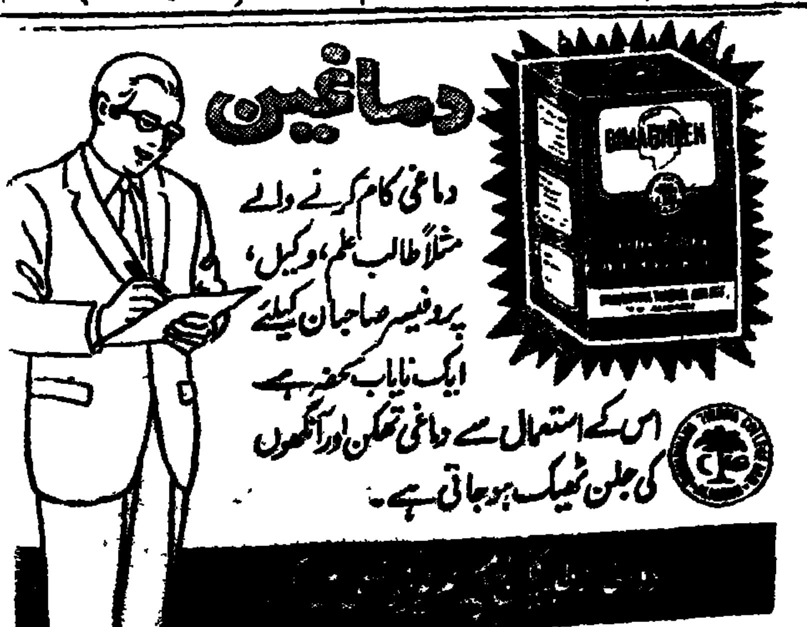
رات کے دو بج چکے تھے۔ سارا گھر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا لیکن سلطانہ بیگم کی آنکھوں میں نہ نیند تھی اور نہ ہی انھیں اس کا انتظار تھا۔ وہ تو بے چینی سے اس سورج کی منتظر تھیں جس کی روشنی میں وہ اپنی برسوں سے بچھڑی ہوئی اولاد کو کلیجے سے لگا سکیں گی۔ ریحانہ کو اچانک گھر لا کر وہ سب کو حیران کر دینا چاہتی تھیں اس لئے انھوں نے اب تک کسی سے اس [illegible] نہیں
کیا تھا۔ ان کے چہرے سے پھوٹتی ہوئی مسرت کو دیکھ کر سب بچے حیرت زدہ تھے بلکہ فرید صاحب نے تو ایک بار چھیڑا بھی کہ معلوم ہوتا ہے قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔ اب کل پوچھوں گی کہ میرے خزانے کے آگے قارون کے خزانے کی کیا حقیقت ہے! بچے پاگل ہو جائیں گے خوشی کے مارے۔ انھوں نے اٹھ کر گھڑی دیکھی اور پھر جھنجھلا کر رکھ دی۔ نہ جانے رات اس قدر دھیرے دھیرے کیوں سرک رہی تھی۔ تین تک نہیں بجے تھے!

وہ تھی بھی کتنی خوبصورت۔ سب ہی کہتے تھے کہ بڑھ کر بالکل ماں نکلے گی اسی لئے تو فرید صاحب ہمیشہ اسے ملکۂ عالم کہہ کر پکارتے تھے۔ بارہ سال کا طویل عرصہ سلطانہ بیگم کی نظروں کے سامنے پھر رہا تھا۔ بچی کا غم بھولنے کے لئے ان لوگوں نے کیا کیا جتن کئے تھے۔ سب سے پہلے تو فرید صاحب نے وہ گھر اور وہ شہر چھوڑ دیا تھا جس کا ہر کونا انھیں بیٹی کی یاد دلاتا تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ دونوں نے ریحانہ کا ذکر نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ اور تو اور شکیلہ بھی کبھی بہن کا نام نہیں لیتی تھی۔ رئیسہ اور نفیسہ تو اس کے نام تک سے ناواقف تھیں۔ اب کل اچانک ایسی اچھی سی بہن دیکھ کر انھیں کیسا لگے گا! اور رئیسہ کو تو یوں بھی بے تکان سوالات کرنے کی عادت ہے۔ سوال کر کر کے تو وہ ریحانہ کو پریشان کر ڈالے گی۔ کہاں تھیں؟ کیا کرتی تھیں؟—

اور اچانک سلطانہ بیگم کا دماغ سن سے ہو گیا۔ کہاں تھیں؟ کیا کرتی تھیں؟ —— دور کہیں گھنٹہ گھر نے تین بجنے کا اعلان کیا۔ لیکن وہ اسی طرح ساکت پڑی رہیں۔ ان کے ذہن میں صرف ایک صدا بازگشت لگا رہی تھی —— کہاں تھیں؟ کیا کرتی تھیں؟ —— یہ سوال تو سب ہی کریں گے —— وہ کیا جواب دے گی —— میں مراثنوں کی ٹولی میں ناچتی تھی —— اور پھر ان کے خاندان کا کیا ہوگا۔ ایک ناچنے والی لڑکی کے باپ کی حیثیت سے فرید صاحب سماج میں کتنی دیر سر اٹھا کر رہ سکیں گے۔ کون اس سے یا ان لڑکیوں سے شادی کرنے پر تیار ہوگا جن کے ساتھ ایک ناچنے والی بہن کا نام بھی برابر لیا جائیگا
بے چین ہو کر انھوں نے پلنگ چھوڑ دیا۔ ایک طرف ان کی اولاد تھی جو ان کی تلاش میں دربدر ٹھوکریں کھاتی ایسی ذلت کی زندگی گزار رہی تھی۔

دوسری طرف انکا خاندان تھا، عزت تھی، خوشیاں تھیں، مستقبل تھا۔ انکے کانوں میں عاشق شرما کی آواز گونجی ــــ جذبات میں کہیں آپ کوئی ایسی بات نہ کر جائیں جسکی وجہ سے سارے خاندان ــــ کانپتے ہاتھوں کو بڑھا کر انھوں نے تکیے کا سہارا لیا اور اس پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔

بہت دن پہلے۔ تقریباً چودہ سال قبل ــ اسی طرح ناقابل برداشت گھٹن سے مجبور ہو کر اندھیری رات میں وہ اپنے کمرے کی چوکھٹ پر سر ٹکائے کھڑی تھیں۔ ریحانہ بخار میں بھن رہی تھی۔ سب مایوس ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور انھوں نے کہہ دیا تھا کہ رات بخیریت گذر گئی تو شاید تھوڑی سی امید پیدا ہو۔ لیکن جیسے جیسے رات بیت رہی تھی۔ بچی کی الجھن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور جب ایک لمحہ ایسا آیا کہ معلوم ہوا اس کا دم اکھڑ رہا ہے تو فرید صاحب کو وہیں چھوڑ کر انھوں نے اسی طرح چوکھٹ پر ماتھا ٹیک دیا تھا۔ یکایک قریب کی مسجد سے اذان کی آواز سن کر وہ چونک پڑیں ــــ صبح ہو گئی تھی ـــ لیکن یہ صبح اس صبح سے کتنی مختلف تھی جب لڑکی نے آنکھیں کھولی تھیں اور مسکرا کر انکی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے تھے



تبصرے

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں

- قدیم ادبی تنقید ــــ ایک جائزہ
- مصنف :- وہاب اشرفی
- قیمت :- چھ روپیے
- ملنے کا پتہ :- کول اکیڈمی ۔ گیا ۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی کتاب ' قدیم ادبی تنقید' قدیم یونان اور روم کے پانچ مشہور نقادوں کا تنقیدی جائزہ ہے۔ یہ پانچ نقاد ہیں ۔ افلاطون، ارسطو، ہوریس، کوئن ٹیلین اور لان جائی نس، افلاطون اور ارسطو پر ان کے خیالات تقریباً باسٹھ صفحات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بقیہ چونتیس صفحے میں ہوریس، کوئن ٹیلین اور لان جائی نس کے تنقیدی کارناموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اشرفی نے دیباچہ میں لکھا ہے " قدیم ادبی تنقید پانچ قدیم مغربی نقادوں کا تعارف اور ان کی نگارشات کا تنقیدی جائزہ ہے۔

تعارف پیش کرنے میں وہاب اشرفی نے تاریخ گردانی سے کام لیا ہے، اس لئے ان نقادوں کی زندگی کے خاکے جامد ہو کر رہ گئے ہیں کسی کی زندگی کے بارے میں پیدائش سے لے کر وفات تک کا تو یہی انداز نظر بچوں کے لیے تو درست معلوم ہوتا ہے مگر بڑوں کو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ یہ انداز نظر نصابی اور طالب علمانہ ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ کسی بنیادی نقطۂ نظر کی عدم موجودگی دیدۂ بینا محدود دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیتی ۔ قدیم ادبی تنقید کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور نئی دنیا کے لئے نشانِ راہ بھی۔ افلاطون اور ارسطو وغیرہ اسی لیے اپنی قدامت کے باوجود آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے ادبی تنقید کی دنیا میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔ خاص طور پر جب ہم افلاطون اور ارسطو کی تنقیدی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان عظیم ہستیوں کی ادبی حیثیت کو پرکھنا آسان نہیں۔ دونوں اتنے مختلف النوع علوم پر حاوی ہیں کہ ان سے واقفیت کے بغیر ان کا تجزیہ آسان نہیں۔ انھیں فلسفہ سے بھی براہ راست تعلق تھا اور ریاست کے تصور سے بھی۔ فلسفہ اور ریاست کے بطن ہی سے ان دونوں کے ادبی کارنامے سامنے آئے ہیں۔ لہٰذا افلاطون اور ارسطو پر قلم اٹھاتے ہوئے ان دونوں پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

افلاطون اپنے عہد کی بڑی رنگا رنگ شخصیت تھی۔ سقراط کی صحبت نے اس کے اندر فلسفہ کی زبردست نگاہی پیدا کی۔ افلاطون تندرست و توانا اور بہادر تھا۔ افلاطون چوڑے شانے والے کو کہا جاتا ہے۔ یہ لقب آج کے کس نقاد کو دیا جا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ افلاطون، سقراط کے اس شاگرد، کریشیاز کا بھتیجا تھا جس نے ایتھنس میں جمہوریت کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور اپنی قوم کی آمرانہ انداز سے رہبری کرتا رہا تھا۔ پھر افلاطون نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس کا یہ چچا کس طرح جمہوریت کے عذاب کا شکار ہوا اور مارا گیا اور آخر کش جمہور کے خلاف اس کا جذبہ اس وقت سے ایک مزاج بن گیا جب کہ عوام کے ہجوم نے سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حیات و کائنات کو خالص انفرادی اعمال کی روشنی میں پرکھنے لگا اور بہترین اور ذہین کو حکومت کا حقدار سمجھنے پر آمادہ ہو گیا۔ گویا افلاطون کی زندگی کے چند خاص حادثے اس کے فلسفے کی بنیاد ہیں جن پر وہ ہر جگہ اور ہر لمحہ کاربند رہتا ہے۔ افلاطون کی زندگی کا جو تعارف ڈاکٹر وہاب نے لکھا ہے وہ ان تمام باتوں کی نشاندہی نہیں کرتا۔ افلاطون کے بارہ برس تک مختلف ملکوں گھومنے پھرنے کو صرف سرسری طور پر دیکھتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲) حالانکہ مصر کے علمائے فراعین جس طرح یونان کو سیاسی لحاظ سے طفل مکتب سمجھتے تھے اور انھیں

[illegible]میں لگاتے تھے، انکا بھی اثر افلاطون نے قبول کیا اور اسکی نمایاں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے بارکر کی کتاب گریک پولیٹیکل تھیوری) ان ممالک کی سیر نے افلاطون کے ذہنی افق کو وسیع تر کیا اور نظری طریقے پر وہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ قوموں کے زوال کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ چونکہ ان کے اعمال و افکار میں زوال شروع ہو چکا ہے اس لئے افلاطون کو نہ صرف شعرا بلکہ مصلح اور پیغمبر بھی زوال پذیر دکھائی دے رہے تھے۔ (ریاست ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین)

غور کیجیے کہ افلاطون جو خود مذہبی بھی ہے اور مصلح بھی۔ اور جو فنکار بھی رہ چکا ہے اور پھر یہ کہ ادبی تخلیق کتنی ہی کم تر درجے کی کیوں نہ ہو، اس کے مکالمے میں تشبیہہ و استعارہ کی تخلیقی ندرت بھی موجود ہے، کتنی رنگا رنگ شخصیت ہوگی ایسے افلاطون کی مگر ڈاکٹر وہاب نے ایسی بھرپور شخصیت کا ذکر صرف ۱۱ صفحوں میں کیا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہاب اشرفی نے جان بوجھ کر یہ تقویمی رویہ اپنایا ہے۔ ورنہ افلاطون کے بارے میں تو یہ معلومات اب عام ہو گئی ہیں۔ یقیناً ڈاکٹر اشرفی شخصیت کو سماجی پس منظر میں دیکھنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ انھیں ایسی باتیں بیکار معلوم ہوتی ہیں۔ وہ افلاطون کو ریاست کی دسویں کتاب میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں اسکی بقیہ پہلی نو کتابوں سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ اس سماجی پس منظر کے بغیر افلاطون کا نظریۂ نقل حکیمانہ طریقے پر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ افلاطون کا جذباتی ردِ عمل وقت کے کرلے کوس میں پھلتا پھولتا ہو اور عمر کی دھوپ چھاؤں سے گزر کر پختہ تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی عینیت پرستی مکمل فلسفہ بنجاتی ہے۔ انہوں نے اپنے من کی موج میں اس کتاب کا وہی حصہ نقل کیا ہے جو ان کی طبیعت سے مناسبت رکھتا ہے۔ ورنہ وہ گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو بعض اور باتیں بھی انکی نظر کے سامنے آجاتیں۔ (یہاں پر جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہہ دینا ضروری ہو کہ

وہاب اشرفی نے اپنی اس کتاب میں افلاطون کا جو مکالمہ صفحہ ۲ سے صفحہ ۱۱ تک لکھا ہے، وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ترجمہ کی ہوئی کتاب ریاست سے ہو بہو نقل کر دیا گیا ہے۔ (دیکھیے ریاست صفحہ ۳۹۶ سے ۴۰۱ تک، یہ کتاب ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۹۱ء میں دوسری بار چھاپی ہے)

شاعری سے متعلق افلاطون کے خیالات کا تجزیہ اس کتاب میں 'افلاطون۔ شاعری' کے ذیلی عنوان سے کیا گیا ہے۔ انہوں نے افلاطون کے نظریہ شاعری کی پانچ خاص باتیں نوٹ کی ہیں۔ ۱۔ شاعری، نقل کی نقل ہے ۲۔ شاعر خیر پر شر کو فوقیت دیتا ہے یا کم سے کم برابر کر دیتا ہے ۳۔ شاعری فکر کو جذبے کا غلام بنا دیتی ہے ۴۔ شاعری وجدانی فعل ہے اور شاعر کے قبضے نکل ہوئی ہے ۵۔ شاعری کبھی پیغمبری ہے کبھی جنون۔ پانچویں بات افلاطون کے اس بیان سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے۔ متذکرہ حوالے سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر ایک جادوگر ہے جو اپنے سامنے اچھا خاصہ مجمع لگا لیتا ہے۔ پیغمبری کی اصطلاح یہاں پر موضوع نہیں۔ ہاں وجد کے جنونی عمل سے پاگل پن کی بات تو تسلیم کی جا سکتی ہے مگر مقناطیسی کی مثال سے پیغمبری کی ارفع اصطلاح افلاطون کے نظریۂ شاعری کے پورے پس منظر میں کسی طرح مناسب نہیں۔

یہاں چند مزید اہم باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ مثلاً افلاطون شاعری کو ایسی نقل سمجھتا ہے جو جاہلوں کو تو اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر عالموں کو نہیں۔ [illegible] یہاں بھی وہ فن ایک مہذب ترین اعلیٰ انفرادی فعل سمجھتا ہے اور اجتماعیت سے اس کا قرب افلاطون کو اکھرتا ہے۔ "یہ (شاعر) ایسی چیزوں کی نقل کریں گے جو جاہل انبوہ کو اچھی معلوم ہوتی ہیں" (ریاست ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین صفحہ ۴۰۷)

'شاعری نقل کی نقل ہے'، اسکی مفصل کیفیت سے وہاب اشرفی نے گریز کیا ہے حالانکہ نقل در نقل کے فلسفہ میں افلاطون دراصل تجزیہ و مشاہدہ [illegible] کرتا ہے۔ یہ درست

ہے کہ نظریۂ نقل افلاطون کے الہیاتی تصور کا سراب ہے پھر بھی غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظامِ فکر میں تجربہ و مشاہدہ کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ افلاطون کہتا ہے۔

"پھر ہم یہ نتیجہ کیوں نہ نکالیں کہ یہ سارے کے سارے شاعر ہومر سے لے کر اب تک محض نقال ہیں، یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس کی نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتے۔ شاعر کی مثال اس مصور کی سی ہے جو چمار کی تصویر بنا ڈالتا ہے حالانکہ اس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویر بس ان کے لئے ٹھیک ہے جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صورت دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔"
(ریاست ص ۴۰۴)

کیا افلاطون کے یہ جملے تجربہ و مشاہدہ کے فنی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں؟ کیا افلاطون شاعر سے بہتر علمِ حیات کا خواہاں نہیں ہے؟ اور کیا وہ اپنی فکری نہج میں شعرا کو عالم الغیب نہیں متصور کرتا؟ اور کیا عالم الغیب کی اہمیت الوہی نہیں ہے اور پھر کیا افلاطون اپنے شعرا کو مثالی نہیں دیکھنا چاہتا۔؟؟ اس طرح اہم بات یہ ہے کہ افلاطون اپنے فنکاروں سے دراصل خونِ جگر کا تقاضہ کر رہا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے تنقیدی رویہ میں انتہا سے زیادہ مثالی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر وہاب نے اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔

ڈاکٹر وہاب نے پانچویں بات بھی ادھورے طور پر کہی ہے۔ جہاں وہ شاعر کو جنونی یا ساحر کہتا ہے وہیں وہ ہیئت پرستی کا بھی مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ شعرا محض لفظ و وزن و بحر کے غنائی پہلو سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو متاثر کر دیتے ہیں ورنہ ان کی باتوں میں وزن نہیں ہوتا اور نہ گہرائی ہوتی ہے۔ وہ اگر اسی بات کو نثر میں بیان کریں تو قطعی بے اثر ہوگی (ریاست ص ۴۰۴) افلاطون اس کی وضاحت آگے چل کر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نقل سے اشیا کا محض خارجی علم ہوتا ہے اور شاعری میں خارجی علم ناکافی ہے۔ کیا یہ بات اہم نہیں کہ وہ پہلی بار ادب میں مواد پر زور دے رہا ہے اور مواد کے اندر کھرے پن کو اہم سمجھتا ہے۔

دراصل افلاطون کو پورے پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ مواد یا معنی کی اصطلاحی صورتِ حال سے بھی وہاب اشرفی کو دھوکا ہوا ہے۔ افلاطون طبقۂ امرا سے تعلق رکھتا تھا۔ مصر کے سفر نے اُسے تقسیمِ محنت کے سائنٹفک نظام سے روشناس کیا تھا۔ اس لیے ریاست کا نظام وہ برتر نسل پرستی پر قائم کرنا چاہتا تھا۔ خوبصورت کو خوبصورت سے ملاؤ۔ تندرست کو تندرست سے ملاؤ۔ اونچے کو اونچے سے ملاؤ اور اسی طرح نیچے کو نیچ سے ملاؤ تاکہ بہتر نسل کا سلسلہ جاری رہے اور مکمل اور معظم شے وجود میں آتی رہے اور اُس میں ملاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔ شعرا کے تخلیقی کارناموں کو وہ چونکہ معمولی فعل سمجھتا ہے اس لیے وہ انھیں اچھوت گردان کر نچلی سطح پر رکھنا چاہتا ہے ———— کہتا ہے۔ "نقالی کا فن نیچ ذات کا فن ہے جو نیچ ذات ہی سے بیاہ کرتا ہے لہذا اولاد بھی نیچ ذات ہی ہوتی ہے۔" (ریاست ۴۰۹) ڈاکٹر موصوف اس نکتے کو نظر انداز کر گئے اسی لئے وہ افلاطون کو ادب برائے زندگی کا قائل سمجھنے لگے۔ (دیکھئے "قدیم ادبی تنقید" ص ۱۲) افلاطون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی الجھنوں کا شکار رہا ہے۔ وہ بیک وقت الہیاتی نظام کا پرستار بھی ہے اور ریاست کا ایک مادی تصور بھی رکھتا ہے۔ اس کی کوشش یہی ہے کہ وہ ان دونوں میں حسین رشتہ قائم کر کے معقولیت پسندی کا بھرم رکھ سکے۔ اس طرح بہتر تنقیدی زبان میں ہم افلاطون کو معروضی عینیت پرست کہہ سکتے ہیں۔ ادب برائے زندگی کا علمبردار کہنے سے اچھا خاصہ ابہام پیدا ہوتا ہے اور غلط فہمی بھی۔ تنقید کی زبان ٹھوس ہونی چاہیئے۔ وہاب اشرفی یہاں بھی محتاط نہ رہ سکے ہیں۔

افلاطون کے سلسلے میں مجھے آخری بات یہ کہنی ہے کہ شاعری سے متعلق افلاطون نے اپنے خیالات اپنی مثالی ریاست

کی تشکیل کے پس منظر میں ظاہر کئے ہیں جہاں وہ ایسی نسل تیار کرنا چاہتا ہے جو ہر طرح ارفع اور اعلیٰ ہو (دیکھئے این۔ داس گپتا کی کتاب پلیٹو ایٹ ص ۱۱) وہ نہیں پسند کرتا کہ دس برس تک کی عمر والے بچوں کے سامنے تخلیق کے ایسے نمونے پیش کئے جائیں جو قادر مطلق کی نقل ہوں۔ افلاطون تخلیق کو صفت ازل سمجھتا ہے جس کی اپنی حیثیت کُل ہے۔ چونکہ حیات و کائنات کے اس تصور میں مجاز و حقیقت کا فلسفہ پوشیدہ ہے اس لئے وہ حیات و کائنات کو مجاز سمجھتا ہے اور حقیقت ازل کو ابدی۔ لہذا بچوں کی نشو ونما میں وہ کسی قسم کے مجاری عنصر کو داخل کرنا نہیں چاہتا۔ شاید وہاب اشرفی افلاطون کے اس نقطۂ نظر سے واقف ہوں کہ جب وہ خالص فلسفیانہ انداز میں حقیقت و مجاز کو پرکھتا ہے تو آدمی بھی اُسے سایہ نظر آتا ہے ـــــــ چونکہ افلاطون آدمی کو نہیں بلکہ آدمیت کو حقیقت سمجھتا ہے۔ یعنی مادہ کچھ نہیں جو کچھ ہے اس کی صنعت ہے جو کہیں خلا سے اُترتی ہے اور جسے افلاطون کلُ کہتا ہے۔ افلاطون کی آدمیت کی حقیقت اصل میں اس کی خارجی عینیت پرستی ہے۔ یہ آدمیت نہ آدمی میں ہے نہ زمین میں بلکہ پورے آفاق کی روح ہے۔ اس طرح ہم افلاطون کے فلسفے کے اس بنیادی پہلو کو سمجھے بغیر اس کے نظام شعری کو نہیں سمجھ سکتے۔

ارسطو، افلاطون کی طرح عینیت پرست نہیں۔ وہ کائنات کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ آدمی کی صنعت کو وہ آدمی سے مختص کرتا ہے۔ وہ عالم مثال میں نہیں رہتا۔ وہ تخئیل کو مجرد اور اوپر سے ٹپکی ہوئی شے نہیں سمجھتا۔ اسی لئے وہ حیات و کائنات کو عالم اسباب مانتا ہے اور شاعر کی تخلیقی قوتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ لہذا ارسطو کو کسی طرح ادب برائے ادب کا نقیب اول نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر موصوف نے ارسطو کو ادب برائے ادب کا نقیب اول تسلیم کیا ہے (دیکھئے قدیم ادبی تنقید ص ۲۷) جب ارسطو فن کو بغیر سبب نہیں تسلیم کرتا تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادب کو زندگی کی نامیات سے جدا کرنے کے حق میں ہے۔ یہاں بھی وہاب اشرفی کی تنقیدی نظر چوک گئی ہے اور وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اور خواہ مخواہ ارسطو کو ادب برائے ادب کے نظریہ کا بانی سمجھنے لگے ہیں۔

ارسطو طبیب تھا، طبابت اُسے ورثے میں ملی تھی۔ اسی لئے اس کا ذہن فلسفیانہ سے زیادہ سائنسی تھا۔ اس کے مزاج میں ہنگامہ خیزی تھی۔ اس کے پڑھنے پڑھانے کا مشائی انداز اس بات کی پوری غمازی کرتا ہے۔ ارسطو مادہ اور ہیئت کو اپنی اپنی جگہ پر ابدی حقیقت مانتا ہے۔ اس کے مطابق مادہ اپنی بنیادی فطرت میں کثیف ہے مگر یہ لطیف ہونے کے لئے بےچین رہتا ہے اور اسی لئے یہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے ہیئت کی قربت چاہتا ہے۔ ہیئت یا فارم اپنی بنیادی فطرت میں لطیف ہے لیکن فارم کی کوئی آخری شکل نہیں یہ لامحدود ہے۔ گویا مادہ کا سفر جاری ہے فارم کی منزل تک پہنچنے کے لئے جبکہ فارم کی کوئی منزل نہیں۔ اس طرح ارسطو اپنا جمالیاتی تصور یوں قائم کرتا ہے کہ مادّے کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ ہیئت یا فارم میں ضم ہو جائے اور فارم چونکہ تمثالی ہے اور لامحدود ہے اس لئے تکمیل کی کمی کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس طرح ارسطو بغیر مادہ کے عالم یا اشیا کا تصور ہی نہیں رکھتا۔ یہی سبب ہے کہ وہ المیہ کو نقل تو کہتا ہے مگر ہستی کی نقل نہیں بلکہ عمل اور زندگی کی۔ اس کے الفاظ ہیں۔ "المیہ، ہستی کی نقل نہیں بلکہ عمل اور زندگی کی، غم اور خوشی کی نقل ہے"۔ (ارسٹوٹل آن دی آرٹ آف پوئٹری ترجمہ (انگریزی) وائرس ص ۳۷) اس جملے کے لیے گہرے تنقیدی وژن کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عمل کردار ہے اور زندگی واقعہ اور غم اور خوشی ان دونوں کے امکانات۔ اس طرح جہاں کہیں بھی امکانات کی بات آئی ہے وہاں مادہ کے ہیئتی امکان کا گمان ہو جاتا ہے کیونکہ ارسطو مادہ کو فارم کی ممکنات سمجھتا ہے

اب یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ارسطو فارم کو شکل نہیں بلکہ تشکیلی قوت تسلیم کرتا ہے۔ جو مادہ کو اپنی داخلی ضرورت کی تحریک سے ایک خاص شکل میں ڈھال دیتی ہے۔ گویا ارسطو مادہ کی زبردست جبلی قوت سے انکار نہیں کرتا۔ بلکہ اس طرح

ارسطو کے شعری نظریات کو خالص جمالیاتی کہا جا سکتا ہے۔ اس بحث کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کا ایک جملہ ملاحظہ ہو۔ "ارسطو انبساط پر اتنا زور دیتا ہے کہ اس سے ادب برائے ادب کی نیو پڑ جاتی ہے" (قدیم ادبی تنقید ص ۲۷)

ارسطو نے بوطیقا کے چوتھے باب میں نقل کی فطرت پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ نقل کرنا انسان کی فطرت ہو وہ بچپن ہی سے اس کا عادی ہے۔ چونکہ انسان تمام مخلوقات میں افضل ہے اس لئے نقل کی صلاحیت اس میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا ہو کہ نقل کی فطرت اُسے خوش بھی کرتی ہو۔ وہاب اشرفی نے چوتھے باب کے اس حصّے کو اچھی طرح نہیں پڑھا ورنہ انھیں پوری بات کا اندازہ ہو جاتا۔ اسی باب میں آگے چل کر ارسطو انسان کی فطرتِ نقل کو حصولِ علم بتاتا ہو اور کہتا ہے کہ اسے کچھ جان کر بھی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ علم حاصل کرنے اور جاننے کے اس عمل سے صرف فلسفیوں کو واسطہ نہیں بلکہ اس سے تمام انسانوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ ذہن پر تھوڑا سا زور دینے سے ارسطو کی بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ نقل کی لذت اور اس نقل سے حاصل شدہ انبساط دراصل تخلیقی ہے۔ اُسے خوشی اسلئے ہوتی ہو کہ وہ نقل کرکے کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نقل سے لذت اس لئے ملتی ہے کہ انسان اس طرح حیات و کائنات میں رنگ بھر دیتا ہے جس سے پوری کائنات حسین ہو جاتی ہے۔ ارسطو کا نظریۂ شاعری اسی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے ارسطو کے نزدیک چونکہ خدا تمام ہیئتوں کی ایک ہیئت ہے اور وہ تمام آرزوؤں سے بری ہے اس لئے وہ ایسا حکمراں ہے جو حکومت تو کرتا ہے مگر حکومت چلاتا نہیں۔ اس لئے نقل کی شکل جب ارسطو کے یہاں ابھرتی ہے تو وہ کائنات کو حسین بنانا چاہتا ہے۔

ارسطو کے نظریۂ شاعری میں نقل یا تخلیق کی لذت کا صحیح تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ نشاط کی یہ کیفیت "در حقیقت ارسطو شاعر ہی نہیں بلکہ قاری میں پیدا ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔" ارسطو کا نظریۂ نشاط (شاعری کے سلسلے میں) یہ ہو کہ

"...کی قدر کا احساس نہیں بلکہ سامع یا قاری کی خوشی ... ں رہتا ہے ... فن کی مسرتیں فنکار کے لئے نہیں بلکہ ان کے لئے ہیں جو اس فن سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اور اگر فن کار کو خوشی محسوس ہوتی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ یہ خوشی بحیثیت فنکار حاصل کر رہا ہے بلکہ اُسے یہ خوشی ایک قاری یا سامع کی طرح ہی محسوس ہوتی ہے۔" (ارسٹوٹلس تھیوری آف پوئٹری اینڈ فائن آرٹ از ایس ایچ بوچر ص ۲۰۷)

دوسروں کو خوشیاں عطا کرنا حیات و کائنات کو حسین بنانے کے مترادف ہے۔ اصل میں نقطۂ نظر کی بنیادی کمی اور علم موجود حقائق کو سمجھنے کی راہ میں حائل ہے۔ ارسطو کا جمالیاتی تصور بھی زندگی بداماں ہے۔ کیا ارسطو کے علم و فن سے واقف حضرات اتنی سی بات نہیں جانتے کہ ہیئت یا فارم کی آخری تشکیل جب کردار کے اظہار میں ہوتی ہے تو اسے وہ جمالیات کا نام دیتا ہے۔ مقصد دونوں کا ایک ہے یعنی حیات کو آفاق میں پرکھ کر کندن بنانا اور کندن بنانے کا ہر تصور انتہائی با مقصد ہے۔

اب آئیے اُن نقادوں کی طرف جو افلاطون اور ارسطو کے تقریباً دو ڈھائی صدی بعد سامنے آئے یعنی ہوریس، کوئن ٹلین اور لان جائی نس۔ یہ ناقدین ایسے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جن میں یونانی زوال کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اس دوران ارسطو کے تنقیدی نظریات پر تو کوئی اضافہ نہ ہوا البتہ صنائع اور بدائع کی اہمیت بڑھتی گئی۔ یونانی سیاست کے زوال کے بعد یونانی ادب بھی زوال پذیر ہو گیا تھا۔ نئی قومیں اُبھر رہی تھیں۔ اُن میں سلطنتِ روم کی عظمت روز افزوں تھی۔ ادب میں بھی یونان کے بجائے روم کا سکّہ چلنے لگا تھا۔ ورجل کی شاعری نے رومی ادب کو ممتاز بنا دیا تھا۔ گویا ان تینوں نقادوں کا عہد وہ درمیانی کڑی ہے جس میں بغاوت کے آثار تو پیدا ہونے لگے تھے مگر روایت کا آفتاب بھی غروب ہوا تھا۔ ہوریس کا معیارِ فن اسکی پوری طرح غمازی کرتا ہے۔ ہوریس کے فکر و فن کے دو عہد ہیں۔ ایک نوجوانی کا زمانہ اور دوسرا وہ جب اس کی عمر پختہ ہوتی ہے اور اُس کی ملاقات ورجل سے ہوتی ہے۔ اُس کا پہلا عہد بڑا

جنون خیز ہے۔ وہ بہادری کی قدر کرتا ہے اور اپنی پہلی کتاب سٹائرس میں اپنے عہد کے سماجی حالات اور اشخاص پر بھرپور طنز کرتا ہے۔ یہاں اُس کا فن خارجی معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب اس پر سنجیدگی طاری ہوتی ہے اور حیات و کائنات کی وسیع دنیا پر اُسکی نظر فلسفیانہ طور پر پڑنے لگتی ہے تو وہ خودگری و خودنگری میں مگن ہو جاتا ہے۔ اُس کا اپنا وطیرہ بنجاتا ہے کہ دنیا کو اپنے افکار و خیالات کا غلام بناؤ مگر اپنی ذات کے مالک ضرور بن جاؤ۔ جب اس قسم کا احساس اُس کے اندر پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے قاری کی اہمیت سمجھ جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ رہ کر باتیں کرتا جائے۔ دوست کی طرح، ناصح کی مانند نہیں۔ اسی لئے اسکی شخصیت مرنجاں مرنج ہو گئی تھی۔ وہ بیک وقت ابقری بھی تھا اور اشراقی بھی۔ گویا وہ اپنے آرٹ میں دوست بھی ہے اور اندر اندر معلم اخلاق بھی مگر اسکی ایک کیفیت اور بھی ہے کہ وہ اپنے اوڈس (odes) کو شاعرانہ لحاظ سے اہم سمجھتا ہے۔ ہوریس خیالات میں کتنا ہی پرانا ہو، اظہار اور طرز میں نیا لگتا ہے۔

قدیم یونان اور قدیم روم کے عہد بہ عہد مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوریس وہ نقطۂ انقطاع ہے جہاں سے شعر و ادب کی تفہیم کے نئے باب کھلنے شروع ہوتے ہیں اور پھر تنقید کی دنیا میں کونجائنس اور لان جائی نس پیدا ہو جاتے ہیں۔ کونجائنس کے سلسلے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی کے خیالات واضح ہیں۔ چونکہ وہ جدیدیت کے مریض رجحان کے پرستار ہیں اس لئے وہ تقابلی تنقید کو تیسرے درجے پر رکھتے ہیں۔ مغربی ادب میں کونجائنس تقابلی تنقید کا باوا آدم ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ شاید پہلا نقاد ہے جو نثر کو بھی ادب کی ایک باضابطہ شاخ سمجھتا ہے اور اُسے شعر گوئی کے ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اسلوب کو مواد پر فوقیت دیتا ہے۔

وہاب اشرفی جانتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کا ایک بہترین مقرر تھا۔ بہترین مقرر زبان کی کاٹ کا قائل ہوتا ہے۔ وہ پر معنی مواد سے زیادہ خوش رنگ آواز پر بھروسہ رکھتا ہے کیونکہ ڈیلین

اگر اسلوب پر زور دیتا ہے تو اسی فطری کمزوری کی وجہ سے اسکی اہمیت اسلوب کی وجہ سے نہیں ہے، اس کی اہمیت تقابلی تنقید اور نثر کی اہمیت کے احساس سے ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ارسطو کے بعد یورپ کے ان ممالک میں اسلوب پر ہی سارا زور صرف کیا جاتا تھا اور معنی سے زیادہ صورت پر نگاہ رہتی تھی۔ اس طرح اگر کونجائنس کی عظمت کا راز اسلوب کی اہمیت میں تلاش کیا گیا تو یہ دراصل یونان و روما کے ادب و شعر کے زوال کی تلاش ہوگی۔ وہاب اشرفی نے کونجائنس کی تنقیدی اہمیت کو اپنی تحریر سے خفیف اور سبک بنا دیا ہے۔

مصنف نے شاید سہواً لکھا ہے: "اُسے (کونجائنس) احساس تھا کہ لاطینی زبان کے مقابلے میں یونانی زبان محدود اور کمزور ہے (قدیم ادبی تنقید ص ۸۳)۔ ورنہ بات بالکل برعکس ہے۔ کونجائنس کے نزدیک یونانی زبان محدود اور کمزور نہیں بلکہ یونانی زبان کے مقابلے میں لاطینی زبان کمزور اور محدود ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا زیر بحث آخری نقاد لان جائی نس ہے۔ یہ وہ مشہور نقاد ہے جس نے تنقید کی دنیا میں کچھ انوکھے خیالات ظاہر کئے۔ جس کی وجہ سے ایک بڑا حلقہ اُسے رومانی نقاد سمجھنے لگا ہے۔ اس کی مشہور کتاب "آن دی سب لائم" کی پانچ خاص باتیں سب ہی جانتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے ان کا ذکر کیا ہے اور اپنے خاطر خواہ معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لان جائی نس کی پانچ باتوں میں پہلی دو باتوں کا تعلق ادب و شعر کی معروضیت سے ہے اور بقیہ تین باتیں ہیئت سے متعلق ہیں۔ وہ خیال کی عظمت اور جذبے کی شدت کا قائل ہے۔ جذبے کی شدت کی تفصیلیں اس نے اس کتاب میں بیان نہیں کی ہے مگر خیال کی عظمت پر اسکی رائے صاف ہے کہ خیال کی عظمت وہ کردار کی شرافت اور پاکیزگی کے بغیر ممکن الحصول نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں وہاب اشرفی صرف فکر کی انتہائی بلندی کا ذکر کر کے رہ جاتے ہیں۔ کردار کی شرافت کے تصور کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی اور وہ آگے بڑھ گئے۔ یہاں زبان کے تصور کے ساتھ سزا اور معصفا شعور ابھرتا ہے جو سامنے اور شہنشاہی رواج

طبقاتی فرق کے ساتھ پلتا اور بڑھتا ہے۔ کردار کی شرافت اعلیٰ طبقے میں پائی جاتی ہے، نچلا طبقہ زبان کے استعمال کے معاملے میں بھی اور فکر کی پرواز کے سلسلے میں بھی مجہول ہوتا ہے۔ ایسے نظام میں ایسا ہی فلسفہ پروان چڑھتا ہے۔ اعلیٰ کردار اور اعلا خیال — لان جائی نس کے ترفع ([illegible]) کا تصور اس روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے اور تب معلوم ہوتا ہے کہ لان جائی نس کی ساری تنقید افلاطون کی صدائے بازگشت ہے اور وہ کبھی خالص ادبی نقاد نہیں معلوم ہوتا بلکہ اسی فکری نہج میں اعلیٰ سماجی طبقے کی تائید کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تنقید میں رومانی انداز نظر پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مڑ مڑ کر ہومر اور افلاطون کی طرف دیکھنے پر اپنے آپکو مجبور پاتا ہے۔

کلیم الدین احمد صاحب کے پیش لفظ کا آخری جملہ ہے: "عام قارئین، طلبا اور اردو نقادوں کے لیے یہ کتاب ایک اچھی سوغات ہے۔" میں نے جب اس سوغات کو بصد شوق قبول کرنا چاہا، ایک قاری اور ادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے، تو مجھے محسوس ہوا کہ اس جملہ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس سوغات کے بدلے کچھ حقیر نذرانے پیش کر رہا ہوں۔

(۱) قدیم ادبی تنقید کے صفحہ ۲۶ پر یہ جملہ ہے: "یوں تو ارسطو کی نصف درجن کتابوں کے نام لئے جاتے ہیں لیکن پوئٹکس اور ریٹورک کے علاوہ سب کی سب تلف ہو چکی ہیں۔" ڈاکٹر وہاب کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ دی اسٹوری آف فلاسفی میں ول ڈیوران کہتا ہے: "ارسطو کی نگارشات سیکڑوں میں تھیں۔ کچھ مصنفین انھیں چار سو جلدوں پر مشتمل سمجھتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ ہزار کے قریب بتلاتے ہیں لیکن جو کچھ (ارسطو کی) نگارشات بچی ہیں وہ صرف ایک حصہ ہیں۔ پھر بھی یہ حصہ اپنی جگہ ایک کتب خانہ ہے (دی اسٹوری آف فلاسفی صفحہ ۵۵) مزید وضاحت کے لئے ایوری مینس انسائیکلو پیڈیا کے پانچویں ایڈیشن، مطبوعہ ۱۹۶۷ء کے صفحہ ۷۰۴ پر پوری تفصیل دیکھئے جس میں ساری کتابوں کے نام لکھ دیئے گئے ہیں اور جن کی تعداد اٹھائیس ۲۸ ہوتی ہے۔

(۲) ہوریس کے باب میں "آرس پوئٹیکا کی تقسیم" کا ذیلی عنوان دے کر مصنف نے جو باتیں لکھی ہیں وہ ہو بہو بغیر حوالہ کے نقل کر دی گئی ہیں۔ یہ ہو بہو نقل موصوف کی کتاب کے صفحہ ۶۲ سے صفحہ بہتر ۷۲ تک محیط ہے۔ اور جس کتاب سے یہ منقول ہے اس کتاب کا ذکر ڈاکٹر موصوف نے کہیں نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ کتابیات کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں بھی اس کتاب کا نام نہیں ہے۔ یہ کتاب بہت ابتدائی قسم کی ہے اور اس کا نام 'پلیٹو ٹو ایلیٹ' ہے۔ اس کے مصنف ہیں این۔ داس گپتا۔ دیکھئے اس کتاب کے اڑتالیس ۴۸ تا انچاس ۴۹ صفحات۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں کتاب محل الہ آباد سے چھپی ہے۔ اسی لئے ہوریس کے ذکر میں میں نے ڈاکٹر موصوف کی آرا کو نظر انداز کر دیا ہے۔

(۳) ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ارسطو کے مرکزی مثالی کردار پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب میں بوطیقا سے ارسطو کا ایک پیراگراف بطور حوالہ پیش کیا ہے (دیکھئے صفحہ ۳۳) ارسطو کی بوطیقا میں یہ پیراگراف کہیں نہیں ملتا۔ دراصل یہ حصہ جون جونز کی کتاب 'آن ارسٹوٹل اینڈ گریک ٹریجڈی' سے نقل کیا گیا ہے۔ جہاں جون جونز نے انگرام بی واٹر کی مدد سے ان خیالات کو ترتیب دی ہے۔ دیکھئے جون جونز کی مذکورہ کتاب کا صفحہ ۱۹۔ ڈاکٹر موصوف اگر جون جونز کی کتاب کا حوالہ دے دیتے تو ارسطو کی بوطیقا کے متن کی تکذیب نہ ہوتی۔

(۴) ڈاکٹر اشرفی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۲ پر کچھ زیادہ ہی دلیری سے کام لیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس صفحہ پر جن نقادوں، بلے کن لی اور فیر کلو کے اقوال نقل کئے ہیں، وہ دراصل کسی ایک کا قول ہے۔ موصوف نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں مذکورہ نقادوں کے نام منسوب کر دیا ہے۔ اگر گپتا کی اسی کتاب پلیٹو ٹو ایلیٹ کا صفحہ ۹۴ پیرا ایک دیکھ لیا جائے تو نہ صرف موصوف کی نظر کی چوک کا پتہ چل جائے گا بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قارئین پر کتابیات کی لمبی چوڑی فہرست کا رعب ڈالنے کے لیے موصوف کو کتنی بھیانک غلطی کرنی پڑی

موضوع اہم تھا، مواد بھی کافی تھا مگر ڈاکٹر وہاب نے سہل انگاری سے کام لے کر اس کتاب کو انتہائی معمولی بنا دیا

ڈاکٹر افصح ظفر

● دو غنڈے ● مظفر حنفی ● قیمت ۱۴ روپے
● ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ ۳

"دو غنڈے" بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ڈربہ — دیوی کی قرقی، ملا کی دوڑ۔ تشنگی دل کی اور دو غنڈے زیادہ موثر افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ دوسرے افسانے بہت ہی ہلکے افسانے ہیں۔ ان افسانوں کو ہلکا کہنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ان میں کوئی گمبھیر مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ افسانے کافی ڈھیلے ڈھالے بھی ہیں۔ ان میں وہ فنی رکھ رکھاؤ نہیں ہے جو دوسرے افسانوں میں ہے۔

دو افسانے، "ضرب کلیم"، اور "چور کا بھائی"، ایسے افسانے ہیں جو غالباً رسم پوری کرنے کے خاطر لکھے گئے ہیں جنگ اور دوسرے قومی حادثوں کو افسانوں اور ناولوں کی شکل میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ آزادی سے قبل تحریک آزادی سے متعلق اور آزادی کے بعد فسادات پر بہت کچھ لکھا گیا۔ چین کے حملے پر ڈرامے اور افسانے لکھے گئے۔ ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے بڑی احتیاط شرط ہے۔ جہاں افسانہ تاثرات و جذبات کا حقیقی اظہار نہ بن سکے وہاں محنت رائگاں جاتی ہے۔ دل کے تاروں کا مرتعش ہو جانا شرطِ اولین ہے۔ ضرب کلیم، خاصا آدرشوادی افسانہ ہو گیا ہے۔ اس افسانہ میں اثر انگیزی کا فقدان ہے۔

چند سال قبل افسانہ کی ایک نئی تکنیک وجود میں آئی۔ کئی خطوط کو ربط دے کر غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کو بنیاد بنا کر افسانوں کی شکل دی جاتی ہے۔ آخر میں ایک بہت ہی لطیف انداز سے غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسا افسانہ "چور کا بھائی" ہے۔ ایسے افسانے تفننِ طبع کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ افسانہ بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ افسانہ "واپسی" بھی ہلکا پھلکا افسانہ ہے۔ چالیس کا خون، اور ستاروں کا کھیل نسبتاً بہتر افسانے ہیں۔ ستاروں کا کھیل میں بڑا گہرا طنز ہے۔ طنز کا پیرا دار تو نہیں ہے لیکن اسے محسوس کیا جاتا ہے۔

افسانہ "بھیک" کا ابتدائی حصہ بڑا جاندار ہے۔ کلثوم بوا کے کردار پر بڑا زور صرف کیا گیا ہے۔ لیکن افسانہ کا آخری حصہ کمزور ہو گیا ہے۔ افسانے کے ابتدائی اور آخری حصے دو الگ الگ جز بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلثوم بوا کے رخصت ہونے پر ایک افسانہ ختم ہوا اور ان کے جانے کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ دوسرا ہی افسانہ ہے۔

ڈربہ، دیوی کی قرقی، ملا کی دوڑ، تشنگی دل کی اور دو غنڈے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ان میں عام مسائل ہیں۔ ڈربہ میں مکان کا مسئلہ ہے، دیوی کی قرقی میں قرض کا مسئلہ اور اقتصادی پریشاں حالی، دو غنڈے میں بظاہر غنڈے لیکن دل کے صاف کرداروں کا ذکر ہے۔ افسانہ نگار نے شب و روز کی ان باتوں کو اپنے فنی شعور سے افسانوی شکل دے کر لازوال بنا دیا ہے۔

سب سے زیادہ جاندار افسانہ "ملا کی دوڑ" ہے اور "تشنگی دل کی" ہے۔ ملا کی دوڑ ایک ایسے نوجوان کی ذہنی کشمکش کا آئینہ دار ہے جو ماحول کے اثر سے مذہب کی پناہ میں بڑا سکون محسوس کرتا ہے۔ قناعت پسند نوجوان جب پے بہ پے حادثات سے دوچار ہوتا ہے تو وہ قناعت پسندی ترک کر دیتا ہے دعا پر عمل کو ترجیح دیتا ہے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ "تشنگی دل کی" میں ایک بدصورت لڑکی کی ذہنی الجھن پیش کی گئی ہے۔ اس کی صورت کے ساتھ ساتھ سیرت بھی گھناؤنی ہے۔ ابتدا میں تو اس سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے لیکن بعد میں جب اسکی خودغرضی کا جذبہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے تو اس سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

مظفر حنفی نے افسانے بہت لکھے ہیں۔ مختلف زاویۂ نظر اور مسلک ادب رکھنے والے رسالوں میں یہ افسانے شائع بھی ہوئے۔ اس لئے ان کے افسانے کئی رنگ کے ہیں۔ اسے ایک قسم کی مجبوری ہی کہہ سکتے ہیں۔ اپنے منفرد رنگ سے جانے پہچانے جانے والے

افسانہ نگار جب ہلکی پھلکی تخلیقات شائع کرنے والے کثیر الاشاعت رسائل میں لکھتے ہیں تو یہ یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ افسانہ اسی افسانہ نگار کی تخلیق ہے۔ مظفر حنفی کے مختلف افسانوں میں جو معیار کا تضاد ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

مظفر حنفی طنز نگار ہیں۔ ان کی شاعری طنزیہ بھی ہے اور حسیاتی بھی، جدید ہے، نئی ہے لیکن معمہ نہیں۔ وہ روایت شکن ہیں لیکن نئی تعمیر بھی کرتے ہیں، جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے وہی افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں طنز ہے۔ کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جو طنزیہ نہیں ہیں لیکن کامیاب افسانے ہیں۔ ہاں اتنا خیال رہے کہ جس طرح ان کی شاعری میں طنز ہے لیکن مزاح نہیں اسی طرح ان افسانوں میں بھی طنز ہے، گہرا اور تیکھا۔

ڈاکٹر عبد الودود

● آتشِ سیّال ● ساجدہ زیدی ● قیمت آٹھ روپے
عام ایڈیشن ● ضخامت: ۲۱۹ صفحات
● ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔۳

چاند اپنے داغوں کو جلا نہیں دے سکتا۔ شراب اپنے آپ کو نہیں پی سکتی آئینہ اپنا عکس دیکھے تو نابینا ہو جائے۔ انہیں سے ملتے جلتے فرمودات کا غذی پتھر دل پر رکھے ہوئے۔ مذہبی احکامات کا روپ دھارتے ہوئے اپنی تمام تر وحشیانہ قوتوں کے ساتھ دندناتے ہوئے عورت کے سامنے اسی وقت سے کھڑے ہوئے ہیں جب سے اس نے ساتویں پسلی کی گرفت سے اپنے آپ کو رہا کیا تھا۔ بیکراں صدیوں سے بیکراں صدیوں تک بہیمانہ ظلم کے کالے بھجنگ ہیولے۔ قریہ گردوں میں جنسی فتوحات کے ڈھول پیٹتے ہوئے خون آلود گناہگار چہروں کی آب پر عورت کی محبت اور ——— عفت کا امتحان لیتے رہے اور نہ گناہ شوق کے نام پر کفّارہ ادا کرتی رہی۔ اس کو اپنی محبت کا سب سے پہلا کفّارہ اس وقت ادا کرنا پڑا جب حوّا کے روپ میں اس کے بیٹے (ہابیل) کی لاش اسے دکھا کر اس کے قدموں میں جنّت بچھا دی گئی۔ دوسرا کفارہ مریم کی شکل میں اس نے اس وقت ادا کیا جب یسوع مسیح کو اس کی آنکھوں کے سامنے صلیب پر چڑھایا جا رہا تھا اور تیسرے ہولناک کفّارہ کی ادائیگی فاطمہ کے پیکر میں اس دن ہوئی جب بے آب و گیاہ جلتی ریت میں حسین کے خشک گلے پر کند چھری پھیری جا رہی تھی اور فاطمہ کی روح برہنہ پا بال بکھرائے ماتا کے مقتل میں فریاد کر رہی تھی۔

عورت جو کہ تخلیق اور وجود کا سرچشمہ رہی اس کی ہر محبوب تخلیق کا قتل ازل سے اسی طرح ہوتا رہا اور وہ سینے مقتل کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی رہی۔ اس کے کفارہ کی تکمیل میں تو کسی کو شبہ نہ رہا مگر اس کی ذات کو نامکمل اور بے حیثیت تسلیم کرلے اور کرلنے میں ساری کائنات خم ٹھونک کر پیش پیش رہی۔

زیر نظر مجموعہ "آتش سیال" کی نظموں میں عورت (مشرقی عورت) نے شاید پہلی بار اس المناک بے حقیقت حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے منصبِ دیرینہ کو ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

فلسفہ شعر
تڑپ دل کی
تمنّا کا طلسم
دردِ ہستی کی چبھن
آبلہ پائی کی اساس
تلخ کامی کی مٹھاس
لوگ سمجھے کہ مری ذات کا حصّہ ہی نہیں
مجھکو ہنگامۂ عالم سے سروکار ہی کیا
میں یونہی گھٹتی سکڑتی رہی لمحہ لمحہ
اور لوگوں کی انا بڑھتی رہی
پھولتی پھلتی رہی
ذہن کو تھپکیاں دے دے کے سلایا
کہ نہ جاگے نہ کرے شور و بکا
مجھکو گمنامی کے غاروں میں ڈھکیلا
مجھے محصور کیا پھر انہیں دیواروں کے پیچھے
کہ جہاں

میری دلکش تصویر
قرنوں صدیوں سے سجا رکھی تھی
میں وہ تصویر نہیں ...
نقش بہ دیوار نہیں ....

(میں وہ تصویر نہیں)

اس نظم میں جو کردار ابھرتا ہے وہ صبر و قناعت کی حیثیت خورد نہ پس ماندہ پردہ نشیں مقہور عورت کا نہیں ہے یہ تو ایک ایسا سراپا ہے جو عورت کو ایک الگ اکائی کے روپ میں اس کے مکمل وجود کو منوانے پر مُصر ہے۔ یہ احتجاج محض شخصی سطح پر نہیں ہوا ہے بلکہ سماجی سطح پر کائنات کے اسرار و رموز سیاسی، اقتصادی ادبی و ثقافتی عوامل و محرکات کی از سرِ نو دریافت کی صورت میں ہوا ہے ظلم و تشدد، خود غرضی اور بے انصافی کی برپا شدہ قیامتوں میں ایک اور صورِ اسرافیل کی طرح غیر مبہم طریقہ سے سنائی دے رہی ہے۔ بنیادی طور پر یہ آواز نہ کسی مرد کی ہے نہ عورت کی یہ انسان کی وہ مستحکم آواز ہے جس کی گونج کے روابط ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں وقت کے آشوب کی ابتدا سے لے کر انتہا تک کا یہ سفر لاکھوں آوازوں کے صحرا سے ایک لازوال شعلہ بار چیخ بن کر اُبھرا ہے۔

میرے اطراف تنہائی کی
یخ بستہ فضائیں سانسیں لیتی ہیں
مرے سینے میں وہ آتش فروزاں ہے
جو ہر زندہ حقیقت کا مقدر ہے
یہ آتش میری خالق
کہ اس نے مرگ ذہنی
غیر خود اور خود کی
پتھریلی دیواروں کو گرا کر
اک خلائے بیکراں کا منظر حیرت دکھایا ہے
مجھے ہستی میں رہ کر
نیستی کا بار اٹھانے کا
فنِ مطلق سکھایا ہے
(آتشِ سیال)

لیکن اس آتشِ سیال کی نشو و نما میں خود ساجدہ زیدی کو بار ہا تنہا آگ اور خون کے دریا سے گذرنا پڑا ہوگا اس لئے نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کی بوسیدہ صداقتوں پر قائم شعری عرفان کے بجائے اس مجموعہ کی پوری شاعری میں شخصی تلاش کا فن ردّ و قبول کے عالمانہ استدلال کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ ساجدہ زیدی کو مشرق کے بے مغز ذہن اور مغرب کے بے روح جسم سے شکوہ نہیں وہ مشرق و مغرب کے متضاد اتصال سے ایک سرتا پا متحرک با شعور انسانی وجود کی تشکیل کی خواہش مند ہیں

رات کٹ جائے تو یونہی باتوں میں
اور جب لمحوں کی زنجیر کٹے
تم اسی روح کے سناٹے میں کھو جاؤ پھر
میں اسی ریت کے صحرا میں بکھر جاؤں پھر
لمحہ لمحہ یونہی گذریں یہ عدم کی راہیں
لگا ہے گاہے اسی یک رنگیٔ ماحول کی ویرانی میں
میں بھی زخموں کے تعلق سے تمہیں یاد کروں۔
تم بھی بکھرے ہوئے ذرات میں ڈھونڈو مری ہستی کے نشاں
(مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال)

ان کے یہاں ماضی کے شجر نے اپنے سارے زرد پتے ہی نہیں گرائے ہیں کہ اس پت جھڑ میں نئے شگوفے بھی کھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

رگوں میں زہر کو دوڑا دیا لہو کی طرح
ہر اک قطرۂ شبنم میں آگ بھڑکائی
ہر ایک لمحے کو اک عمر کا خراج دیا
ہر ایک خار کو سو آبلوں کی رعنائی
عجیب بھی نہیں کچھ ویسا دشتِ تنہائی
(ایک نظم)

اساطیری حقائق سے گریز کرتے ہوئے ساجدہ زیدی کے یہاں لہجے کا یا وقار حسن جس سنجیدگی سے انگیز ہے وہ جدید نظم کے رکھ رکھاؤ سے بالکل الگ شے ہے۔ انسانی رشتوں کے ربط اور انقطاع کا تجزیہ جا بجا ان کے یہاں بڑے موثر احساس کے ساتھ ہوا ہے

اس کے ساتھ ساتھ روح کی جمالیت اور جسم کی روحانیت کے گہرے پاکیزہ جائزوں نے ان کی شاعری میں بلند پایہ اور بڑی شاعری کے تمام محرکات اور امکانات واضح طور پر مہیا کر دیے ہیں۔

ان نظموں کے پس منظر میں وہ جدید میکانکی معاشرہ بھی ہے جو ہماری فکری اور روحانی اساس کو گھن لگا کر بے ہیئتی یا بے یکتی کا شکار ہو گیا ہے۔ 'بحر الکاہل میں بے بادباں کشتیاں' اس قبیل کی ایک کلیدی نظم ہے۔ ان نظموں کے تناظر میں سماجی حصبیت کا پروردہ وہ ناقد ذہن بھی ہے جو مکمل طور پر بالغ نہیں چھوٹے چھوٹے فریبوں پر مشتمل انسانی مسرتوں کی مسلسل پرورش نے آج کے انسان کو بھی بڑی حد تک طفلانہ اشیا اور خوبصورت خوابوں سے دست کش نہیں ہونے دیا وہ آج بھی اپنے جذبوں کو کھلونوں کی دکان میں سجا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور صرف ظاہری سطح پر انھیں قبول کرنے کو تیار ہے باطنی حظ اٹھانے کے لئے نہ اس کے پاس فرصتِ احساس نہ محدود انسانی بصیرت سے نکلنے کا کوئی جواز ..... اقدارِ حیات کی شکست و ریخت کا مرثیہ 'آتشِ سیال' کی شاعری کا مقدر نہیں ہے انسانی زوال کے ساتھ ساتھ ہی کائنات کی بھی ساری طنابیں اکھڑ گئی ہیں اپنی تخلیق کے ساتھ خود خالق بھی شکست کے صدمے سے دو چار ہوا ہے۔

اے خدا
تو فلک پر نہیں
ہم زمیں پر نہیں
عدم اور ابد کے تضادات میں
تو بھی بکھرا ہوا
ہم بھی ٹوٹے ہوئے
(ایک نظم)

'آتشِ سیال' کی شاعری کے شدید تر احساسات ان نظموں میں شدید ترین ہو گئے ہیں جو صابرہ زیدی کی موت پر وجود میں آئی ہیں سب سے [illegible] بات یہ کہ یہ نظمیں نہ صرف ساجدہ زیدی نے اپنی بڑی بہن کے [illegible] میں کہی ہیں بلکہ ان نظموں کے الم انگیز مضامین

رشتے سلمان اریب ...... موت سے لے کر ہر ایک انسانی زیاں سے جا ملے ہیں۔ ان نظموں کی اہمیت بیانیہ مرثیت میں نہیں بلکہ ان لا متناہی گم شدہ روشنیوں کے ماتم میں ہے جو ذہن کے سیہ خانے میں ایک بار پھر جا کر مصلوب ہو گئیں ان نظموں کا منضبط لہجہ ماتھیو آرنلڈ کی باوقار مرثیت کی یاد دلاتا ہے۔

یہی احساسِ درد انگیز
زہرِ زندگی بن کر جو رگ رگ میں تڑپتا ہے
مجھے شاید سہارا دے
کہ میرے اور تمہارے درمیاں
بس اک یہی رشتہ تو باقی ہے (دوستی کا المیہ)

وہ ایک طائر تھی،
جس کی آزادیاں شاخ پہ بسیرا کرنے سے ختم نہیں ہوتیں
اور وہ آزاد ہو گئی.
جسم و جاں کی قید سے آزاد
وقت و مکاں کی قید سے آزاد
مگر اس شاخ سے رہ رہ کر خون کیوں ٹپک رہا ہے؟
(وہ کون تھی؟)

'آتشِ سیال' میں گوناگوں فکری انکشافات۔ ان گنت پیچ در پیچ ذہنی الجھنیں اور رونما ہونے والے کرب آمیز اور ہولناک واقعات کے زندہ Images دیکھ کر جدید نظم کے امکانات و مراتب کی توسیع ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جدید دور کا جو ان کن زاویۂ نظر جدید علوم و آگہی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی کا زاویۂ نظر ہے ساجدہ زیدی نے اس زاویۂ نظر کو سمجھنے اور سمجھانے میں [illegible] افکار کو بدلتے ہوئے میلان سے آشنا کر دیا ہے بلکہ [illegible] کے تقابل میں بکھرے ہوئے عصری اور آفاقی کرب کی [illegible] بھی اپنے پڑھنے والوں کو شامل کر لیا ہے ان کی شاعری [illegible] کا فن ہے نہ ہوئی کا یدبیضا۔ نیلے پانیوں پر تیرتا ہوا [illegible] ہے نہ پتھروں پر رکھے ہوئے الوال [illegible] [illegible] سمندروں کے ہفت خواں سے گزرتے ہوئے [illegible]

جیسا ساجدہ زیدی نے پہلے کسی نے نہیں کہا ہے اور اگر کہا بھی ہو تو اس سلیقے اور اہتمام سے نہیں۔

مجموعی طور پر ساجدہ زیدی کے یہاں نظم کی ماورائی کیفیت سے ایک فلسفیانہ روشنی افق در افق پھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو پیچیدہ تاثرات نازک محسوسات اور عمیق ترین جذبات کا اظہار کرتے وقت شکستہ کائنات کو مرتب کرنے کے بجائے وہ موجودہ انسان کی گھایل شخصیت کو ایک بامعنی اور مثبت انداز میں مرتب کرنا چاہتی ہیں وہ جدید علوم کی مدد سے کائنات کے نئے آفاق اور اذہان کے نئے وژن دریافت کرنے میں مصروف ہیں جن سے ان کی شاعری کی سمتیں انتہائی حد تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ "آتش سیال" نے ابلاغ و ترسیل کی ناکامی کے مفروضے کو جھٹلا کر افہام و تفہیم کے نئے دریچے وا کئے ہیں ان کیفیات سے روشناس کرایا ہے جو پہلے ساجدہ زیدی کی ملکیت تھیں اور اب ہم سب کی۔ شاعری کا یہی عظیم منصب بھی ہے۔

کتاب ڈیمائی سائز میں نہایت خوبصورت طباعت اور کتابت کے ساتھ چھاپی گئی ہے اور صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے اس کی پذیرائی ناگزیر ہے۔

مصور سبزواری

تلخ تند شیریں

• گراں کاغذ سستا مضمون

• ڈاکٹر صفدر آہ

اب کی آپ پرچہ پر بالکل توجہ نہ دے سکے۔ سارا پرچہ گڈمڈ شاعری سے بھرا ہے۔ صرف ایک مضمون نثر کا ہے۔ جس میں کچھ خدائی اور پیغمبری جیسے نظریوں سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مضمون نگار صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میر کی شاعری کی غم انگیزی ۱۸۵۷ء کے غدر کا نتیجہ ہے۔ (صٹ کالم ۲) حالانکہ بے چارے میر اُس غدر سے ۷۴ سال پہلے عدم آباد پہنچ چکے تھے۔ اتنے گراں کاغذ پر اس سے بہتر مواد شائع ہوتا تو بہتر تھا۔

• سردار جعفری

شریف ارشد کے مضمون "بشیر بدر" میں ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اس میں بتلایا گیا ہے کہ میر تقی میر نے ۱۸۵۷ء کا غدر دیکھا تھا۔ میر اس سے سو سال پہلے کے شاعر ہیں۔ انہوں نے نادر شاہ اور احمد شاہ کے ہاتھوں دلّی کی تباہی اور بربادی دیکھی تھی ——

—— غدر ۱۸۵۷ء غالب کے حصے میں آیا تھا۔

•• سلطان سبحانی

شمارہ نمبر ۱۲۳ شاعری کی باڑھ کی صورت میں آیا۔ شریف ارشد کا مضمون "بشیر بدر" بھی کہیں کہیں سے شاعری ہی معلوم ہوتا ہے۔ ان دنوں آپ بشیر بدر پر بہت جذباتی مضامین اور خطوط و اقتباسات وغیرہ چھاپ رہے ہیں۔ پچھلے شمارے میں ان سے متعلق جو چند صفحات تھے۔ انھوں نے میری معلومات میں بہت اضافہ کیا ہے۔ مثلاً غزل اگر واقعی غزل ہے تو بشیر بدر کی ہوگی" (یعنی میر، غالب، فراق، فیض، ناصر کاظمی، ظفر اقبال، مجروح، مخدوم، ادیب اور جامی وغیرہ کی نہیں) میرے دوست [illegible] فاروقی آپ کو ہر ٹکڑے کے بارے میں ایک تفصیلی خط لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ خطوط اور اشتہارات پر رائے زنی کوئی ادبی شغل نہیں ہے اس لئے خاموش رہے۔

میں نے وہ ٹکڑے بہت حیرت کے ساتھ دیکھے۔ اور اندازہ لگایا کہ حفیظ اہل ہنر کب مانتے ہیں، اس لئے بڑے بڑے دعووں سے ہونے کی تیاریاں جاری ہیں۔ میں بشیر بدر، یا ان کی شاعری کا مخالف یا موافق نہیں۔ نئی غزل کے اچھے برے شاعروں کی صف میں میں بھی انھیں رکھتا ہوں، (برے اس لئے کہ ان کے یہاں رطب و یابس کی چاشنی بھی ملتی ہے) اور میں سب کی مونچھیں چھین کر سب سے بڑا بن جانے کے جذبہ کو کوئی چوری یا حماقت بھی نہیں سمجھتا۔ (میری تو خواہش ہے کہ کوئی وارث علوی کی مونچھیں چھین کر بتائے کیونکہ زیادہ مونچھ ادھر ہی ہے اور فضول ہے) لیکن ایک بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ یہ کہ آج کل جو سنگ باری کی روش چل رہی ہے اس کے پیچھے کون سا تعمیری جذبہ پوشیدہ ہے؟ اس سے پہلے اردو کے کچھ بہترین افسانہ نگاروں کو رد کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ تو خیر رد ہو نہیں سکے، رد کرنے والے ہی رد کی رہے۔ اور اب شاعروں کی نوبت آئی ہے۔ اگر بڑے فن کار بننے کا صحیح طریقہ کار یہی ہے تو مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ یہ طریقہ کار بھی نثری نظم، اور آزاد غزل کی طرح ذرا بھی مقبول نہیں، اور چند ایک تک ہی محدود رہے۔ اگر تمام فن کار اس طرف رجوع ہوں تو ممکن ہے کہ سب ہی بڑے فنکار بن جائیں اور ادب میں سنگ باری کا بہترین نمونہ ملے۔ ادب میں سنگ باری کی روایت کچھ نئی تو نہیں۔ اسکا زور و شور تو یہ بتلاتا ہے کہ یہ ادب سے بھی کہیں زیادہ پرانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے آس پاس کے کسی فنکار کو نشانہ بناتے ہیں تو سر پھوٹتا ہے غالب، میر وغیرہ حال کا۔ یعنی اس پتھر کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ ماضی کی گہرائیوں تک پہونچ جاتا ہے۔

چند سال پہلے کی بات ہے۔ بلٹز میں ندا فاضلی نے قرۃ العین حیدر سے متعلق لکھا تھا کہ "ہاؤسنگ سوسائٹی" لکھ کر اس نے اپنا قد تمام افسانہ نگاروں سے اونچا کر لیا ہے۔ [illegible] کہ

اس کا قد منٹو کے قد پر کھڑا ہو گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک سال بعد جب "ملاقاتیں" چھپا تو ندا نے یہ جملہ حذف کر دیا۔ کیونکہ اس مضمون میں یہی بات معقول تھی۔ "ملاقاتیں" کی بنیاد تبصروں اور "اپنے قد" پر رکھی گئی تھی۔ اگر منٹو کی کتاب "گنجے فرشتے" پڑھی جائے یا "نقوش" کا شخصیات نمبر تو ان میں تبصر تو کیا گمسکریں نہیں ملیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس دور کا ادب اپنا ایک مزاج رکھتا ہے۔ بیگ بازی سے متعلق ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اچھے شاعر صرف اپنی شاعری سے ہی دوسروں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اب سب پتہ چل رہا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ میں آ رہا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی پیش لفظ یا مقدمہ کو اشتہار لکھا ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ادب سے زیادہ اشتہار ہی جدید ہوتے جا رہے ہیں۔ اسے کوئی حملہ نہ سمجھے جدید ادب پر۔ یہ تو ایک جملہ ہے جو سہو ہو گیا ہے۔ جب دوسروں کے مضامین سہو ہو جاتے ہیں تو اس ایک جملہ کے سہو ہو جانے میں کیا قباحت ہو۔

فراق گورکھپوری نے اپنے مقام کے لیے بہت زیادہ محنت کی۔ خود پر تقریریں کیں، خود پر تقریریں کرائیں، خود پر مضامین لکھے، خود پر مضامین لکھوائے اور ثابت کر دکھایا کہ تحریر و تقریر کی آزادی اسے کہتے ہیں۔ اگر سب ہی فراق بننے لگیں تو تقریر سننے اور تحریر پڑھنے والے شاید بازار میں بھی نہیں ملیں گے۔ اور ان کا حال بھی شکر اور گندم کا سا ہو جائے گا۔ یوں بھی خود پر لکھوانا اور چھپوانا آج کا مرض نہیں ہے۔ الیکشن میں تو بہت ساری باتیں جائز ہو جاتی ہیں۔ جدید شاعری ابھی خود نابالغ ہے (نابالغ سے مراد نو عمر) اس لیے مناسب نہیں کہ ابھی سے الیکشن بپا کیا جائے۔ ایک زمانہ گذرنے کے بعد کوئی نام خود بخود بنتا ہے۔ اس کے لئے اتنے سر پھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کوئی فلم ایوارڈ تو نہیں کہ کوئی ہزاروں کوپن خرید کر جسے چاہے اس کے سر پہ تاج رکھ دے۔ یا یہ کوئی اکاڈمی تو نہیں کہ جسے چاہے اس کی کمر پہ زین کس دے تاکہ سفارشات کا بوجھ اترے۔

فراق گورکھپوری نے اپنی کتاب "ثمیشر" میں کہا تھا کہ

"وقت کا عدل عدلِ جہانگیر ہے"

لیکن جو کچھ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون سی جہانگیری ہے کہ اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے سات خون معاف!

[illegible] میں ندا سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ نئی پیڑھی بہت بوکھلائی ہوئی ہے (غالباً اسی وجہ سے "ملاقاتیں" وجود میں آئی) حیرت ہے کہ آج کی بات ندا نے آج سے نو سال پہلے کہہ دی۔ یہ بوکھلاہٹ یہاں ہے کہ کچھ لوگ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھی تیراکی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ خود کو پوجنے کی ادا کے سوا اور کچھ نہیں۔ خود کو پوجنا ایک ذہنی مرض تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کوئی اخلاقی جرم نہیں۔ اس لئے اس پر کوئی پابندی بھی لگائی نہیں جا سکتی۔ ایسی حرکتیں تو بہت سے فن کار کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہاں کی عبادت ہے کہ اس کے لیے دوسروں کے مجسمے چکنا چور کئے جائیں۔ یہ تو ایک طرح کی احساس کمتری ہوئی۔ مغرب کے ایک ملک کے صدر نے مونچھوں پر صرف اس لئے پابندی عائد کر دی تھی کہ ان کے نزدیک مونچھیں احساس کمتری کی علامت تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مردوں کی احساس کمتری کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ "اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟" جب اپنا ہی مجسمہ پوجنا ہے تو دوسرے مجسموں کی موجودگی سے شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر مونچھیں رکھانے سے شاعرانہ قد اونچا ہوتا ہو تو ہوتا ہو۔ اس میں دوسروں کی کیا خطا کہ ان کی مونچھوں سے ہاتھ رنگے جائیں۔

ناصر کاظمی نے اگر پیغمبری کا دعویٰ کیا تو اس سے دوسروں کی پیغمبری پر کیا حرف آتا ہے؟ اور غالب نے جب کہا کہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں" تو اس غالب کی عظمت میں کیا فرق آیا؟ اور پھر پیغمبری کا دعویٰ کرنا کوئی پیغمبری یا فن تو نہیں۔ اگر کوئی ناصر کاظمی کا بت توڑ کر گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح نصب ہو کر رہ گیا "غضب کا املا لکھتے ہیں لوگ" تو ممکن نہیں کہ وہ گوتم بدھ [illegible] پائے گا ہو۔ [illegible] بھی پرستش

شروع کر دیں۔ اور اگر ایسا ہونے بھی لگے تو وہ شخص پیغمبر تو ہو سکتا ہے شاعر نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پیغمبری کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کوئی بمبئی کے شاعر مرزا عزیز جاوید کی طرح یہ کہتا نظر نہیں آتا کہ ؎

آج تک تو خود کو بھی پوجا نہیں
میں نے خود سا آدمی دیکھا نہیں

اگر شاعری اور پیغمبری کا رشتہ بہت ہی گہرا ہے تو اقبال کیا برے تھے۔ عرصہ ہوا ایک ادارے نے اپنے اعلان نامہ میں جب مجروح سلطانپوری کو "آبروئے غزل" لکھ دیا تھا تو جواباً مجروح نے اردو ٹائمز میں تحریر کیا کہ "فراق گورکھپوری کے ہوتے ہوئے میں اس اعزاز کا اہل نہیں کہ مجھے اس کھیرے ککڑیوں کے ڈھیر سے نوازا جائے۔"

اس ڈھیر کی طرف کئی فنکار دوڑ رہے ہیں۔ لیکن اس پر فراق گورکھپوری جیسے ہی کسی فنکار کا حق ہو سکتا ہے۔

اگر ہم رسائل میں چھپنے والی ساری تازہ غزلوں کا جائزہ لیں تو ایک حیرت انگیز بات سامنے آئے گی۔ اور وہ یہ کہ گذشتہ برسوں سے ہر نئے آنے والے شاعر پر ناصر کاظمی، ظفر اقبال اور شکیب جلالی کا رنگ بہت ہی گہرا چڑھا ہوا ہے۔ اور پچھلے کچھ عرصہ سے تو ہر نوجوان شاعر پر ظفر اقبال ہی مسلط ہے۔ دیکھئے، سارے رسائل گواہ ہیں بس چند ایک ہی شاعر ایسے ہیں جو بشیر بدر، یا عادل منصوری جیسی شاعری کر رہے ہیں۔ اب اس حالت میں اگر کوئی پیغمبری کا دعویٰ کر دے تو یہ اس کے حواریوں کے لئے بھی نہایت افسوس کا مقام ہے کہ نہیں؟

........ابھی تو بات چل رہی ہے جدید غزل کی اور زندگی کی نمائندگی کی۔ کچھ دنوں بعد بات چلے گی۔ اس عہد کی نمائندگی کی۔ بہرحال "گفتگو بند نہ ہو بات سے بات چلے" اگر اس کا فیصلہ ابھی ہو جائے تو اچھا ہے۔ کیونکہ آئندہ کا فنکار بھاؤ اور بھی بڑھنے والا ہے۔ اور ایسی صورت میں جب تمام رسائل سالنامہ کی رفتار سے نکلا کریں گے تو [illegible] کیونکہ سالنامے خود

سال بھر کا فیصلہ ہوتے ہیں۔ فیصلہ کرتے نہیں۔ اس [illegible] پر کوئی نہ کوئی نام تو ضرور جگمگانا چاہیے۔ کاش میرا وہ افسانہ "اس نام کا سفر" کتاب میں چھپتا جو شاخسار میں منظور ہوا ہے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ افسانہ بھی اسی موضوع کے گرد گھومتا ہے۔

یہ کوئی غلط بات نہیں کہ آج کی شاعری بھی بری طرح یکسانیت کی شکار ہے۔ دیکھئے ساری کی ساری شاعری آج کے عہد سے بہت خفا معلوم ہو رہی ہے۔ اس یکسانیت کا الزام میں انانیت اور خود ساختہ پن پر نہیں رکھوں گا۔ میرے نزدیک صرف تقلید ہی ہے جس نے یہ گل کھلائے ہیں۔ اور اب تو تقلید کا شمار بھی ہنر میں ہونے لگا ہے۔ جب ایسی بات ہے تو فن کا اور فنکار کو پوچھتا کون ہے۔ یہ شاعری سے باہر کی چیز ہے یعنی۔ [illegible] ہے کہ بچے پھل کوٹ کی جیب میں ٹھونسنے میں اتنی جابکدستی [illegible] رومانیت اور "جاں بخشیت" ہے کہ اس کا پتہ صرف جاڑے [illegible] ہوئی گرم ٹوپی کو ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے مضمون نگار جن فنکاروں پر زور لگا رہے ہیں ان کے شعر بھی صحیح لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے (آتی ہوئی ٹرین کے آگے جو "رکھ دیا") عجیب سست گواہ ہیں کہ مدعی کو چست کر رہے ہیں۔

ناصر کاظمی اور ظفر اقبال سے ہٹ کر خلیل الرحمن اعظمی، باقی، سلیمان اریب، شہریار، ساقی فاروقی، ناصر شہزاد، [illegible] اختر، بشر نواز اور زیب غوری کیا نئی غزل کے اہم شاعر نہیں کہ ان کے نام یا تو لئے ہی نہ جائیں یا لئے جائیں بھی تو [illegible] جیسے جاتی ہوئی ہواؤں کے جھونکے۔ اور بیک گراؤنڈ سے آواز یہ ابھرتی ہے کہ

اس کو ہی لوگ چوم کے فنکار بن گئے
جس ریشمی غلاف سے لپٹا ہوا ہوں میں

ریشمی غلاف کو لیجئے۔ یہ بیچارا تو بجائے خود تکیے سے لپٹا رہتا ہے۔ اس سے بھی لپٹ جانا کہاں کا انصاف ہے۔ جبکہ اشارہ شاعری، اور دیگر شاعروں کی طرف ہے۔ لیکن دوستے [illegible]

اگر کوئی صاحب ٹائی گلے کے بجائے کان سے لٹکا لیں اور کہیں کہ ہم نے جدت پیدا کی ہے تو کیا لوگ انہیں حیرت سے نہیں دیکھیں گے۔ ریشمی غلاف کو چوم کر فن کار بننے والے کچھ "شاگرد" ہی ہو سکتے ہیں۔ جگر نے بھی تو ایسی ہی صدا بلند کی تھی ؎

یہ مہر و ماہ مرے ہمسفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

اور مجروح نے بھی تو کہا تھا ؎

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

لہٰذا ریشمی غلاف کو چومنے اور مسکا دینے کی مستعار ادا میں وہ انانیت کہاں کہ کوئی حسن پیدا کر سکے۔ اگرچہ یہ کہنا بہت آسان ہے کہ "اس کو" ہی لوگ چوم کے فن کار بن گئے۔ (یہ اِس کو، کِس کو اُردو کے کس معلم کی زبان ہے؟) زبان کی بات آئی تو میر کا شعر یاد آ گیا۔

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

بہرحال اس طرح بھی یعنی ریشمی غلاف کو چوم کر فن کار پیدا ہو سکتے ہیں تو اس سے تو اچھا ہے کہ سنگ و خشت سے چنگ و رباب ہی پیدا ہوا کریں کہ جن سے کچھ فائدہ تو ہے۔ اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ ریشم کے کیڑے ریشم سے پیدا ہوتے ہیں تو چلئے یونہی سہی، کچھ نہ کچھ ہو تو رہا ہے۔

علامت اور ابہام سے متعلق ناصر شہزاد کا تذکرہ اسی طرح بند ہے جس پاکستانی رسائل کی آمد۔ کچھ مضمون نگار اس بات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر دونوں ملکوں کی راہیں کھلی ہوتیں تو بعض مضامین کا وجود ہی نہ ہو پاتا۔" چاندنی کی پتیاں" کوئی کتاب نہیں کہ لوگ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرمائیں۔

بہت سے فن کار اپنی کتاب کا نام الف سے شروع کرتے ہیں۔ اس سے بھی ان کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کوشش صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ فہرست کتب میں ان کے نام اول آ جائیں۔ یہ بھی ایک احساس کمتری ہی ہے۔ میں اسے کوئی ذہنی ورزش نہیں سمجھتا۔

ہیرے کا سا تراشا ہوا اسلوب تو مرچ لو دینے اور ماش کی دال میں بھی نظر آتا ہے اور کیک، بنّ، سرکئی جین میں بھی۔ لیکن اس ہیرے کی طرح تراشی ہوئی دیوار میں وہ فن کہیں نہیں نظر آئے گا جو بے ہنگم پتھروں کو جوڑ کر بنائی ہوئی دیوار میں نظر آتا ہے۔

اور چلئے اس بات کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ بیسویں صدی کی غزل بیل باٹم میں ملبوس ایک الٹرا ماڈرن لڑکی ہے۔ اور "یہ زعفرانی پلو ورا سی کا حصہ ہے، کوئی جو دوسرا پہنے دوسرا ہی لگے"۔ چلئے یہ بھی درست۔ لیکن اِس لڑکی کے عقب سے اُس لڑکی کی "جامہ زیبیاں" بھی تو نظر آ رہی ہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "جو رنگ اُس نے پہنا وہی رنگ کھل گیا۔"

اب آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ غزل اگر واقعی غزل ہے تو سو فیصدی یقینی ہے کہ غزل ہی ہوگی۔ غالب نے کہا تھا کہ "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے" لیکن یہاں دوسرا ہی معاملہ ہے۔ اب ادبی مسائل اشتہارات سے حل ہونے لگے ہیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس خط کو جذباتی نہ سمجھئے گا میں نے سب کچھ بہت سنجیدگی سے لکھا ہے۔ کیونکہ میں جذباتی مضامین پڑھ کر سنجیدگی کا شکار ہوتا ہوں۔

●● تسکین انصاری۔ کلکتہ

عادل منصوری، محمد علوی، بشیر بدر، مظہر امام، وحید اختر، شہریار، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، کرامت علی کرامت، سلطان اختر، پرکاش فکری، شمیم حنفی، ابراہیم ہوش، حرمت الاکرام وغیرہم کے درمیان سے غالب، اقبال اور فیض کے بعد ایک نام اُبھر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ نام بشیر بدر کا ہو، عادل منصوری کا ہو، ان میں سے کوئی اور ہو، ان میں سے کوئی

ایک بھی نہ ہو، کچھ اور انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ پروپیگنڈے کی نہیں سپلیمر اور خدا بنا کر کسی کو پاگل خانے میں بھیجنے کی کوشش نہ کی جائے تو کچھ امید رکھی جا سکتی ہے۔

ہمارا درد ہماری دکھی نوا سے لڑے

شریعت الارشد۔ آسنسول

دلی پر ۱۸۵۷ء ایک سال میں نہیں بیت گیا بلکہ یہ میر کے بچپن سے لے کر غالب کے بڑھاپے تک پھیلا ہے اور اس کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ میر کے عہد میں دلی کی تاراجی نادر شاہ درانی کے ہاتھوں ہوئی، احمد شاہ ابدالی نے لوٹا، مرہٹوں کے حملے ہوئے اور پے در پے اندازا لگری کی تھی۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دلی پر آفات اور خونریزیوں کا جو سلسلہ میر کے عہد سے شروع ہوا وہ ۱۸۵۷ء تک مسلسل رہا۔ اہل دلی کو جس روحانی عذاب سے میر کے عہد میں دوچار ہونا پڑا ۱۸۵۷ء اس کا نقطۂ عروج ہے۔ دراصل ۱۸۵۷ ایک علامت ہے دلی کے عدم تحفظ، انتشار، ویرانی اور تاراجی کی، یہ سلسلہ میر کے عہد سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ تک آتا ہے۔

● آہ حیدر عمر شاداں

قیصر رضا۔ پٹنہ

بہار کے نوجوان شاعر حیدر عمر شاداں صرف ۲۷ برس کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے ــــ ۲۸ اپریل کو وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ بھاگلپور سے قریب سلطان گنج کچھ ساتھیوں کے ہمراہ پلنگ منانے گئے ہوئے تھے۔ وہیں گھاٹ پر نہاتے ہوئے ڈوب گئے۔ مرحوم کی کئی نظمیں کتاب میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ادھر وہ ایک نظم کے مکالمے لکھنے میں مشغول تھے جس کی چربہ سرمائی تشلیث "نہیں نکال پا رہے تھے"۔

● حضرت امیر خسرو ۷۰۰ سالہ تقاریب

۱۹۷۴ء کے دوران حضرت امیر خسرو کی ۷۰۰ سالہ تقاریب عظیم الشان پیمانے پر منانا طے پایا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کل ہند قومی کمیٹی جناب فخر الدین علی احمد کی صدارت میں تشکیل دی گئی ہے۔

اس سلسلے میں قومی اور بین الاقوامی مذاکرات، مشاعرے اور موسیقی کے جلسے منعقد ہوں گے۔ نیز امیر خسرو کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے تحقیق اور یادگاری کتب مختلف زبانوں میں شائع کی جائیں گی۔ سرکاری اور نیم سرکاری رسائل امیر خسرو نمبر نکالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ فلم ڈویژن امیر خسرو پر ایک ڈاکومینٹری فلم بھی تیار کرے گی۔ حکومت اور علمی اداروں کے تعاون سے دیگر تجاویز بھی زیر غور ہیں۔

اس کے علاوہ کمیٹی نے یادگاری کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں نہ صرف امیر خسرو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات یکجا کرنے کی کوشش کی جائے گی بلکہ امیر خسرو سے متعلق اس وقت تک سامنے آئے ہوئے اہم مواد کو بھی شائع کیا جائے گا تاکہ بعد میں طلباء اور محققین کو سہولت ہو ــــ

اس ضمن میں اہل قلم حضرات سے تعاون کی گزارش ہے اور اس کے بکھرے ہوئے سرمائے کی نشاندہی اور انھیں یکجا کرنے میں بھی ہمیں آپ کے تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

پتہ:۔ ظ۔ انصاری
جنرل سکریٹری امیر خسرو تقریبات کمیٹی
۳۲۔ شیریں ۳۱۔ کولابہ روڈ
بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۵

● ادب دوست مجاہد آزادی کا انتقال

سیفی الاعظمی

کتاب کے پرانے قاری جناب حافظ محمد شعیب شاکر انصاری۔ ۹ مئی ۱۹۷۳ء کی شام کو ۴ بجے بہت ہی مختصر اور معمولی سی علالت کے بعد انتقال فرما گئے (بعمر ۶۸ سال)

علم و ادب کے شیدائی ہونے کے ساتھ ہی ایک مشہور اور مخلص سیاسی رہنما بھی تھے۔ جنگ آزادی میں عظیم قربانیوں کے [illegible] میں حکومت ہند سے "مجاہد آزادی" کا خطاب عطا ہوا تھا اور وظیفہ بھی [illegible]۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے، ایک چھوٹی بچی، ایک بڑی لڑکی اور اپنی بیوی کو سوگوار چھوڑ گئے ہیں۔ ایک جوان لڑکا [illegible] عرصہ [illegible] ہو ــــ

اقتصادی مساوات اور سماجی انصاف کیلئے
ضروری ہے

- پرسکون ماحول
- سخت محنت اور
- ایمانداری

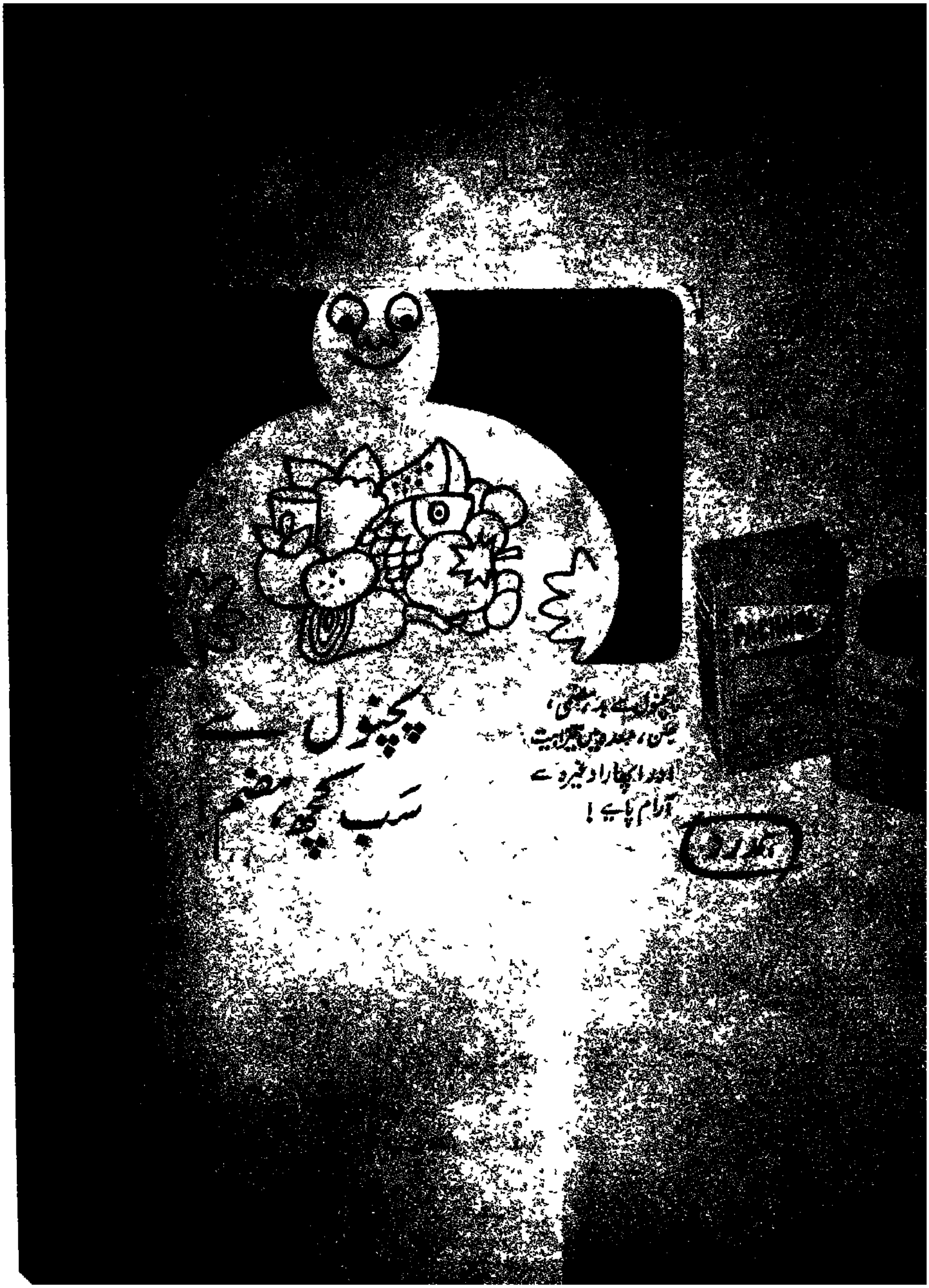
ہم ایسا نہ کریں جس سے

- پیداوار رکتی ہو
- چیزوں کے بھاؤ بڑھتے ہوں
- چور بازاری اور منافع خوری پنپتی ہو اور
- غریبی قائم رہے

اُتر پردیش حکومت مزدوروں کے مسائل کی طرف قطعاً غافل نہیں بلکہ بیدار ہے

- ملک کے ۴۵ لاکھ سے زیادہ کھیتی کرنے والے مزدوروں کی مزدوری میں یکم دسمبر ۱۹۷۳ء سے ۱۴۰ روپیہ تک کا اضافہ۔
- ۹۰ ہزار چینی مزدوروں کے مہنگائی بھتہ میں یکم نومبر ۱۹۷۳ء سے ۲۸ روپیہ سے لے کر ۳۸ روپیہ تک کا اضافہ
- تقریباً ۵۰ ہزار غیر مستقل چینی مزدوروں کو آف سیزن میں بھتہ کی ادائیگی کے لئے اب خالی موسم میں دو ماہ کی جگہ پر صرف ایک ماہ کام کرنے کا فیصلہ۔
- بھتہ کی ادائیگی کے لئے چینی مل کے ۱۲۰ دن تک چلتے رہنے کی شرط ختم۔
- ڈیری، جانوروں، شہد کی مکھیوں اور مرغیوں کی پرورش میں لگے مزدوروں کے لئے ملک میں پہلی بار تنخواہ مقرر
- ریاست میں کانچ کی پیداوار اور چوڑی کے کاروبار کے مختلف شعبوں میں تقریباً ۱۲ ہزار کام کرنے والوں کے لئے بھی پہلی بار تنخواہ مقرر
- کانپور کے چمڑا کاروبار میں کام کرنے والے مزدوروں کو یکم جولائی ۱۹۷۳ء سے ۲۰ روپیہ سے ۲۷ روپیہ تک عارضی راحت۔
- یکم دسمبر ۱۹۷۳ء سے ریاست کے دیگر کاروبار میں لگے ۴۴ ہزار مزدوروں کو بھتہ کی شکل میں ہر ماہ ۲۰ روپیہ سے لے کر ۴۰ روپیہ تک کی عارضی راحت
- گورنمنٹ روڈویز کے ۲۰ ہزار سے زائد کام کرنے والوں کو اُن کی تنخواہ میں ۹ فیصدی کے برابر بونس۔

انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ اتر پردیش کے ذریعہ مشتہر


پچنول سے
سب کچھ ہضم
اور اپھارا وغیرہ سے
آرام پایئے!
ہمدرد

KITAB Registered with the Registrar of Newspaper at R. No.
LUCKNOW-3 April, May, June '74 Reg. No. LW/N.P.



ہر عہد کا ادب اپنے زمانے کی حقیقتوں کا فنی اظہار ہوتا ہے

۳

- مختصر مختصر افسانے

—

- تبصرے
- خطوط

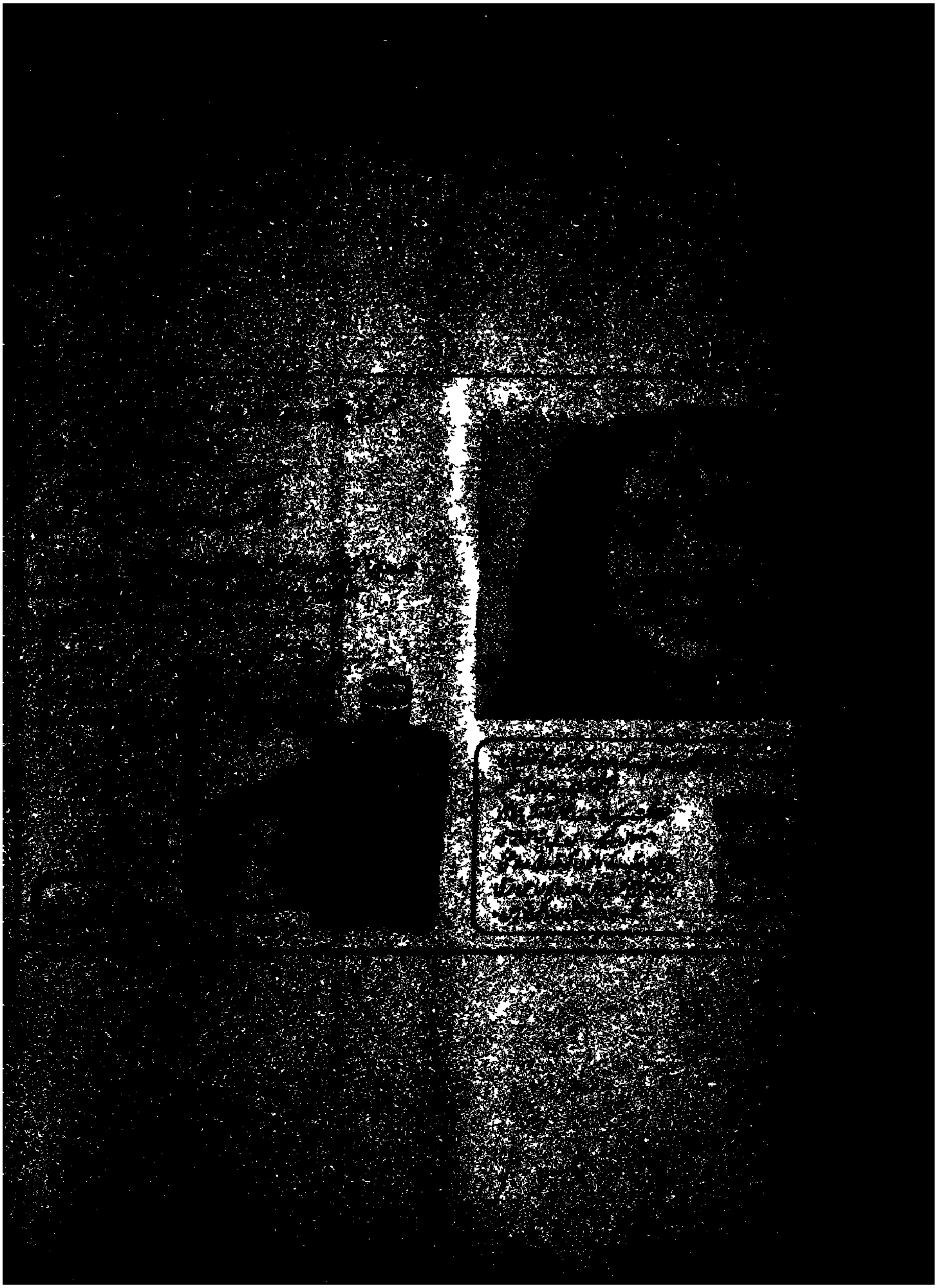
- اردو نظم میں عصری آگہی : عمیق حنفی
- میں کیا لکھتا ہوں : اجمل اجملی
- ہیئت کے تجربے : عنوان چشتی
- عصری آگہی اور اردو نظم : اسلم پرویز
- مقطع میں آپڑی ہے ..... : انور صدیقی

اور

- شیت سیمنار ایک رپورتاژ : قاضی عبدالستار

دہلی سیمینار
حصہ اول
قیمت : ۲ روپے

نذر
- سجاد ظہیر
- احتشام حسین



پہلا حصہ
قیمت: ۲ روپے

جولائی اگست ۱۹۷۴ء

لکھنؤ

ماہنامہ

کپور مارکیٹ لکھنؤ ۳

اردو ادب میں عصری آگہی

اداریہ

شاعری

سیمینار ایک رپورتاژ

۳ مختصر افسانے

آزادی کے بعد

تبصرے

تخلیق، تنقید، شاعری

• ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر: شمیم الدین • طباعت: نامی پریس
• کتابت: وقار حسن • پتہ: کپور مارکیٹ لکھنؤ

پہلا ورق

ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم نو کی کوششیں اس وقت ملک میں جگہ جگہ ہو رہی ہیں۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اہم ادبی مراکز دہلی، لکھنؤ، بمبئی، حیدرآباد، مالیگاؤں، الہ آباد ـــ اور متعدد دوسرے شہروں میں ترقی پسند ادیبوں کے جلسے کسی قدر پابندی سے ہونے لگے ہیں اور ان میں شرکت کرنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ تحریک کی اس نئی شیرازہ بندی میں پرانے اور مشہور ترقی پسندوں اور ان لوگوں کے علاوہ جو تحریک سے بعض اسباب کی وجہ سے برگشتہ خاطر ہو گئے تھے، نوجوان اور نئے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد دلچسپی لے رہی ہے۔

گذشتہ سال دہلی کے ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے "اردو ادب میں عصری آگہی" کے موضوع پر ایک دو روزہ سیمینار ہوا تھا جس میں افسانہ، شاعری اور تنقید کی رفتار ترقی اور مسائل پر تقریباً ڈیڑھ درجن مضامین پڑھے گئے تھے اور ان مضامین میں پیش کیے جانے والے مسائل اور نقطۂ نظر پر کھل کر مباحثہ ہوا تھا۔ اس مباحثہ اور سیمینار کی خاص بات یہ تھی کہ مجلس صدارت سے لے کر حاضرین تک سارے ہی لوگ، خواہ وہ ترقی پسند ہوں یا ان کے مخالف یا ترقی پسندی اور اس کے حریف نقطۂ نظر کے درمیان ایک درمیانی راہ کے متلاشی، کھلے دل و دماغ سے ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے کے ارادہ ہی سے یکجا ہوئے تھے۔ اس سیمینار کی کامیابی کا اصل سبب یہی تھا۔

کتاب نے اس سیمینار میں پڑھے جانے والے سارے مضامین اور مباحثہ پر مشتمل ایک خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تھا تاکہ ان ساری چیزوں کو ایک جگہ محفوظ کر لیا جائے لیکن ابھی اس نمبر کی تیاریاں مکمل بھی نہ ہو پائی تھیں کہ کاغذ کا بحران اس طرح پیدا ہو گیا کہ خاص نمبر تو دور کی بات خود کتاب کا وجود خطرہ میں پڑ گیا۔ اس دوران ایسے لمحے بھی آئے جب تیرہ برسوں کا یہ سفر یکلخت ختم ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ لیکن ترقی پسند سیمینار نمبر پیش کرنے کا جو وعدہ ہم قارئین اور خود منتظمین سیمینار سے کر چکے تھے اس کی 'لاج' نے شائد کتاب کو ایسے حالات میں بھی زندہ رکھا جن میں بڑے مالی وسائل رکھنے والے جریدے بھی ڈوبتے جا رہے تھے۔

ہمیں جہاں اس بات کی خوشی ہو کہ یہ نمبر آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو وہاں اس بات کا افسوس بھی ہو کہ حالات کے ہاتھوں ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ موجودہ شمارہ سیمینار کے اس اجلاس میں پڑھے جانے والے مضامین پر مشتمل ہے جو شاعری سے متعلق تھا۔ قاضی عبدالستار کے ایک طویل رپورتاژ کے علاوہ سجاد ظہیر کا ایک مضمون بھی اس نمبر میں شامل ہو ـــ یہ بنّے بھائی کا شائد آخری اردو مضمون ہو کیونکہ سیمینار کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ لندن اور پھر وہاں سے روس چلے گئے تھے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

سیمینار کے دعوت نامہ میں ترقی پسند ادیبوں کی کنوینر کمیٹی نے اپنے اعلانیہ میں کہا تھا: "ہر عہد کا ادب اپنے زمانہ کی حقیقتوں کا فنی اظہار ہوتا ہو۔ زندگی کا عرفان ہی اسے قوت، انفرادیت اور حسن عطا کرتا ہو۔ گذشتہ پچیس برسوں کے اردو ادب میں عصری زندگی کو جو فنی آگہی، حقائق کے احساس و ادراک کی جو لہریں ہیں، جن نئی سمتوں کی تلاش، نئی کروٹوں کا شعور، نئی انسانی الجھنوں کا کرب اور نئے خوابوں کی روشنی ہو، وہ کیا ہے؟" ـــ گویا سیمینار کسی طے شدہ اصول، نظریہ، نتیجہ کی تبلیغ کے لیے نہیں بلکہ ادب اور زندگی کے

رشتہ اور اس رشتہ سے پیدا ہونے والے سوالوں اور ان کے جوابوں کی جستجو کے نام معنون تھا ـــ اور ہوا بھی یہی۔ اس اجلاس میں شاعری میں عصری آگہی کے [illegible] لکھنے والے مختلف تھے۔ خلیق حنفی، عنوان چشتی، اسلم پرویز، انور صدیقی اور احمد اجملی نے اپنے مختلف سوال نہایت [illegible] ان مضامین میں ترقی پسند تحریک کے ایک دور کی تنگ نظری کا شکوہ بھی تھا۔

اس نقطۂ نظر سے تعلق بھی جو زندگی کو ادب کا موضوع ماننے کے لیے تیار نہیں۔

عمیق حنفی کے مضمون میں شاعر کی انفرادیت کا پاس رکھتے ہوئے اسے اپنے عہد کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے لیکن اس عہد کی پشت پر ساری تاریخ، سارے علوم، سارا انسانی تجربہ، سارا سماج، اس کی ساری شکستیں اور محرومیاں ہیں اور اس کے سامنے سارے خواب اور ان خوابوں کے سچ بن جانے کی راہ میں رکاوٹیں۔ اور یہ شاعر ہے خود عمیق حنفی جس نے اپنے مقالہ کو جسے غالب اکیڈمی کے بھرے ہوئے ہال کی ایک ایک کرسی نے پوری توجہ اور دلچسپی سے سنا' ان الفاظ پر ختم کیا: "میری بڑی خواہش ہو کہ میں اور میرے ساتھی اور میرے نو عمر ہم سفر آج کی زندگی اور معاشرت کی پیچیدگیوں کے احساس اور شعری تجربہ کو پیغمبرانہ تمام جہات کے ایک نئے محاکاتی اور مکالماتی قوت سے بھرپور اور سیدھی سادی یا طنز اور تناؤ سے بھرپور بہت سنسنا دینے والی اور آر پار نظر آنے والی زبان میں پیش کر سکیں اور شعریت کے ایک نئے تصور کو جنم دے سکیں۔"

اسلم پرویز نے تخلیقی قوت کے کسی بھی اہم اور کارآمد اظہار کے لیے عصری رجحانات کی موجودگی کو لازمی قرار دیتے ہوئے کہا: "شاعر کی تخلیقی قوت ہمیشہ خارجی زندگی کے اجزاء و عناصر سے ہم آہنگ ہو کر ہی اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔" لیکن انہوں نے "دستوری قسم کی ترقی پسندی" کو محلِ نظر قرار دیتے ہوئے ان شاعروں کی اہمیت پر زور دیا جن کی حیثیت ان کے نزدیک "اہلِ شریعت کے مقابلہ میں اہلِ طریقت کی سی ہے۔" انہوں نے ادب میں کفر و ایمان کے فتووں کی مخالفت کی لیکن "شاعری کی معنویت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے "قلم سے زیادہ اور چیزوں سے بھی کام لینے" کو ضروری قرار دیا۔

انور صدیقی نے اپنے مضمون میں جو انہوں نے سیمینار کے پہلے دن کے اجلاسوں کے بعد لکھا تھا امریکا اور فرانس اور برطانیہ کے چند اہم جدید، شاعروں اور ادیبوں کے خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "کیا ہم جدیدیت کو اپنا کر اس تصورِ انسانی کو قبول کریں گے جو مغلوب، محدود، محصور، مجہول، گناہ آلود، نامکمل اور زندگی اور سماج کو بدلنے کے عزم سے ناآشنا ہو۔ کیا واقعی ہماری تہذیب، مذہب اور مسلک نے ایک ایسے ہی انسان کا تصور دیا ہے۔"

پہلے دن کے دونوں اجلاسوں میں ترقی پسندی پر بھی حملے کیے گئے تھے اور ترقی پسندوں پر بھی براہ راست نہ سہی لیکن بالواسطہ طور پر ضرور کمیونسٹ پارٹی بھی نکتہ چینی کا شکار بنی تھی اس لیے جب اجمل اجملی جو باقاعدہ کمیونسٹ ہیں اپنا مضمون پڑھنے کھڑے ہوئے تو سارے ہال کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ ان کے مضمون کا موضوع وہ ترقی پسند شاعر تھا جس کا نام اجمل اجملی ہے۔ انہوں نے کہا: "دوستو! میں کمیونسٹ ہوں اور مجھے فخر ہو کہ میں پچھلے ۲۰ سال سے اس جماعت سے تنظیمی طور پر وابستہ ہوں اور ایک ادیب اور ایک کمیونسٹ کی ایمانداری کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے پارٹی سے وابستگی کی ۲۰ سالہ زندگی کے دوران ہزارہا احکامات موصول ہوئے ہیں لیکن کبھی یہ حکم نہیں ملا کہ تمہیں یہ کہنا ہو اور یہ نہیں کہنا ہو یا تم فلاں موضوع پر ایک نظم لکھ دو۔"

عنوان چشتی نے شعری تخلیق کے مختلف مراحل میں عصری آگہی کی کارفرمائی پر زور دیتے ہوئے کہا "فن میں زندگی اور توانائی عصری آگہی سے ہی آتی ہے۔" انہوں نے "تجربوں کے نام پر کاریگری اور آگہی کے نام پر اندھیروں کے امکانات" کو غلط قرار دیتے ہوئے عصری آگہی کو مثبت قدروں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کا ہمنوا قرار دیا۔

قاضی عبدالستار کے رپورتاژ کو جو دہلی سیمینار کے علاوہ علی گڑھ اور اورنگ آباد کے سیمیناروں پر بھی محیط ہے، ان کی زبان، ایک افسانہ نگار کی کردار نگاری، موضوعات کی بوقلمونی اور حیدرآباد کی سیاہ اور علی گڑھ اور دہلی کی ابھری ہوئی مٹی کی آمیزش نے گزشتہ دس پندرہ برس کے سارے ادبی مباحث کا "عکاس" بنا دیا ہے۔

باقی صفحہ ۷۰ پر

سجاد ظہیر

اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کا سیمنار
چند تاثرات

دہلی میں اُردو، ہندی اور پنجابی کے بہت سے ترقی پسند ادیب رہتے ہیں اور یہیں پر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا مرکز بھی ہے عام طور سے ہمارے جلسوں میں ان تینوں زبانوں کے ادیب شریک ہوتے تھے۔ لیکن کچھ عرصے سے ہمارے کاموں میں ڈھیلا پن آگیا تھا۔ اُردو کے ترقی پسند ادیبوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو اپنا جلسہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے علاوہ جلسے منعقد کیا کریں۔ اس غرض سے چھ سات افراد کی ایک کمیٹی چنی گئی (جس کے ممبران تھے حسن نعیم، انور عظیم، ڈاکٹر سلیفی بریلی، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نقی حیدر، ڈاکٹر اجمل اجملی اور ڈاکٹر قمر رئیس (کنوینر) اس کمیٹی نے بڑی مستعدی اور باقاعدگی سے، ہر ماہ غالب اکاڈمی بستی نظام الدین میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کے جلسے منعقد کرنا شروع کر دیے۔ ہر جلسہ پہلے سے زیادہ کامیاب ہوتا گیا، شریک ہونے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی اور اپنی معنویت اور افادیت کے لحاظ سے بھی۔

ترقی پسند ادیبوں کی کمیٹی نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ ان جلسوں میں شرکت کے لئے صرف جانے پہچانے ترقی پسند ادیبوں کو ہی مدعو نہ کیا جائے بلکہ ایسے ادیبوں اور ادب نواز دوستوں کو بھی آنے کی دعوت دی جائے جن کا کسی خاص ادبی گروہ سے تعلق نہیں ہے، یا جو ترقی پسندوں کی انجمن یا ترقی پسند تحریک سے کسی خاص سبب سے منسلک ہونا نہیں چاہتے۔

دہلی کے ترقی پسند ادیبوں اور ان کی کمیٹی کی نظریں، دہلی کے باہر، وسیع تر اُفق پر بھی پڑ رہی تھیں اور گو کہ اُن کے پاس مادّی وسائل کی کمی تھی، لیکن حوصلے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس دہلی کے باہر علی گڈھ، لکھنؤ، الہ آباد، پٹنہ، گیا اور دیگر مقامات پر اُردو کے ترقی پسند، نیز بعض دیگر دوست ادیبوں سے خط و کتابت کر رہے تھے اور اُن کے سامنے دہلی میں ایک دو روزہ سیمنار کرنے کی تجویز پیش کر رہے تھے۔ تجویز یہ تھی کہ اس سیمنار میں آزادی کے بعد کے اُردو ادب (افسانہ، شعر، تنقید) کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے اردو ادب کے مسائل پر بحث کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہمارا ادب کس حد تک شعری آگہی اور وہ کس حد تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

اس خط و کتابت سے ترقی پسند ادیبوں کی تنظیمی کمیٹی کو یہ خوشگوار احساس ہوا کہ دلّی کے باہر ادبی حلقوں میں بھی اسکی بڑی خواہش ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا اجتماع کیا جائے، اُردو ادب کی موجودہ صورتِ حال پر، ترقی پسند نقطۂ نظر سے تبادلۂ خیال کیا جائے اور ترقی پسند ادبی تحریک اور تنظیم میں جو خامیاں اور کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں انھیں اجتماعی طور پر دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ جہاں بھی اور جس کسی کو بھی خط بھیجا گیا وہاں سے سیمنار کی تجویز پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ جن لوگوں سے مختلف موضوعات پر مقالہ لکھنے کی درخواست کی گئی انھوں نے اس پر اپنی آمادگی ظاہر کی اور متعدد

دوستوں نے یہ اطلاع بھی دی کہ نئی دہلی کے سیمنار میں شریک ہوں گے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اسلئے کہ دہلی آنے کا کرایہ خود اُن کو ہی برداشت کرنا تھا۔

---

۱۳ مارچ کی صبح کو، غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین کی خوشنما نئی عمارت کے ہال میں ترقی پسند ادیبوں کا سیمنار شروع ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ سیمنار ہونے کے تھوڑا پہلے ہی سے ہال بھر گیا یعنی تقریباً دو سو افراد اس میں شرکت کر رہے تھے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے سیمنار کے پہلے اجلاس کی مجلس صدارت کیلئے تین صاحبوں کو ڈائس پر مدعو کیا۔ یہ تھے قاضی عبدالستار، ناول اور افسانہ نگار جو علی گڑھ سے تشریف لائے تھے، اقبال مجید، افسانہ نگار جو لکھنؤ سے آئے تھے اور بلراج مینرا، افسانہ نگار جو دہلی کے ادیبوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور جنھوں نے ہماری سرگرمیوں کے آغاز سے ہی تمام کاموں میں تنظیمی کمیٹی کا ہاتھ بٹایا تھا۔

سیمنار کے اس پہلے اجلاس میں آزادی کے بعد کے اُردو افسانے پر انور عظیم، کوثر چاند پوری، رضیہ سجاد ظہیر، اقبال مجید اور عابد سہیل نے اپنے مقالے پڑھے۔ حالانکہ ان مقالوں کا موضوع ایک ہی تھا اور یہ سب مقالہ نگار ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ اپنے اسلوب، زاویۂ نگاہ اور تنقیدی رائے کے اعتبار سے ان میں یکسانیت نہیں تھی اور یہ بھی ظاہر تھا کہ مقالہ نگاروں نے اپنے کام پر محنت کی ہے۔ ان مقالوں کو سن کر اردو افسانے کی موجودہ صورت حال، نیز ترقی پسند ادب کے اُس نقطۂ نظر کے مابین جسے جدیدیت کا نام دیا گیا ہے اختلاف اور فرق کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔

چائے کے وقفہ کے بعد مقالوں پر بحث کا آغاز ہوا۔ انتظامی کمیٹی نے اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ سیمنار میں شرکت کے لئے زیادہ سے زیادہ سنجیدہ ادیبوں اور نقادوں کو مدعو کیا جائے اور سب کو اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ بحثیں اور اعتراضات اور مخالف نظریے خاموشی اور سنجیدگی سے سُنے گئے اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوئی کہ اُسے بولنے کا موقع نہیں ملا یا اُسکے دوران تقریر گڑبڑ کی گئی۔ صرف حیات اللہ انصاری صاحب کسی قدر ناراض ہوئے جب صدر نے اُن کو یاد دلایا کہ وہ متعینہ وقت سے زیادہ لے چکے ہیں۔ پہلے اجلاس میں اظہار اثر، شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سید محمد عقیل، سجاد ظہیر، عابد سہیل، انور عظیم اور نیاز حیدر نے بحث میں حصہ لیا۔

سیمنار کا دوسرا اجلاس ۱۳ مارچ کو ہی دوپہر سے شروع ہوا۔ اس کا موضوع اُردو تنقید تھا۔ اس اجلاس کی صدارت دیوندر اسر (دہلی)، عابد سہیل (لکھنؤ) اور افصح ظفر (گیا) نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر سید محمد عقیل (الہ آباد)، دیوندر اسر، ڈاکٹر شارب ردولوی (دہلی)، آغا حیدر (دہلی)، اور افصح ظفر (گیا) نے اپنے اپنے مقالے پڑھے اور چائے کے وقفے کے بعد ان مقالوں پر عام بحث شروع ہوئی۔ بحث میں موہن سنگھ جوش (بزرگ کمیونسٹ رہنما اور پنجابی کے ادیب)، عمیق حنفی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شریف احمد اور ڈاکٹر عقیل نے حصہ لیا۔

سیمنار کا تیسرا اور آخری اجلاس دوسرے دن، ۱۴ مارچ کی صبح کو شروع ہوا۔ اس کا موضوع اُردو شاعری میں عصری آگہی تھا۔ اس اجلاس کی صدارتی مجلس ڈاکٹر عقیل، حسن نعیم اور کمال احمد صدیقی پر مشتمل تھی۔ اس اجلاس میں عنوان چشتی (دہلی)، عمیق حنفی (دہلی)، ڈاکٹر اجمل اجملی (دہلی)، انور صدیقی (دہلی) اور ڈاکٹر اسلم پرویز (دہلی) نے مقالات پڑھے اور اس کے بعد بحث میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سجاد ظہیر، کمال احمد صدیقی، حیات اللہ انصاری، وقار رنجیب، کوثر چاند پوری، قاضی عبدالستار، زبیر رضوی، شریف احمد، عابد سہیل، دلیپ باول نے حصہ لیا۔ آخر میں نیاز حیدر نے اپنے خیالات کا اظہار ایک تازہ نظم کے توسط سے کیا۔

مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ میں نے یہاں صرف نام

گنا دیے ہیں اور یہ سیمنار کی خوبی یا خرابی پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے میرے پاس اُن مقالوں کی نقل نہیں ہے جو سیمنار میں پڑھے گئے۔ یہ ہمارے سیمنار کی ایک کمی تھی کہ اُس میں پڑھے جانے والے مقالے، پہلے سے حاصل کر کے سائیکلو اسٹائل نہیں کئے گئے تھے اور انھیں حاضرین میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ان مقالوں کو صرف ایک بار سُن کر اور اُن پر ہونے والی بحثوں کے متعلق محض اپنی یاد کے بھروسے پر، کوئی سنجیدہ رائے قائم کی جا سکے۔ اس لئے میں یہاں پر صرف اپنے عام تاثرات بیان کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ تاثرات ناکافی ہوں یا غلط فہمی پر مبنی ہوں، بہر حال میں صرف انھیں کو پیش کر سکتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ تمام مقالوں کا معیار یکساں نہیں تھا اور نہ بحث میں حصہ لینے والوں کی گفتار کا معیار۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ان مقالوں اور مباحث سے مجھے اتفاق تھا یا نہیں، بحیثیت مجموعی یہ محسوس کیا جا سکتا تھا کہ سیمنار کا علمی، تحقیقاتی، نظریاتی اور تہذیبی معیار (کل ملا کر سولہ مقالے پڑھے گئے اور بیس سے زیادہ شرکا نے بحثوں میں حصہ لیا) بلند تھا۔ بیشتر مقالے غور و فکر، تفتیش اور محنت کر کے لکھے گئے تھے، خاص طور پر ڈاکٹر عقیل، عتیق حنفی، عنوان چشتی، عابد سہیل، افصح ظفر، تقی حیدر، رفیعہ سجاد ظہیر اور اجمل اجملی کے مقالے (افسوس ہے کہ میں صدیق الرحمٰن قدوائی کا مقالہ سن نہیں سکا)۔ ایسے تھے جنھیں سُن کر محسوس ہوا کہ زمانۂ حال کے اُردو ادب، اُس کے مختلف نظریاتی رجحانات، ترقی پسند نقطۂ نظر اور اس کے مخالف نظریات اور موجودہ ادبی تخلیقات کی خوبیوں اور کمزوریوں کے متعلق ہمیں زیادہ واقفیت حاصل ہو رہی ہے۔ ان مقالوں اور بحثوں کو سُن کر یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ ادبی نظریات کے تضادات، اور مختلف اسالیب اور فنی اختلافات کے تجزیے اور تشریح کے ذریعہ ہمارے ادبی شعور میں مجموعی طور سے زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی اور فی الجملہ ترقی پسند ادب کی پیٹھ سے زنگ دینے اور اسے بہتر بنانے کے لئے خود اعتمادی اور نیا حوصلہ پیدا ہوگا۔

ترقی پسند مقالہ نگاروں اور بحث میں حصہ لینے والوں نے اُردو کے گزشتہ بیس پچیس سال کے نثری اور شعری ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اُس بنیادی نقطۂ نگاہ کا اعادہ کیا کہ ادب میں انسان کی سماجی اور انفرادی زندگی، اور انسانوں کے باہمی رشتوں سے پیدا ہونے والی کیفیات کا ذکر ہوتا ہے اور زندگی کا کوئی بھی چھوٹا یا بڑا مسئلہ ادب کے میدان سے باہر شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم شعوری طور پر، اور زندگی کے تجربے سے ان مسائل کی واقفیت حاصل کرتے ہیں، اور ہمارا تحت الشعور بھی انھی تجربات اور انھیں ردِّ عمل سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ خیالات، تصورات، جذبات، شعور اور علم ادبی تخلیق کی "مادی" بنیادیں ہیں۔ ادیب اور فن کار اپنی ہنرمندی، اپنے فہم و شعور، فراست اور سمجھداری کو کام میں لا کر انھی مواد و وسائل سے اپنے فن پارے کی تشکیل کرتا ہے۔

لیکن زندگی کے کارزار میں جہاں انصاف، رواداری، صلح، شرافت، انسانی وقار، انسانی آزادی، فلاح و بہبود کو حاصل کرنے کے لئے انسان ظلم و استحصال، جنگ، خونریزی، تذلیل و تحقیرِ نفس کی سیاہ طاقتوں کے خلاف ہر لحظہ اور ہر لمحہ کسی نہ کسی طرح سے دوچار اور نبرد آزما ہیں کوئی باضمیر ادیب اور فن کار غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ تخلیق و تعمیر و حسن کاری کا، تہذیب و تزکیۂ نفس کا جو شعلہ ہے سچے اور باشعور اور ایماندار فن کار کے سینہ میں فروزاں ہوتا ہے، اُسے ہر لمحہ اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ باطل کے خلاف حق کے لئے، قبح کے خلاف حسن کے لئے، تاریکی کے خلاف روشنی کے لئے اور انسانیت کی تذلیل کے خلاف اُس کی تشریف و تکریم کے لئے سینہ سپر ہوتا ہو اور اپنے ہنر اور فن کی تمام طاقت اور صلاحیت کو اسی تبدیلی اور انقلاب کو لانے کے لئے بروئے کار لائے۔

موجودہ زمانے میں اس انانیت زدہ نظریۂ ادب کی

بماہ راست مخالفت کرنا دشوار ہے اور ترقی پسند ادبی نقطۂ نظر کے مخالف ایسا کرنے کی جرأت بھی نہیں کرتے۔ تاہم اس نظریہ کے شدید مخالف موجود ہیں۔ اُردو میں آج کل ان کو جدیدیت پسند کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اگر جدیدیت کو اسکے لغوی معنوں میں استعمال کیا جائے تو اُس میں اور ترقی پسندی میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں ہے۔ معنی اور ہیئت دونوں کے لحاظ سے جدید سے جدید تر کی تلاش ہر سچے فن کار کی پہچان ہے۔ جہاں تک معنی، مطلب اور مقصد کا تعلق ہے اگر وہ حقیقت پہ مبنی ہے تو حقیقت ہر لحظہ تغیر پذیر اور اضافی ہے، خاص طور پر ہمارے دور میں جب کہ دنیا میں اور ہمارے ملک میں انقلابی حالات پیدا ہو رہے ہیں، جب جاگیری نظام اور سرمایہ داری اور استعمار زوال پذیر ہیں اور نوع انسانی معیشت، سیاست، تہذیب واخلاق، نیز نظریاتی اعتبار سے اشتراکیت کے دور میں داخل ہو رہی ہے اور سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی نے انسان کو مہر و ماہ و مشتری کا ہم عناں بنا دیا ہے اور دنیا کے محنت کش عوام اپنی غلامی کی زنجیریں توڑ کر سرخرو اور سرافراز ہو رہے ہیں۔

لیکن یہ تبدیلی، پستی سے بلندی کی طرف جاتی ہوئی ایک سیدھی لکیر کی طرح نہیں ہوتی۔ وہ ہر میدان میں، خاص طور پر نظریات و عقائد، تہذیب اور کلچر کے میدان میں اونچے نیچے راستوں، تضادات و تصادم اور پُرپیچ مراحل سے گزر کر ہی بلندی اور کامیابی کی جانب بڑھتی ہے۔ اس پر سے گزرنے کے لئے ضروری ہے، اندرونی اور بیرونی دونوں معاملوں میں، نئے حالات، نئی حقیقتوں، نئی دشواریوں اور رکاوٹوں کو سمجھنے اور اُن کا شعور حاصل کر کے اُن پر عبور حاصل کرنے کے لئے ہم علمی اور سائنسی غور و فکر کی جدید ترین صلاحیت اور لیاقت پیدا کریں۔ ترقی پسند اگر ایسا نہیں کریں گے تو پس ماندگی بلکہ رجعت کی راہوں میں بھٹک جائیں گے۔

نئی اور جدید معنی شناسی۔ نئی ہیئت اور نئے لہجہ کا

بھی مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنی مستحسن روایتوں اور اپنے پورے تہذیبی ورثہ کو رد کریں، لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ ادب کے میدان میں ہم کو جو ورثہ اپنے پیش روؤں سے ملا ہے اس کو نئے معانی، نئے اور انسانیت نواز مقاصد کا اظہار کرنے کے لئے نئے اور نادر انداز سے استعمال کریں اور اس طرح اپنے قومی اور انسانی کلچر کے لازوال خزانے میں اضافہ کریں۔

مگر وہ لوگ جو جدیدیت کے علم بردار ہیں ایسا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ جب ادب میں مقصد و معنی اور انسانیت نوازی کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ ہم سے اُلٹ کر پوچھتے ہیں، کون سا مقصد؟ ان کا فرمانا ہے کہ موجودہ دور تمام انسانی اقدار کی شکست و ریخت کا دور ہے، ان حالات میں انسان روحانی طور پر زخم خوردہ ہے اور وہ بے شمار شعوری الجھنوں میں گرفتار ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے (جو اس سیمنار میں ہمارے معزز مہمان تھے اور جنھوں نے کئی بار مباحث میں حصہ لیا)

جدید شاعری "ایک طرف خواب و آگہی اور دوسری طرف وقت و موت کی قوتوں کے درمیان معلق ہے اور زندگی کی معنویت کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ یہ زندگی کے اصلی چہرے کو جیسا کہ وہ غم و مسرت کے لمحوں میں نظر آتا ہے پہچاننے کی کوشش کرتی اور حال کے لمحۂ حالیہ میں جینا چاہتی ہے۔ مستقبل کی یہ شاعری قائل نہیں ہے۔ اسے خود نہیں معلوم کہ انسانیت کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ سنسار اس کے نزدیک سنسار ہی ہے اور پاگل کا سپنا۔"

ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی فرمایا ہے:-

"یہ دور آگہی کے آشوب کا دور ہے۔ آج کا انسان اپنے شعور کے ہاتھوں پریشان ہے اس کے دکھ درد اور غم کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ اس کی الجھنیں اور مسائل پچھلے دور کے انسان کی الجھنوں اور مسائل سے مختلف ہیں اور ان کا کوئی حل بھی اس دور کے انسان کو نہیں سوجھا۔ اسلئے یہ شاعری نتائج کی یا پیغام کی شاعری نہیں ہے۔"

(یہ اقتباسات ڈاکٹر نارنگ صاحب کے ایک مضمون سے لئے گئے ہیں جو نقوش لاہور شمارہ ۱۰۹ میں شائع ہوا ہے یہ سیمنار میں بھی

ڈاکٹر صاحب نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا)

ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ جدیدی نقطۂ نظر رکھنے والے اُدبا حضرات کے نزدیک زندگی ایک پاگل کا سپنا ہے، اور یہ کہ اُنھوں نے زندگی کی تمام اقدار کو رد کر دیا ہے اور انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ انسان کی اگلی منزل کیا ہے، اور یہ کہ وہ بے شمار شعوری اُلجھنوں میں گرفتار ہیں اور اُن کی تخلیقات میں انہی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن ہم ترقی پسند چاہتے ہیں کہ ہمیں زندگی اور انسان پر، اُن کی ہزار حشر سامانیوں کے باوجود بھروسہ رکھنے، زندگی کا زیادہ اور بہتر شعور حاصل کرنے، اور تاریخ کے اس عظیم اور انقلابی دور میں اُن قوتوں کا ساتھ دینے اور اُن عوامل پر کاربند ہونے کی اجازت دی جائے جو زندگی کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دور فرسودہ اور ناکارہ اقدار اور ان کے مطابق نظامِ حیات کو چلانے کی کوشش کرنے والوں کی شکست و ریخت کا دور ہے، اور یہ دور نئی، درخشاں اور مثبت اقدار کے قائم ہونے کا بھی دور ہے۔ ہم ہی نہیں دنیا کے کروڑوں انسان، مظلوم، پریشاں حال، زخم خوردہ اور ستم رسیدہ انسان اِن نئی اقدار پر یقین رکھ کر، اپنے شعور، اتحاد اور قوتِ عمل سے اُن المناک حالات کو بدلنا چاہتے ہیں، جو اُن مادّی، ذہنی اور روحانی کیفیات کو جنم دیتے ہیں جن کے سبب سے، مایوسی، پست ہمتی، بے یقینی اور انسانیت کُش خود پسندی، انانیت اور تنہائی کا احساس بعض افراد میں پیدا ہوتا ہے۔ ان کیفیات کے شکار افراد کو کبھی کبھی اس کا علم بھی نہیں ہوتا کہ استحصال اور ظلم و جبر کرنے والے صاحبِ اقتدار بورژوا گروہ اور اُن کے طرفدار مبلغ ان غیر انسانی اور روحانی کرب و اذیت کے حالات پیدا کرنے کے بعد اُن دانش وروں کو جو اس کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ یقین دلانے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں آرٹ اور فن، ادب اور فلسفے کا "لاجواب" اظہار بھی انہی کیفیات کے حامل دانشور کر سکتے ہیں۔ یوں اِس استحصالی گروہ کے مقصد برآری ہوتی ہے، اس لئے کہ اس طرح بہرحال، دانشوروں کا ایک حصّہ تو اس کارزار میں شامل لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے، جو سرمایہ داری اور سامراج، استحصال اور ظلم کرنے والے نظامِ حیات کے خلاف جہاد کو، موجودہ زمانے میں، سمجھدار اور باضمیر انسانوں کا سب سے شریف فریضہ سمجھتے ہیں۔

دہلی میں منعقد اردو کے ترقی پسند ادیبوں کے سیمینار، اُن میں پڑھے گئے بیشتر مقالات، سیمینار کے مباحث، اس کی سنجیدہ فضا، نیز اس اجتماع میں شریک ہونے اور اُس میں دلچسپی لینے والے دانشوروں کی کثیر تعداد سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اردو کے ترقی پسند ادیب (جن میں نوجوان ادیبوں کی اکثریت تھی) ترقی پسند ادبی تحریک سے اس کی موجودہ نظریاتی اور تنظیمی خامیوں کو باہمی صلاح و مشورے، اپنے اتحاد اور اپنی عملی سرگرمیوں سے دور کرنے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ سیمینار منعقد کرنے والی کمیٹی نے باہر سے آنے والے ادیبوں اور اپنے سرگرم شرکاء کار سے مشورہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ چند ماہ کے اندر اردو ادب کے دیگر مراکز جیسے لکھنؤ، الہ آباد وغیرہ میں بھی اردو ادیبوں کے سیمینار منعقد کئے جائیں، لکھنؤ کے رسالے "کتاب" کو معنوی اور مادی اعتبار سے مضبوط بنایا جائے، اور جس جگہ بھی ہو سکے ترقی پسند ادیبوں کے حلقوں کو سرگرمِ عمل بنایا جائے۔ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی دہلی کمیٹی اِن مساعی کو مرکزیت دے گی۔ لیکن ان تمام فیصلوں سے زیادہ اہم کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر قمر رئیس کی وہ آخری اپیل ہے جو انہوں نے اپنے رفیقوں سے اس تمام کارروائی کے اختتام پر کی۔ اور وہ یہ تھی کہ "ہم سب زیادہ اور بہتر لکھنے کی کوشش کریں۔"

لیکن نیک ارادوں اور زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہونے کا۔ لینن نے کہا ہے کہ "جہنم کو جانے والی سڑک نیک ارادوں سے ہی پٹی پڑی ہے" دیکھنا یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم کرتے کیا ہیں۔

■■

قومی بچت ادارہ کی طرف سے

یکم اپریل 1974ء سے
شرح سود بڑھادی گئی ہے۔

کھاتے اور کفالت کا نام	پرانی شرح سود (سالانہ)	نئی شرح سود (سالانہ)
ڈاک گھر سیونگز بنک •	4%	5%
7-سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ۔ (دوسرا اور تیسرا اجراء)•	5%	5%
7-سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ۔ (چوتھا اور پانچواں اجراء)	7.5% (مرکب)	8.25% (مرکب)
ڈاک گھر کے میعادی ڈپازٹ:		
1- سالہ	6%	6.75%
2- اور 3- سالہ	7%	7.5%
5- سالہ	7.25%	8%
ڈاک گھر کے 5- سالہ مکرر ڈپازٹ کھاتے۔	6 75%	7.25%
ڈاک گھر کے 10- سالہ اجتماعی میعادی ڈپازٹ کھاتے ••	4.75%	5.25%
15- سالہ پبلک پراویڈنٹ فنڈ کھاتے ••	5 3%	5.8%

• سود ٹیکس سے مستثنیٰ۔
•• ٹیکس میں رعایت اور سود بھی ٹیکس سے مستثنیٰ۔
دوسری اسکیموں پر 3000 روپے سالانہ تک سود، دیگر مخصوص اسکیموں پر ملنے والے سود کے ساتھ، ٹیکس سے مستثنیٰ۔

آج ہی بچت کریں، زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس- 98 ، ناگپور

davp 74/78

عمیق حنفی
۵۷۔ آل انڈیا ریڈیو ہاسٹل۔ نئی دہلی۔۱

اُردو نظم میں عصری آگہی

لاشوں کی چتاؤں پر روٹیاں سینکنے والے اور کفنوں سے کفنیاں تیار کرنے والے ناقدوں کے ہجوم میں ادب اور فن کا گم ہو جانا کم حیرت انگیز بات ہے بالمقابل اس حقیقت کے کہ زندگی خود گم ہو گئی ہے۔ میرے نزدیک زندگی ادب اور فن اور فلسفہ اور سیاست سے عظیم تر اور اہم تر ہے۔ میں نے زندگی کو ہندوستانی، اسلامی اور مارکسی زاویوں سے دیکھا ہے۔ ہندوستان میرا مکان ہے اور اسلام اور مارکسیت میرا زمان۔ تب ہی میں آج کے بہت سے لوگوں کی طرح مجموعۂ اضداد ہوں۔ میں نے کجھراہو، باگھ کی گپھاؤں اور مالوے کے پلیٹو میں زنگار رنگ کھیتوں اور جنگلوں سے عرفان حاصل کیا ہے، مجھے سرمایہ داری، سامراج اور نوآبادیاتی نظاموں کے مشینی تمدن کے شکار بے مغز اور بیدل صنعتی شہروں کی بھیڑ میں پستے ہوئے فرد کے المیے نے سندباد، شہرزاد، شب گشت، سیارگاں اور صوت الناقوس جیسی طویل نظموں کی تخلیق پر بھی اکسایا ہے اور بے یقینی اور بے ایمانی کے روحانی کرب میں مبتلا انسان کی زبوں حالی نے صلصلۃ الجرس جیسی طویل نظم لکھنے کی ترغیب بھی دلائی ہے جسے ناقدین ادب نے "دینی حسیت" کی نظم قرار دیا ہے لیکن اس تمام اضطراب کے باوجود میں نے ہندوستان اور اسلام کی تاریخ کو مارکسی نقطۂ نگاہ سے جب بھی دیکھا ہے بہت سی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ دہریت اور الحاد کی حد تک میں مارکسیت کو قبول کرنے سے قاصر ہوں لیکن میرا شروع سے عقیدہ یہ رہا ہے کہ آج کے دنیا کے معاشی، عمرانی اور معاشرتی مسائل کا حل مارکسی اشتراکیت ہی کی صورت میں ممکن ہے۔ میری ہندوستانیت اور میرا اسلام مجھے الجزائر، کوریا، ویت نام اور فلسطین کے عوام کی جدوجہد میں انکا ذہنی، جذباتی اور روحانی شریک بننے میں حائل نہیں ہوتا۔ اقوام اسلامی کی تاریخ ہو یا ہندوستان کی، میں جبر و ظلم، مکر و فریب، استحصال، مقدر پرستی، سرمایہ داری اور شخصی استبداد کے ادوار کے لیے کسی قسم اعتذار نہیں ڈھونڈھتا۔ گیتا، ویدانت، یونانی، مصری، بابلی، اسیوریائی اور ہندوستانی اساطیر اور مثالی، عملی، مادیاتی اور متصوفانہ فلسفوں میں میری متعلمانہ دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ عربی نہیں سمجھتا لیکن کسی اچھے قاری کی قرأت قرآن مجید کے بے پناہ آہنگ میں مجھے ڈبو دیتی ہے۔ ایکبار ایک اگیاری گھر سے کسی پارسی موبد کی اوستا کی قرأت کان میں پڑی تو میں باہر مبہوت کھڑا رہ گیا۔

اب میری حیثیت کا اور مکان میں میرے مقام کا تعین آپکے لیے آسان ہوگا۔ تو جیسی کہ ہوتی چلی آئی ہے عنوان کا پیٹ بھرنے کے لیے میں یہ کر سکتا ہوں کہ چند نوجوان دوستوں میں چند موضوعات کی فہرستیں بانٹ دوں اور کہوں کہ پچھلے پچیس برسوں میں ان موضوعات پر جو نظمیں اور اشعار ملیں انھیں یا ان کے عنوانات کو موضوعات کے نیچے لکھ دیں۔ مثلاً ایک گروپ میں یہ عنوانات تقسیم کر دوں:

(۱) آزادی، تقسیم ملک، قیام جمہوریت، فرقہ وارانہ فسادات
(۲) گاندھی جی کا قتل
(۳) انقلاب چین
(۴) انقلاب اور جدوجہد کوریا

(۵) جنگِ ویت نام
(۶) الجزائر اور مصر
(۷) لومبا کا قتل
(۸) بنگلہ دیش
(۹) پنج سالہ ترقیاتی منصوبے
(۱۰) ہندوستانی بنکوں کا قومیایا جانا
(۱۱) یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، گجرات، مہاراشٹر وغیرہ کے بعض شہروں کے فرقہ وارانہ فسادات
(۱۲) ۶۵ اور ۷۱ کے ہند و پاک تنازعات
(۱۳) اسٹالن اور نہرو کی وفات
(۱۴) مختلف قحط سالیاں، سیلاب، طوفانِ باد و باراں، آتش زدگیاں
(۱۵) بھاکڑا ننگل، بوکارو، بھلائی، انکلیشور، چنڈی گڑھ، ناگالینڈ وغیرہ کے افتتاحی دن۔
(۱۶) پہلے اسپوتنک سے تسخیرِ ماہ تک کی خلابازیاں وغیرہ

دوسرے گروپ میں یہ عنوانات تقسیم کر دیے جائیں۔
(۱) فرد کی تنہائی اور اجنبیت
(۲) ذات کی شکست و ریخت
(۳) معاشرتی اور روحانی قدروں کا ٹوٹنا اور بکھرنا
(۴) مروت، محبت، ہمسائگی، دوستی، عشق، ہجر و وصال کی لایعنیت
(۵) سمتوں کا سفر
(۶) آریائی اور دراوڑی اجتماعی لاشعور کے دھاروں کا ٹکراؤ
(۷) جنگل کے معاشرے کی طرف مراجعت
(۸) شہری زندگی کی میکانکی اور مشینی رفتار
(۹) ذات کی تلاش
(۱۰) انسانیت کی شناخت وغیرہ

ان تمام موضوعات کے لیے آٹھ آٹھ دس دس مثالیں فراہم کر دی جائیں اور ان پر نا قدوں کی بتوری ہوئی اصطلاحات اور elements کی مدد سے چار چار پانچ پانچ سطریں لکھ دی جائیں تو آزادی کے بعد اردو شاعری میں عصری آگہی کا حق ادا ہو جائے گا۔

علم کی پرکھ اس طرح کی جاتی ہے کہ پہلے موضوع و مواد کو دیکھا جاتا ہے کہ کس قدر ہے؟ کیوں کر ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کتنا تازہ ہے اور ہماری معلومات میں اس سے کتنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بعد اس کے حصول کے اصول اور پیشکش کی صورت پر غور کیا جاتا ہے۔ ادب کا قصہ اس کے برعکس ہے۔ پہلے اس بات کا تعین لازمی ہے کہ جو کچھ سامنے آیا ہے وہ ادب بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا ہے؟ شعر؟ افسانہ؟ ڈرامہ؟ انشائیہ؟ جب اس کے credentials قبول کر لیے جاتے ہیں تب یہ دیکھا جاتا ہے کہ آخر کیا کہا جا رہا ہے۔ جب بات کہنے کا ڈھنگ اور بات دونوں ہموزن نہ نکلیں مزید تحسین، تقدیر اور تخمین کی کوشش غیر ضروری ہو جاتی ہے۔

آیئے۔ Moldavia کی سویت جمہوریہ کے ایک شاعر Grigore Vieru کی ایک نظم آپ کو سناؤں۔ مہاجر شاعر نہیں ہے وہیں رہتا ہے اور انقلاب روس کے ۱۸ برس بعد کی اس کی پیدائش ہے۔

میں نے پھینک دی / اپنی محبوبہ کی انگوٹھی / مولداویہ کے
لق و دق صحرا میں / بہت دور /
اور پھر میں دوڑتا چلا گیا / اس طرح میں نے دوڑنا سیکھا
میں نے گرا دی / اپنی محبوبہ کی انگوٹھی / سمندر میں /
اور پھر میں شوخ و شنگ لہروں میں کود پڑا /
اس کی تلاش میں / اس طرح میں نے تیرنا سیکھا
میں نے اچھال دی / اپنی محبوبہ کی انگوٹھی / ستاروں کی طرف
اور پھر میں نے زمین سے اپنے پاؤں اکھاڑ کر /
جست لگائی / آسمان کی طرف / اس طرح میں نے اڑنا سیکھا

اس عصری آگہی اور کسی نظریۂ فلسفہ و سیاست کی تحریک کے بغیر کہی گئی سیدھی سادی نظم کے جذبے کی صداقت اور تاثر سے انکار کرنا مشکل ہے۔ خوبصورت نظم ہے جس کے شفاف بلک

انسانی دل محبت سے لبریز نظر آتا ہے اور اس کی غنائی دھڑکن سُنی جاسکتی ہے۔ یہ انقلاب کا ثمرہ ہے اور تعمیری دور کی شاعری۔ راجستھان، بہار اور جنگجوؤں کا علاقہ ـــ اپنے لوک گیتوں میں غم، ہجر اور آرزوؤں وصال کے بنیادی جذبے پر شاعری کرتا رہا ہے۔ ماؤزے تنگ اور ہوچی منہ جیسے انقلابیوں نے عین دورانِ انقلاب بڑی خوبصورت اور غنائی نظمیں اور نغمے لکھے ہیں جن میں موسم یا لینڈ اسکیپ کی دلآویزی یا عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں مخدوم محی الدین عملاً بہت بڑے انقلابی تھے اسی لیے ان کی شاعری حسن و عشق اور نغمہ و رقص سے زیادہ عبارت ہے۔ لہٰذا حقیقت کو سطح پر تلاش کرنا حماقت اور سعی لاحاصل ہے۔

عصری آگہی کی میکانکی نشاندہی آسان سہی لیکن ممکن نہیں ہوتی۔ یہ عصری آگہی تخلیق کے درونِ خانہ ہی اپنا اظہار نہیں کرتی کبھی تخلیق کے باہر رہ کر محرک کا کام بھی کرتی ہے۔ کیا شاہنامہ اپنے عہد کے حالات اور حقائق کا اظہار کرتا ہے؟ کیا رام چرت مانس میں آپ کو عہد اکبری کا اودھ نظر آتا ہے؟ نہیں۔ لیکن ہمعصر حالات اور مسائل کی آگہی اور شعور نے ان عظیم شاہکاروں کی تخلیق پر فردوسی اور تلسی داس کو اُکسایا۔ عصری آگہی کو منزلِ مقصود بنا لینے سے زیادہ بڑا کام یہ ہے کہ اسے سنگِ میل کی طرح برتا جائے۔

شاعری کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس پر بالمیک اور ارسطو سے لے کر وزیر آغا تک بہت کچھ کہا سُنا جاچکا ہے لیکن کوئی ایک معیار قایم نہیں ہوسکا۔ دراصل شاعری کی تعریف کسی بھی تعمیم کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اب تو شماریاتی اور کمپیوٹری طریقوں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے تجربے بھی کیے جارہے ہیں۔ ہاں ہر شخص کے ذہن میں اس کا اپنا ایک معیار ہوتا ہے جسے قائم کرنے میں اس کی خاندانی، سماجی، تعلیمی اور پیشہ ورانہ روایات اور تربیت کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ شاعری، فن اور جمالیات کا صحیح تصور قائم کرنے کے لیے جہاں مشرق اور مغرب کے مختلف مفکرین کے نظریات کا گہرا مطالعہ معاون ثابت ہوسکتا ہے وہاں مارکس، اینگلس، لینن، ماؤ، پلیخانوف، کرسٹوفر کاڈویل، لوکاکس، مترناک، ایلیا آشنکو اور مولنرسے نیتھن وغیرہ کا مطالعہ جمالیاتی اور فنی

تحریک کو صحیح سمت دے سکتا ہے۔

"عصری آگہی" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی کوئی حد بندی ابتک نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے اگر میں چاہوں تو اسی صورتِ حال سے بھی فائدہ اٹھاکر تمام اعتراضات سے بچنے کے لیے فرار کی راہیں نکال سکتا ہوں۔ آج کل تنقید ادب میں اصطلاح سازی اور اصطلاح بازی کا شوق بہت عام ہے اور نقادوں اور ادیبوں کے گھروں پر اصطلاح ڈھالنے والی گھریلو صنعتیں قایم ہیں۔ بہر حال "عصری آگہی" کو "اصطلاح" کے محدود دائرے میں رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی معنویت کا تعین کیا جائے۔ کیا عصری آگہی، محض ہمعصر واقعات اور تغیّراتِ حالاتِ حاضرہ سے باخبری کا نام ہے؟ یا ایک ایسی ہوش مندی کو عصری آگہی کہا جاسکتا ہے جو تخلیق کار کے ذہن کے دریچے باہر کی دنیا پر کھلے رکھے؟ یا اپنے زمان و مکان کے ادراک و عرفان کا نام عصری آگہی ہے؟ ذاتی طور پر میں تاریخیت کی روشنی میں حقائقِ حیات و معاشرت کے شعور و احساس کو عصری آگہی کہنا پسند کروں گا۔

شعر کی ہیئت، لفظیات اور اسلوب اس کا آہنگ متعین کرتے ہیں۔ عصری آگہی اور بدلتے ہوئے عمرانی حالات کے تقاضے اس آہنگ اور اسے متاثر کرنے والے عناصر پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ حالات اور عصری آگہی کے یہ اثرات اتنی خاموشی اور لطافت کے ساتھ اپنا کام کرجاتے ہیں کہ ارتقائی منازل سے گزرتے ہوئے شعری آہنگ میں کب کہاں کون سی تبدیلی واقع ہوگئی اس کا پتہ لگانا بڑی مہارت کا کام ہوتا ہے۔ بعض شاعر محض وہ ظروف بناتے رہتے ہیں جن میں مستقبل کے شاعر اپنے فکر و احساس کے تجربوں کو پیش کرے گا۔

اردو شاعری اور اس کے عام قاری اور سامع کے درمیان جو بُعدِ ابلاغ بڑھا ہے اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ شاعروں نے اجنبی اور غیر ملکی پیرایوں اور صورتوں کی ناجائز درآمد کی ہے۔ اسکا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اردو سرکاری، کاروباری اور تعلیمی زبان نہیں بن سکی۔ شعرا میں سے اکثر انگریزی، ہندی، فرانسیسی، روسی یا کسی اور علاقائی یا بیرونی زبان کے وسیلے سے عالمی ادب

اور انسانی معاشرے کی آفاقی سطح سے متعلق رہے لیکن عام قاری اور سامع مشاعرے، فلم، ریڈیو ـــــ اور مقبولِ عوام رسائل ہی کے ذریعے اپنے شعری ذوق کی آبیاری کرتا رہا۔ پاکستان میں تقریباً ابتدا ہی سے فوجی آمریت کے قیام اور استحکام اور غیر یقینی سیاسی اور معاشی حالات کے باعث "عصری آگہی" کے بے باک اور بے حجاب اظہار کا موقع نہ رہا اور ابھی ابھی جب کہ فوجی آمریت ختم ہوئی اور آزادی اظہار کا اعلان کیا گیا تو ادیبوں نے شعر و افسانہ کے بجائے صحافت اور کالم نویسی کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا پسند کیا۔ یہ ٹھیک بھی ہے کہ اس میں ادیبوں اور ادب دونوں کا بھلا ہے۔ کاش ہم ہندوستانی شاعر بھی اس نزاکت کی پاسداری کر سکیں کہ کسی تجربے کے شعری تجربہ بننے میں کافی وقت لگتا ہے اور ہنگامی یا وقتی جذبے کو نظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔

اس کے علاوہ چند اور حقائق ہیں جن کا ذکر یہاں غلط نہ ہوگا۔ اُردو زبان کئی صدیوں سے شہری خواص کی زبان بنی رہی ہے اور اپنے اشرافیائی مزاج پر نازاں بھی رہی ہے۔ جاگیر دارانہ اور زمیندارانہ روایات نے زبان کو آداب، تکلفات اور تحفظاتِ مراتب سے بوجھل بنا رکھا ہے۔ اگر آزادی کے بعد اسے وہ حیثیت اور اہمیت حاصل ہو گئی ہوتی جو ہندوستان کی علاقائی زبانوں کو حاصل ہے تو ممکن ہے اس کے مزاج میں زندگی اور تازگی بخش تبدیلی رونما ہوتی۔ عصری آگہی کی آئینہ داری وہی زبان بہتر طریقے سے کر سکتی ہے جس میں صفائی، روانی اور صحتمندی ہو۔ اس دور کے انسان کا غم و غصہ، اس کا احتجاج اور انحراف اور اس کی تشنگی، انقلاب کا انعکاس شاعری میں کرنے کے لیے زبان کا صاف، ستھرا، زندگی سے متعلق اور نت نئے علوم و فنون سے عملاً متعلق رہنا بہت ضروری ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں آج بھی کروڑوں لوگوں کے ذہن میں شاعری عبارت ہے ردیف، قافیے اور وزن کی پابندی سے اور معنویت تک رسائی کے لیے تشبیہہ، اشارہ، رمز و کنایہ اور زیادہ سے زیادہ استعارہ کے اسالیب کافی ہیں۔ ہمعصر منظر نامہ "غزل" کے نازک مزاج پر ان کے نزدیک گراں ہے۔

اس کے برخلاف اُردو کی جڑواں بہن ہندی کو لیجیے، سرکاری، کاروباری، تعلیمی اور تہذیبی لین دین کی زبان ہے۔ مرکز اور ریاستوں کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔ بہار، یوپی، ایم پی، راجستھان، ہریانہ، ہماچل میں تو اس کے سامنے کوئی دوسری زبان چیلنج کرنے کے لیے نہیں ہے۔ حالاتِ حاضرہ اور جدید علوم و فنون سے متعارف رکھنے کے لیے اخبارات رسائل اور کتابیں ہیں۔ ہندی کی نئی شاعری نے بول چال کی زبان کو اپنایا ہے۔ بوسیدہ اور فرسودہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ روایات کو ترک کر دیا ہے۔ سیاست اور سماج پر بھرپور تبصرہ اور طنز کرنے سے نیا شاعر قطعی نہیں جھجکتا۔ اس نے اپنی شاعری کے لیے بول چال کی نئے ڈھونڈھ نکالی ہے۔

اُردو میں "عصری آگہی" کی تلاش سے کہیں یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ بس وہی شاعری قابلِ اعتنا ہے جس میں "عصری آگہی" کا اظہار کیا گیا ہو۔ اُردو تنقید کی ایک بدنصیبی یہ بھی رہی ہے کہ ایک قدر، یا ایک معیار یا ایک طریق تحسین کی تعمیم اس حد تک کر دی جاتی ہے کہ اسے اساسِ تنقید مان لیا جاتا ہے۔ شاعری کی تنقید کے کئی پہلو ہیں۔

(۱) تاریخی اور عمرانی تجزیہ ـــــ یہ عمرانیات کا شعبہ ہے

(۲) نفسیاتی تجزیہ ـــــ یہ نفسیات کا کام ہے

(۳) جمالیاتی تحسین ـــــ یہ نقادِ ادب کا میدان ہے

(۴) ادبی تخمین ـــــ یہ مورخِ ادب کا فریضہ ہے

جمالیاتی تحسین ایک ترکیبی عمل ہے۔ جو موضوع، ہیئت، اسلوب، لَے وغیرہ کے تجزیہ سے شاعری کے مجموعی تاثر اور آہنگ کی ازسرِ نو ترکیب کرتا ہے۔ نقیدِ ادب کا کام یہ ہے کہ کسی تخلیق کے اجزائے ترکیبی میں ایک ایسا corelation پیدا کر دے جس کے ذریعے قاری یا سامع اس تخلیق کی جمالیات سے زیادہ سے زیادہ محظوظ و متاثر ہو سکے۔ ہر دور میں جمالیات کے اصولوں کی تجدید ہوئی ہے۔ ذوقِ جمال کا تعلق اس دور کے معاشی نظام اور ذرائع پیداوار سے ہوتا ہے۔ افادیت سے تسکینِ ذوق کی منزل تک پہنچنے میں کئی مرحلے پیش آتے ہیں۔ پیشہ، ہنر بنتا چلا جاتا ہے پھر ہنر فن بنتا چلا جاتا ہے اور فن کا تعلق فوری اور ہنگامی افادیت سے براہ راست نہیں ہوتا۔ ان تمام منزلوں کا سفر عصری آگہی سے بعید

طے نہیں ہوتا۔ قصیدے کی تشبیب کا اپنے کل سے ٹوٹ کر الگ ہونا اور پھر غزل کے روپ میں قصیدے سے زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل کرنا محض حادثہ نہیں ہے۔

"عصری آگہی" کا مسئلہ ہمیں تصورِ زمان و مکان کے قریب بھی لے آتا ہے۔ کیا ہم زمان و مکاں کو سرحدِ ادراک سے پرے کی اشیاء سمجھتے ہیں جو محض ہمارے شعور میں موجود ہیں؟ یا ہم عہدِ وسطیٰ کے مادہ پرستوں کی طرح مکان کو سہ جہتی اور زمان کو یک جہتی تصور کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ مکان موجودات کے باہمی رشتوں کا تعین کرتا ہے اور زمان مظاہر کے تسلسل و تواتر کا بہ اعتبارِ وجود بالترتیب اظہار کرتا ہے؟ یا اقبال کی ہمنوائی میں

یہ زمان ہے نہ مکان لاالٰہ الا اللہ

اور بہار ہو کہ خزاں لاالٰہ الا اللہ

یا مفکرینِ تصوّف کی پیروی میں ہم زمان و مکان کو فنا یا تخریب مانتے ہیں؟ یا مارکسی لینِنی نقطۂ نگاہ سے زمان و مکاں کو مادے کے تحرک سے وابستہ سمجھتے ہیں اور انسانی ادراک کے ماورا نہیں مانتے؟

اس لیے شاعری جیسی پیچیدہ صنف میں "عصری آگہی" کی شناخت، نشاندہی اور پھر شاعر کے شعور اور معروضی حقیقت کے جدلیاتی رشتے کے پس منظر میں اس کی جانچ پرکھ کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا حلوائی کی دکان پر دادا جی کا فاتحہ پڑھ آنا۔ آیئے اقبال کا لینن خدا کے حضور میں عصری آگہی کو کس طرح پیش کرتا ہے، یہ دیکھیں۔

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اس طویل اقتباس سے مقصد یہ اجاگر کرنا ہے کہ عصری آگہی کا انفرادی اظہار ذاتی عقائد کی رنگ آمیزی کے ساتھ ایسی زبان میں اور ایسے موزوں آہنگ میں بھی نہ صرف ممکن ہے بلکہ بہت اثر انگیزی کے ساتھ ممکن ہے جس میں دور از کار استعاروں اور علائم کے بجائے جانے پہچانے انداز اور براہِ راست بیانیہ انداز کو اختیار کیا گیا ہو۔ مذکورہ بالا اشعار کا لفظی، معنوی اور صوتی آہنگ اقبال کے پسندیدہ اور عام آہنگ سے کسی طرح کا انحراف نہیں کرتا اور خطیبانہ اور نعرہ بازی کی سطح پر بھی نہیں اترتا مگر پوری شدت کے ساتھ نہ صرف ترسیلِ مفہوم کرتا ہے بلکہ تاثر کی گہری فضا بھی قائم کرتا ہے۔

ادب اور اس کی تنقید میں تعمیم بے معنی ہے۔ ایک شاعر اور دوسرے شاعر ہی میں نہیں بلکہ ایک ہی شاعر کی مختلف تخلیقات میں کسی قسم کی تعمیم سے کام لینا سہل پسندی ہے۔ یہ کہہ دینا کہ کون سا

استعارہ یا امیج یا علامت شعور نے وضع کی ہے اور کون سی ایسی ہے جسے لاشعور نے جنم دیا ہے کسی میکانکی تقسیم سے کم نہیں ہے۔

اُردو میں عصری آگہی، انقلاب، طبقاتی شعور اور اشتراکی حقیقت پسندی کے نام پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک بہت سی نظمیں سامنے آئیں اور کئی غزلوں میں بھی ان کے منعکس ہونے کے دعوے کیے گئے۔ جذباتیت سے معمور نظموں کو "حقیقت پسندانہ" کہا گیا اور نعرہ بندی اور خطابیہ لب و لہجے کو "انقلاب آفرینی" کا نام دیا گیا۔ اشتراکیت کے گہرے شعور و احساس کا دور دور پتہ نہیں ہے۔ اشتراکیت، سرخ سویرے، سرخ ستارے وغیرہ سے ایک جذباتی وابستگی کا دعویٰ ضرور دہرایا گیا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ یار اس وقت تو مجھے سینما دیکھنے جانا ہے اور صرف تین پیسے جیب میں ہیں ورنہ روپے تو کیا ہیں جان حاضر ہے۔ کوئی ناظم حکمت، کوئی پابلو نرودا، کوئی آراگوں اردو میں نہیں ملتا غیر مارکسی شعرا کے یہاں "فرد" کے کرب اور المیے نے شعری پیکر اختیار کرنا شروع کیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد انسان کی آفاقی طور پر تکلیف دہ صورتِ حال اور ایک بے درد، بے جگر، بے مروت، میکانکی اور مشینی معاشرے میں پستے، جھلستے، جلتے اور بالاقساط مرتے ہوئے فرد کی داستانِ غم کو مختلف پیرایوں میں شاعری کا روپ دیا جانے لگا۔ عقائد کے ٹوٹنے اور توقعات کے جھوٹا ثابت ہونے اور وعدوں کے وفا اور خوابوں کی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے سے جو بے پناہ غم و غصہ پیدا ہوا اس نے اپنے اظہار کے لئے عجیب و غریب لفظیات اور منظرنامے منتخب کیے۔

ہونڈی سیاست پسندی اور بھونڈی نفسیات پرستی کے شکنجے سے بچ کر چند شعرا نے بعض وقیع اور اہم نظمیں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک بھی کہی ہیں لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد جس شاعری نے ادبی حیثیت سے بہت زیادہ شور مچایا ہے وہ ان شاعروں کی مرہونِ منت ہے جو ترقی پسندوں سے علاحدہ رہے ہیں۔ بہرحال ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک جو شاعری روایت سے گریزاں رہی ہے اس نے مخالفت اور لعن طعن برداشت کرنے کے باوصف ایک ایسے مذاقِ شعر کی تربیت کی جو نئی آزاد شاعری کا سواگت کر سکتا تھا۔

یہاں لمبے لمبے اقتباسات سے اور مثالوں سے کسی نکتے کی وضاحت مقصود نہیں ہے ورنہ "آگہی" اتنی سطحی اور سرسری صراحت کی گرفت میں آسکتی ہے کہ چند ہنگامی موضوعات پر قصیدہ، نوحہ، مرثیہ نما نظموں اور عنوانوں کی مثالوں سے اسکی نشاندہی کی جاسکے۔ معماروں، کارخانوں، باندھوں کے افتتاح پر صحافتی قسم کی چالو شاعری نہ آگہی کا پتہ دیتی ہے نہ باخبری کا۔

ترقی پسند شعرا میں نیاز حیدر کی بیشتر نظمیں عصری آگہی کا اظہار کرتی ہیں اور ایک ایسی لفظیات اور آہنگ کا انتخاب اپنے لیے کرتی ہیں جنھیں جمالیات اور فن کے معیاروں پر کسا جا سکتا ہے۔ جمیلہ، جمالِ مصر اور آزادیٔ ہند اور ہندوستان کے مختلف شہروں پر کہی گئی ان کی نظمیں جدید اُردو شاعری کا مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ نیاز حیدر جس خلوص اور سچی لگن کے ساتھ شعر کہتے ہیں وہ بہرحال اپنا تاثر قائم کر لیتی ہے۔

سردار جعفری کی نظمیں نئی دنیا کو سلام، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، سیلابِ چین، صبحِ فردا، اودھ کی خاکِ حسین، دشمن کون ہے اچھی نظمیں ہیں اور وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ سردار جعفری کی نثری تحریروں میں بھی عصری آگہی کی گہرائی اور گیرائی کے ثبوت ملتے ہیں لیکن انھوں نے ابتدا میں اپنے مخصوص پیرایۂ اظہار کی تلاش کے بجائے بات کو تقریر اور تقریر کو موزوں بنا دینے کی روش کو زیادہ اپنایا تھا جس کی وجہ سے ہیئت و مواد میں ہم آہنگی اور خوش آہنگی بیشتر نظموں میں پیدا نہیں ہو سکی لیکن جن نظموں میں ایسا ہو سکا ہے وہ عصری آگہی کو عصری حدود سے ماورا لے گئی ہیں اور ابھرے پن سے بچ گئی ہیں۔

ساحر کی نظم "پرچھائیاں" انسان کی خواہش امن پر بہت بہت خوبصورت نظم ہے۔ لومبا کے قتل سے متاثر ہو کر ساحر نے جو نظم کہی تھی وہ بھی مسلمہ اہمیت کی حامل ہے۔ جاں نثار اختر نے فسادات اور ہجرت پر ایک بہت اچھی نظم کہی تھی۔ کیفی اعظمی نے عوام کے جذبات کی عکاسی ان کے طبقاتی شعور کے پس منظر میں

بعض نظموں میں بخوبی کی ہے۔ بیتل کے کنگن، تنخواہ اور غالب صدی پر ان کی طنزیہ نظم قابلِ ذکر ہے۔

اس دور کے بہت ہی اہم ترقی پسند شاعر اختر الایمان ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں عصری آگہی ان کی مخصوص تکنیک اور اندازِ بیان میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہیئت و مواد جسم و جاں بن گئے ہیں۔ ان کی بیشتر شاعری عصری آگہی یا اس سے پیدا شدہ طنز کی تخلیق ہے۔ ان کی زبان بول چال کے بہت قریب کی زبان ہے اور ایک محاکاتی قوت سے شعر خلق کرتی ہے۔ تاریک سیارہ، یادیں، جواری، نیا شہر اور بنتِ لمحات کی بیشتر نظمیں نہایت وقیع اور اہم ہیں۔

نئی شاعری میں عصری آگہی کا اظہار خطابیہ اور محاکاتی اندازِ بیان کے بجائے زیادہ بلیغ طریقوں سے ہوا ہے۔ اندازِ بیان کا نجی اور انفرادی ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ مواد بھی نجی یا انفرادی ہے۔ اشاریت، رمزیت، اساطیری یا داستانوی یا تلمیحاتی امیجری اور بالخصوص استعاروں اور علائم کے استعمال نے اکثر نفسِ موضوع اور معروض کو دبیز پردوں میں چھپا لیا ہے لیکن اس کے وجود کی تفصیلات تک کو محسوس کرنا ناممکن نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غیر ترقی پسند (اصطلاحی معنوں میں) یعنی ایسے شاعر جن پر ترقی پسندی کا باضابطہ لیبل نہیں ہے زیادہ تر نچلے متوسط طبقے اور شہری بے روزگار یا ملازمت پیشہ نوجوانوں کے مسائل سے زیادہ الجھے رہے لیکن جو شعرا باضابطہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اراکین تھے ان میں سے بھی اکثر نے عصری آگہی کے بہت سطحی تجربے کو موضوعِ سخن بنایا۔ جنگل اور دیہات اور مضافات کی زندگی اور مسائل کو انھوں نے بہت کم چھوا۔ بہت سی نظمیں تو Soap Box تقریروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

عصری آگہی خلیل الرحمن اعظمی، قاضی سلیم، بلراج کومل، سلام مچھلی شہری، وحید اختر، باقر مہدی، محمد علوی، ندا فاضلی بلکہ عادل منصوری تک کی بعض نظموں میں موجود ہیں۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

شہریار اور کمار پاشی کے یہاں اسی آگہی کا بڑا Diffused ردیف ملتا ہے لیکن ملتا ضرور ہے۔ زبیر رضوی اور شاذ تمکنت جن کا مزاجِ شعر غنائیت سے زیادہ قربت رکھتا ہے، اپنی کئی نظموں اور غزلوں میں آج کے مسائل اور زندگی کی حقیقتوں کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں

پاکستان کے شعرا میں عصری آگہی کا بہت عظیم شاعرانہ اظہار ن۔م۔ راشد کے یہاں ہوتا ہے۔ راشد کے یہاں آج کے انسان کا Predicament نظم کے پورے لفظی، صوتی اور معنوی آہنگ کے ذریعے شعر کا قالب اختیار کرتا ہے۔ سلیمان سربزانو، اسے عشق ازل گیر و ابد تاب، اسرافیل کی موت، ایران میں اجنبی، حسن کوزہ گر، مورجاں وغیرہ ہمارے عہد کی بڑی زبردست دانشورانہ نظمیں ہیں۔ مجید امجد، اعجاز احمد، عباس اطہر نے اپنے عہد کی آگہی کے زہر کو اپنے خونِ جگر میں حل کر کے جس طرح پیش کیا ہے وہ بڑی تپسیا کا نتیجہ ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے حال ہی میں "نئی نظم کا سفر" شائع کیا ہے جس میں ۱۹۳۶ کے بعد کی منتخبہ نظموں کی خاصی تعداد شامل ہے اور ان نظموں میں سے بیشتر عصری آگہی کا اظہار نئے نئے ڈھنگوں سے کرتی ہیں ہر چند کہ انتخاب کا اصول مرتب نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم نے دانستہ طور پر افادی اور دستاویزی طریقۂ کار سے انحراف کر کے ایسے اصول کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس کی رو سے ہم ان تخلیقات کو ترجیح دیں جن سے اردو نظم کے فنی اور جمالیاتی ارتقا میں کسی نہ کسی نوع کی مدد ملی ہے۔

پاکستان کے شعرا میں فیض کے یہاں عصری آگہی جن نرم نازک لطیف مگر قوی پیکروں میں ظاہر ہوئی اس نے نوجوانوں کے دلوں کو چھوا اور گرمایا ہے۔

بہرحال اردو شاعری میں عصری آگہی کا اظہار خلوص اور ایمانداری کے ساتھ ہوا ہے۔ پاکستان میں وہاں کے حالات کے مطابق اور ہندوستان میں یہاں کے حالات کے مطابق۔ عصری آگہی کے اظہار کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ آپکا منظر نامہ بھی معاصر زندگی اور حالات سے اخذ کیا گیا ہو۔ یہ عصری آگہی کے شعری اظہار کا بہت ہی تنگ نظر تصور ہوگا۔

سویت روس کی ریاست لتھوانیا کے شاعر Eduardas Mieželaitis کا ایک قول ہے:

"شاعری ہماری حقیقی دنیا ہی کی طرح اپنے ارتقائی سفر کو روک نہیں سکتی۔ انسان کی سرگرمی آفاقی ہے اور شاعری بھی آفاقی بنتی جارہی ہے۔ شاعری ایک ایسی سائنس بنتی جارہی ہے جو مطالعۂ انسان کے لیے وقف ہے اور شاعر مستقبل کی دنیا کے نقشہ نویس کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کسی سائنس کو ہٹاکر اس کی جگہ کبھی نہ لے سکے گی، نہ طبیعات کو، نہ فلسفے کو، نہ ریاضی کو — ہمیں متفقی سائنس کی ضرورت کبھی نہ تھی۔ لیکن وقت آگیا ہے جب سائنس کا نظریہ اور سائنس کے تجربات وائلن کے تار سے نکلے ہوئے لطیف نغمے کی طرح شاعرانہ ہو چکے ہیں۔

قلعۂ ریاضی کے لئے Norbert Weiner کا یہ کہنا کہ "نئی ریاضی ایک طرح کا فن ہے" غیر منطقی بیان نہیں ہے۔ سائنس کے دست بدست جدید شاعری اصلِ حیات کی تہہ تک اُتر رہی ہے۔ وہ عمیق ترین گہرائیوں میں غوطہ زن ہے تاکہ اسباب اولیں اور ماہیتِ اشیاء کی جستجو کرسکے اور انسان بڑھ رہا ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے بالخصوص اس وقت جب اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی کی جارہی ہو۔ اسی لئے میرا عقیدہ یہ ہے کہ شاعر کو دنیا کی تخلیقِ مسلسل کے عمل سے علیحدہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کا سرگرم عمل نقشہ نگار بننا چاہیئے۔"

ایک اقتباس اور — یہ بھی روس کی ہے Dzidra Kalnina لکھتی ہیں: "وہ شاعر جس کی نگاہیں بہت دور جمی ہوئی ہیں اکثر اپنے لوگوں کی تاریخ یا صرف ایک مخصوص زمانے سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ مختلف الادوار حقائق اور متعدد مکانی سطحیں اپنے مطابق پیچیدہ اور کثیر الاصوات طریقِ اظہار کی متقاضی ہیں۔ یہ اور بھی حیران کن بات ہے جب اس طرح کی آمیزش کہربا کی مانند صاف شفاف زبان میں ظاہر ہو۔"

میری بڑی خواہش ہے کہ میں اور میرے ساتھی اور میرے نوعمر ہم سفر آج کی زندگی اور معاشرت کی پیچیدگیوں کے احساس اور شعری تجربے کو بغیر بہت بڑے تام جھام کے اور ایک نئے محاکاتی اور مکالماتی قوت سے بھرپور سیدھی سادی طرز اور یکسر سے بھرپور بہت Direct اور آرپار نظر آنے والی زبان میں پیش کرسکیں اور شعر کے ایک نئے تصور کو جنم دے سکیں۔ ■■

اجمل اجملی

۶۹۔ چوپال۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

میں کیا لکھتا ہوں

میں اس وقت نہ پچھلے ۲۵ سالہ ادب کا جائزہ لینے کھڑا ہوا ہوں، نہ عصری آگہی کی نوعیت اس کے تقاضوں، اور ادیب کے فن کے ساتھ اس کے رشتوں کے بارے میں کچھ عرض کرنے کے لئے۔ میں اپنے بزرگوں اور دوستوں سے معذرت کرتے ہوئے، صرف اپنی بات کرنا چاہتا ہوں، اپنی بات، اس "میں" کی بات جو خود کو ایک ترقی پسند شاعر کہتا، اور سمجھتا ہے اور جسے اس کے قارئین و سامعین جن کی تعداد کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو، ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اس ترقی پسند شاعر کی بات کرنا چاہتا ہوں جس کی شاعری نے اس وقت آنکھ کھولی جب وطن میں آزادی کی پو پھٹ رہی تھی، اور جسے پچھلے دس پندرہ برسوں کے دوران مطعون قرار دینا، جان بوجھ کر نظر انداز کرنا، گالی دینا اور طرح طرح کے اہانت آمیز خطابات سے نوازنا ایک خاص گروہ کا وطیرہ بن چکا ہے۔ تو صاحبو! میں اس ترقی پسند شاعر کی بات کرنا چاہتا ہوں

میں اس بات کا آغاز ایک سوال سے کروں گا، یہ سوال میں اکثر تنہائی کے لمحات میں اپنے آپ سے کیا کرتا ہوں لیکن اتنا اور بتا دوں کہ میری اس تنہائی کا کوئی تعلق ایک خاص قسم کے اس احساس سے نہیں ہے، جس کا اظہار ان دنوں ہر رسالے کے ہر شمارے میں شائع ہونے والی کسی نہ کسی نظم ——— میں لازمی طور پر نظر آجاتا ہے اور جسے کچھ لوگ ایک ٹھوس عصری حقیقت منوانے پر تلے ہوئے ہیں، ہاں! تو وہ سوال یہ ہے کہ میں کیا لکھتا ہوں؟ — اور جب یہ سوال اپنے "ذہن" میں سے کرتا ہوں جو شاعر ہے تو مجھے جواب ملتا ہے کہ "یہ میرے احساسات ہیں، جذبات ہیں، تاثرات ہیں، خیالات ہیں، میری فکر، میری سمجھ، میرا مشاہدہ، میرا تجربہ اور میری سوچ ہے جو الفاظ اور آہنگ کے اتار چڑھاؤ کا سہارا لے کر، فن کے دار و بست میں بند ہو کر میری شاعری کی شکل لیتی ہے"؟ اور یہ ساری چیزیں قطعی طور پر میری اپنی ہیں، پست ہوں یا بلند، اچھی ہوں یا خراب، اعلیٰ ہوں یا گھٹیا لیکن ہیں میرے اپنے ذہن، میرے اپنے احساس اور میری اپنی مرضی کی پیداوار۔ یہاں میں ایک بات اور صاف کر دوں۔ کل دن بھر کی بحث کے دوران بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ ہم ترقی پسندی کے قائل ہیں، لیکن اس ترقی پسندی کے نہیں جس میں آرڈر پر نظمیں لکھوائی جاتی ہیں۔ دوستو! میں کمیونسٹ ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں پچھلے بیس سال سے اسی سیاسی جماعت سے تنظیمی طور پر وابستہ رہا ہوں اور ایک ادیب اور ایک کمیونسٹ کی ایمانداری کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے پارٹی سے وابستگی کی بیس سالہ زندگی کے دوران ہزار ہا احکامات وصول ہوئے ہیں، لیکن کبھی یہ حکم نہیں ملا کہ تمہیں یہ کہنا ہے، اور یہ نہیں کہنا ہے، یا تم فلاں موضوع پر ایک نظم لکھ دو! حالانکہ اگر مجھ سے اس طرح کی فرمائش کی جاتی تو اس میں کوئی برائی نہ تھی، آخر ہم رسالوں کے خاص نمبروں کے لئے ایڈیٹر کی فرمائش پر کسی خاص مسئلے کو موضوع بناتے ہیں، یا نہیں؟ ریڈیو سے موصول ہونے والی فرمائشوں کی تکمیل کے لئے، تھوڑے سے پیسوں کی فکر میں یا ریڈیو کے ذریعے اپنی آواز دور دور تک پہنچانے

کی خواہش میں، یا کسی اور مصلحت کی وجہ سے خاص قسم کے فیچرز، مقالے اور نظمیں لکھتے ہیں یا نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ادب فرمائش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ فرمائش میرے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے انسان کی بھی ہو سکتی ہے۔ احساس و ادراک کے نہاں خانوں میں پلتے ہوئے طوفانوں کی بھی، میرے ضمیر کی بھی، ذمہ داری کے احساس کی بھی ہو سکتی ہے اور اڈیٹر، ریڈیو، ٹیلی ویزن اور پارٹی کارکنوں کی بھی۔ معیار یہ نہیں ہے کہ آپ نے کس کی فرمائش پر لکھا ہے، معیار یہ ہونا چاہیئے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں آپ کے دل کی دھڑکنیں ہیں یا نہیں، آپ کے خون کی گرمی، اور اس کا رنگ ہے یا نہیں Devotion ہے یا نہیں!

بات کچھ دور جا پڑی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہر شاعر اور ادیب کی طرح میری شاعری بھی، میری انفرادی کوشش اور اظہار ذات کا وسیلہ ہے لیکن یہ ذات کا معاملہ بھی بڑا پیچیدہ ہے۔ اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ ذرا اس ذات کی وضاحت کر دیجیے، تو میرے لئے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں صرف وہی نہیں جو آپ کو نظر آ رہا ہوں، یا آپ صرف وہی نہیں جو مجھے دکھائی دے رہے ہیں، ہم سب اپنے ماضی میں بھی رہتے ہیں، حال میں بھی اور مستقبل میں بھی، ہم سب کی کئی کئی تہیں اور کئی کئی پرتیں ہیں، ہم اپنے گھر میں بھی رہتے ہیں، محلے میں بھی، شہر میں بھی، صوبے میں بھی، ملک میں بھی اور دنیا میں بھی، ہم سب ارتقا کی اس زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہنے والا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں سمٹ کر ہماری اور آپ کی ذات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، تبھی تو میرؔ نے کہا تھا کہ

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

چنانچہ جب ہم اپنی شاعری میں اظہار ذات کرتے ہیں تو دراصل ہم اسی ٹوٹل کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ نہ ہم اپنے ماضی سے تمام رشتے توڑ سکتے ہیں، نہ حال سے الگ ہو سکتے ہیں، نہ مستقبل کو نظر انداز کر سکتے ہیں، ہماری وفاداری اپنی ذات سے بھی ہے، اور اس گھر سے بھی جو سمٹتا ہے تو صرف گھر ہے اور پھیلتا ہے تو زینہ بہ زینہ پوری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور اس لئے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میری شاعری میں اپنے دور کی جھلک ہے یا نہیں، عصر حاضر کے مسائل اور حقیقتوں کی چھوٹ اس پر پڑتی ہے یا نہیں، کیونکہ اس سے مفر نہیں، یہ چیزیں تو میری شخصیت اور میری ذات کا جزو بن چکی ہیں، میرے اپنے ذاتی ارتقا اور ذہنی نشو و نما میں نانی اماں کی اس کہانی کی طرح حل ہو چکی ہیں جو میرے بچپن نے سنی تھیں، مسئلہ یہ ہے کہ میری شاعری میں، ماضی کی تاریخ اور عصر حاضر کے جن حقائق کی جھلک ملتی ہے، وہ کیا ہیں، کیسے ہیں اور کیوں ہیں؟ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی تین چھوٹے، چھوٹے سوال موجودہ دور میں اس بات کی کسوٹی ہیں کہ کسی شاعر کا رویہ عصر حاضر کے حقائق کی جانب ترقی پسند رویہ ہے، صحت مند رویہ ہے یا موقع پرستی اور مصلحت شناسی کا رویہ ہے، اور ہم جب شاعر کی تخلیقات پر غور کر رہے ہیں اسے عصری آگہی حاصل بھی ہے یا نہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر دور حقائق کا ایک بے پایاں سمندر ہوتا ہے۔ جس کی ہر موج ہر لہر اور ہر قطرہ کسی نہ کسی حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ حقیقتیں مثبت بھی ہوتی ہیں اور منفی بھی۔ اہم بھی ہوتی ہیں اور غیر اہم بھی، معمولی بھی ہوتی ہیں اور دیوپیکر بھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے مجھے بہرحال یہ انتخاب کرنا ہوتا ہے کہ کون سی حقیقت مثبت ہے، کون سی منفی، کون سی اہم ہے، کون سی غیر اہم، کون سی معمولی ہے اور کون سی دیوپیکر، کیونکہ شاعری کا منصب یہ نہیں کہ وہ حقیقتوں کی کوئی فہرست تیار کرے، شاعر کے سامنے یہ سوال تو ہوتا ہی ہے کہ وہ کیا کہے لیکن اس سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ کیا نہ کہے؟

کیا کہے اور کیا نہ کہے؟ بظاہر یہ بے حد آسان سوال ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں، اس کے لئے سماجی بصیرت کی ضرورت ہے، وقت کے تقاضوں کے پورے شعور کی ضرورت ہے، سماج کے ایک رکن، ملک کے ایک شہری اور دنیا کے ایک انسان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کے پورے احساس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی

مسئلے اتنے صاف ہوتے ہیں کہ کہنے اور نہ کہنے کا فیصلہ بذاتِ خود کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آج دنیا میں مشکل ہی سے کوئی ایسا ادیب ملے گا جو کھل کر جنگی ارادوں کا پرچار کرتا ہو، جو ایٹمی جنگ کا خواہشمند ہو، جو فاشزم، فرقہ پرستی، نسلی امتیاز اور حیوانی استحصال کی حمایت میں آواز بلند کر سکے، ویت نام کے جیالوں نے اپنی پرخلوص قربانیوں سے جو مشعل روشن کی اسے خراجِ تحسین ادا کرنے والوں میں دنیا کے ہزار ہا ایسے ادیب بھی شامل ہیں جنھیں اس جماعت سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے جس کی رہنمائی میں انسانی تاریخ کی یہ عظیم ترین اور بے مثال جنگ لڑی گئی۔ لیکن ہر مسئلہ اتنا صاف نہیں ہوتا، توتوں، مسئلوں، حقیقتوں اور معاملات کو مثبت اور منفی میں تقسیم کرنے والے خطوط اتنے واضح نہیں ہوتے، ہماری دنیا بے حد پیچیدہ ہو چکی ہے، مسئلے اس طرح خلط ملط ہیں کہ تمیز کرنا مشکل ہے، دور سے سونا نظر آنے والی ہر چیز ضروری نہیں کہ سونا ہی ہو، اور یہیں سے آئیڈیالوجی یا نظریئے کا رول شروع ہوتا ہے۔ وہ نظریہ نہیں جو فیشن کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہو، یا جیسا کہ کل گوپی چند نارنگ صاحب نے فرمایا تھا، اوپر سے لاد دیا گیا ہو۔ دراصل نظریہ نہ فیشن کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے نہ اوپر سے لادا جا سکتا ہے، کیونکہ دونوں ہی حالات میں پول بہت جلد کھل جاتا ہے، میں اس نظریے کی بات کر رہا ہوں جسے انسان سوچ سمجھ کر، آنکھیں کھولکر پڑھتا، محسوس کرتا اور اس کے بعد اس طرح اپناتا ہے کہ اسکی شخصیت، اسکے ضمیر، اس کے ایقان اور اس کے ایمان کا ایک حصّہ بنجاتا ہے۔ اور اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ امن پر نظم لکھ لینا، یا ویت نام کے مجاہدوں کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرنا ہی ترقی پسندی نہیں ہے۔ ترقی پسندی یہ ہے کہ آپ کا ہر رویہ، ہر تاثّر، ہر ردِّ عمل مثبت ہو۔ ترقی پسندانہ عصری آگہی یہ ہے کہ آپ آج کی مثبت حقائق کا انتخاب کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ حقائق کی اس طوفان میں مثبت پر منفی کو، اہم پر غیر اہم کو، اور عظیم پر معمولی کو فوقیت یا برتری حاصل نہ ہو سکے۔

اور اب آخر میں یہ سوال میرے سامنے آتا ہے کہ کسی حقیقت کا اظہار کس طرح کیا جائے۔ دوستو! خیال کوئی مجرد چیز نہیں ہے، خیال کچھ خاص الفاظ کے ساتھ ہمارے ذہن میں آتا ہے، ان الفاظ میں تبدیلی تو ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے

البتہ ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ سوچیں اس کا کوئی پیکر نہ ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ خیال جن الفاظ کے ساتھ ہمارے ذہن میں اُبھرتا وہی الفاظ اس کا سب سے مناسب اور فطری پیکر ہیں۔ اور چونکہ الفاظ، علامات، تمثیل ہماری دنیا سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اس لئے ان میں خود بخود تبدیلی آتی رہتی ہے، دنیا میں آنے والی تبدیلی کے ساتھ ساتھ۔ علامتوں کے معنی بدلتے ہیں، تمثیلوں سے وابستہ تصورات میں تغیر ہوتا ہے، نت نئی ترکیبیں اور تلمیحیں، استعارے اور تشبیہیں جنم لیتی ہیں، شاعر کرتا ہے تو صرف یہ کہ خیال کے بنیادی پیکر میں تھوڑی سی تراش خراش کے بعد اسے آخری شکل دے دیتا ہے، اور اس طرح وہ مثبت عصری روح جو خیال کی صورت میں اُبھری تھی شعر کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت ہمارے بعض شاعر لفظوں کے کچھ نئے طلا تسمے تیار کر کے پیش کر دیتے ہیں جن میں بعض ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو آج سکۂ رائج الوقت بن چکے ہیں، اور اسے عصری آگہی کی علامت تصور کرتے ہیں۔ میں صحت مند تجربات کو جو ذہن و خیال کے قدرتی ارتقاء کا نتیجہ ہوتے ہیں زبان و بیان کی ترقی کا وسیلہ اور اسکی بنیاد سمجھتا ہوں لیکن تجربہ برائے تجربہ یا ذہنی معمہ سازی کا قائل نہیں۔ میں اسکی ایک مثال دیتے ہوئے اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں ؎

میرے ایک بڑے بانکے دوست ہیں، نام شہاب جعفری ہے، ان کا ایک شعر ہے ؎

اب کے کچھ ہو کر رہے گا فصلِ گل آنے تو دو
یا ہمارا سر ہی جائے یا قفس کا در کھلے

یہ شعر مجھے بہت پسند ہے میں اسے تنہائی میں اکثر گنگناتا ہوں۔ مجھے اس میں زبان و بیان کی قدامت کے باوجود عصر حاضر کی آگہی ملتی ہے، وہ جوش و خروش ملتا ہے جو موجودہ دور میں دنیا بھر میں

افسانوں کی اکثریت کے دلوں میں مچل رہا ہے۔ اس لئے میں اسے عصر حاضر کا شعر کہتا ہوں، لیکن جب ایک شاعر سے میں یہ شعر سنتا ہوں کہ ؎

بجلی کے دہکتے ہوئے تاروں کو چھولیں
کبھو کسی گاڑی کے نیچے کٹ جائیں
چھوٹے سے ڈبے میں اتنے مسافر
مل جل کے سب بیٹھیں اور سٹ جائیں

تو باوجود اس کے کہ بجلی کے تار، گاڑی اور ڈبہ جیسے خالص عصری الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے، مجھے اس شعر میں عصری آگہی نظر نہیں آتی اور نہ یہ شعر آج کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ میری توقع ہے کہ آج کے اس مباحثے میں مجھے اس کا جواب مل سکے گا۔

—

عنوان چشتی
جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ہیئت کے تجربے اور عصری آگہی

شعری ہیئت کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ اگر لفظ ہیئت کو کسی ٹھوس مادی چیز سے وابستہ کیا جائے تو اس کا مفہوم بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً مجسمہ کی ہیئت اور برتن کی ساخت کہا جائے تو اس کا مفہوم سمجھنے میں کسی کو دشواری نہیں ہوتی۔ مگر جب اس لفظ کو ادب و شعر کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے اور فن کی ہیئت' نظم کی ساخت جیسی اصطلاحیں وضع کی جائیں تو اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجسمہ کی ہیئت اسکی ظاہری شکل و شباہت کے سوائے کیا ہے جو دیکھنے والے کے سامنے ترشتے ہوئے پتھر کی شکل میں موجود ہے۔ نظم کی ہیئت بھی اُسکی ظاہری شکل و صورت کا نام ہے۔ مگر نظم در اصل تاثرات کا ایک تیز رو چشمہ ہے جیسے جیسے نظم پڑھتے جاتے ہیں۔ اس چشمہ کی ان گنت لہریں چشم تصور سے گزرتی جاتی ہیں۔ لیکن کوئی ٹھوس شکل اُبھر کر سامنے نہیں آتی۔ مجسمہ کی ہیئت ٹھوس حق نظم کی ہیئت سیال ——— دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔ صورت ہونے میں دونوں ایک ہیں۔ ایک مجسمہ کی صورت ہے دوسری نظم کی۔ مگر مجسمہ کی ہیئت کے لئے ذہنی تجرید کی ضرورت نہیں۔ جبکہ شعری ہیئت کے لئے ذہنی تجرید کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی تجرید کے بغیر شعری ہیئت کا تصور واضح نہیں ہو سکتا۔

ہیئت کے بہت سے تصورات ہیں۔ جن میں ماورائی۔ تجریدی۔ ارادی۔ خارجی اور میکانکی تصورات نمایاں ہیں۔ ان میں سے بیشتر تصورات اپنی افادیت اور دلکشی کھو چکے اور باقی کم کر چکے ہیں۔ شعری ہیئت کا جدید تصور عضوی ہیئت (Organic Form) کا ہے۔ اس تصور میں مواد اور ہیئت اسلوب اور تکنیک۔ زبان اور اُسکی تمام شکلیں۔ تاثر اور تاثر کے تمام سرچشمے۔ اظہار اور بیان کے تمام سلیقے حُسن اور لطافت پیدا کرنے کے تمام ذریعے۔ غرض تمام داخلی و خارجی اور فنی و جمالیاتی رشتے شامل ہیں ——— 'عصری ہیئت' مواد کی خود کاری اور خود تجسیمی کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں قوتِ نمو (Vitalistic) ہوتی ہے۔ اس کے داخلی اور خارجی عناصر میں بلا کی ہم آہنگی' توازن' تناسب اور تعلق ہوتا ہے۔ اس میں مواد ہیئت اور ذریعۂ اظہار کی تثلیث باقی نہیں رہتی۔ بلکہ تینوں عناصر ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر عضوی کل (organic whole) کی تشکیل کرتے ہیں۔ عصری ہیئت میں اس کے خارجی خد و خال اس کے داخلی پہلوؤں کا ظہور ہوتے ہیں۔ تصوف اور فلسفے کی اصطلاح میں کہنے دیجئے کہ عضوی ہیئت کے داخلی اور خارجی پہلوؤں میں وہی نسبت ہے جو تصوف کی حد تک اعلان علیہ اور اعیانِ ثابتہ میں ہے۔ اس لئے زبان۔ تکنیک۔ اسلوب اور ہیئت کے خد و خال کی تمام تبدیلیاں اور تجربے محض خارجی نہیں ہوتے بلکہ ہیئت کے اندرون کا اظہار ہوتے ہیں۔ اور انکی جڑیں شعری تجربے میں پیوست ہوتی ہیں۔

شعری تجربہ (Poetic Experience) اور ہیئتی تجربہ (Formal Experiment) میں فرق ہے۔ ہیئتی تجربہ خارجی مادی اور میکانکی عمل ہے۔ شعری تجربہ داخلی نفسیاتی اور تجریدی عمل ہے۔ ہیئتی تجربے نیشن اور فارمولے کے تحت کئے جاتے ہیں جبکہ شعری تجربہ کے اسباب اور محرکات نیم حقیقی اور حقیقی ہیں۔ نیم حقیقی اسباب میں

سماجی تبدیلیاں۔ نئے مسائل و موضوعات کی موجودگی۔ نیا طرزِ فکر و احساس۔ نئے نقطۂ نظر سے زندگی کو دیکھنا اور پرکھنا۔ روایت کے جبر کے خلاف ردِعمل یا روایت شکنی کا رجحان وغیرہ ہیں۔ ان سب کے تحت شعری ہیئت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ مگر محض یہی حقیقت نہیں اصل حقیقت ان سے آگے ہے۔ میرے خیال میں ہیئت میں تبدیلی اور تجربے کا ایک اور سبب ہے۔ اور وہی اصل اور بنیادی بھی ہے۔ جس کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اور وہ ہے "بذاتِ خود شعری تجربہ" — جب تک کوئی تخلیق "شعری تجربہ" کی پراسرار اور پیچیدہ گزرگاہ سے ہو کر وجود میں نہیں آتی وہ شعری ہیئت نہیں ہو سکتی۔

شعری تجربہ ایک پُراسرار اور پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی کئی سطحیں ہیں۔ جنکو مادّی۔ ذہنی اور لسانیاتی سطح کہا جا سکتا ہے۔ ہر شعری تجربہ کی بنیاد مادّی تجربہ پر ہوتی ہے۔ شاعر سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے زمان و مکان کے کسی نہ کسی دائرہ میں سرگرمِ کار رہتا ہے۔ وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان گنت مادّی تجربوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے ہر نئے اور پرانے عمل کو تجربہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر فرد کی حیثیت سے اس کا ہر عمل شعری تجربہ نہیں بنتا۔ شعری تجربہ وہی عمل بنتا ہے جو احساس میں جنبش اور جذبات میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جب کوئی مادی عمل نمایاں افادیت کو کھو دیتا اور جذباتی خصوصیت سے متصف ہو جاتا ہے تو شعری تجربہ کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔ کسی تجربہ کی جذباتی خصوصیت ہی اسکی جمالیاتی خصوصیت ہے۔ جذباتی خصوصیت جتنی دیر تک اور جتنی دور تک باقی رہتا ہے۔ جمالیاتی خصوصیت بھی اسی وقت تک اور اسی حد تک باقی رہتی ہے۔ شاعری اور اس کے تمام تجربوں کی بنیاد یہی جمالیاتی خصوصیت ہے۔

شاعری "محرک" کا بیان نہیں بلکہ محرک کے تاثر کا اظہار ہو۔ ہر محرک میں شاعر کے لئے دو گونہ خصوصیت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ محرک کے گرد فنکار کے جذبات کا ایک ہالہ سا بنجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے محرک بدلا ہوا شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ شعری تجربہ سے محرکاتی عناصر غائب ہو جاتے ہیں اور اس کی نیز جمالیاتی عناصر حاوی ہو جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ہر محرک میں فنکار کے لئے معنویت کے ایک سے زیادہ نقطے ہوتے ہیں۔ مختلف وجوہ سے فنکار کے لئے ان میں سے کسی ایک نقطہ کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے اور باقی کی ثانوی جس چیز کو میں معنویت کے نقطے سے کہہ رہا ہوں آپ انھیں "خصوصیات" کہہ سکتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ محرک میں معنویت کی ایک سے زیادہ تہیں یا پہلو یا خصوصیات ہوتی ہیں۔ ثانوی اور ذیلی خصوصیات "اساسی خصوصیات" کے گرد جمع ہو کر اس کی تزئین تشکیل اور تکمیل میں صرف ہو جاتی ہیں۔ شعری تجربہ کی بنیادی خصوصیت میں بلا کی قوتِ نمو ہوتی ہے۔ یہ اپنی تکمیل اور ظہور کے مختلف سمتوں میں بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ اور تخیل کے پروں پر اڑنے لگتی ہے۔ یہی بنیادی خصوصیت اپنی تمام ترجمالیاتی فضا کے ساتھ "لسانیاتی اظہار" کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

شعری تجربہ کے ذہنی عمل کے دوران ایک ایسی منزل آتی ہے۔ جہاں شعری تجربہ کی بنیادی خصوصیت ذہن میں ایک ہیولیٰ بن جاتی ہے۔ یہ ہیولیٰ لسانیاتی عمل شروع سے کچھ قبل بہت واضح اور محسوس ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے ذہن میں ایک خاص گونج اور ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کی گونج اور ان کا ارتعاش ہوتا ہے — پھر اچانک کوئی لفظ کوئی امیج۔ ترکیب مصرع یا لسانیاتی ٹکڑا سطحِ ذہن پر ابھر آتا ہے۔ یہ لسانیاتی ٹکڑا شعری تجربہ کی بنیادی خصوصیت کا لسانیاتی ظہور ہوتا ہے۔ اس لسانیاتی ٹکڑے کے گرد زبان کی شکلیں جمع ہونے اور شعری تجربے کی صورت گری کرنے لگتی ہیں۔ اس طرح ہر شعری پیکر شعری تجربہ کی بنیادی خصوصیت کا خارجی ظہور ہوتا ہے۔ اس کے اسلوب، تکنیک، زبان اور ہیئت کے تمام خدوخال شعری تجربہ کے اولین لمحے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور شعری تجربہ کے بطن سے ہی نمودار ہوتے ہیں۔ اگر "عضوی ہیئت" کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو شعری ہیئت کے تجربے کا ہر وہ سبب جو محض خارج سے تبدیلی پیدا کرتا ہے خود بخود مسترد ہو جاتا ہے اور ہمارے سامنے ہیئت کے تجربے کا خاص داخلی اور فنی معیار سامنے آتا ہے جس پر کس کر کھوٹے کھرے کی پہچان کی جا سکتی ہے۔

ابتدا یہ سوال کہ ہیئت کے تجربوں اور عصری آگہی کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس پر غور کر لینا ضروری ہے کہ خود "عصری آگہی" کیا ہے؟ "عصری آگہی" میں لفظ "عصری" اضافی ہے اصل چیز "آگہی" ہے۔ "آگہی" کی ضرورت اور اہمیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ مگر یہ کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں۔ اس میں بصارت اور بصیرت دونوں شامل ہیں۔ بصارت تو خیر سب کو میسر ہے مگر بصیرت ہر کسی کا مقدر نہیں۔ بصیرت ماضی کی روشنی میں حال کو سمجھنے حال کو سمجھنے حال کے آئینہ میں مستقبل کا نظارہ کرنے کا نام ہے۔ اسمیں روایت کا شعور اور جدت کا عرفان دونوں پہلو شامل ہیں۔ آگہی کو محض عصریت ([illegible]) تک محدود کر دینا صحیح نہیں البتہ عصریت کی حیثیت کے بغیر آگہی مکمل نہیں ہو سکتی۔ ہر دور میں سیکڑوں متضاد اور متوازی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، فکری نئی رجحانات اور تقاضے بر سرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہی صورت حال آج بھی ہے۔ آج کے ذہنی افق پر سیکڑوں رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان رنگوں کی اصلیت کو جاننا اور ان کے اثرات کو پہچاننا عصریت کی جہت ہے۔ اس لئے عصری آگہی کو ایک ایسا پیمانۂ اقدار کہہ سکتے ہیں جو زندگی کرنے کا فن سکھاتا اور زندگی کو با معنی بناتا ہے۔

عصری آگہی شعری تجربہ کے اولین لمحہ سے شاعر کی رہنمائی کرتی ہے۔ جب شاعر ہزاروں تجربوں میں سے محض ایک یا چند کو شعری اظہار کے لئے انتخاب کرتا ہے اور باقی کو مسترد کر دیتا ہے تو وہ ایک مخصوص قسم کے پیمانۂ اقدار اور قوتِ تمیز سے کام لیتا ہے۔ یہ پیمانۂ اقدار اور قدرتِ تمیز شعور، عرفان اور آگہی ہے۔

آگہی محض تجربوں اور تجربوں کے درمیان تمیز ہی نہیں کرتی بلکہ شعری تجربہ کی بنیادی خصوصیت اور جمالیاتی فضا کو ایک نئی معنویت عطا کرتی ہے۔ فن میں تازگی اور توانائی عصری آگہی سے آتی ہے۔ اگر شعری تجربہ سے عصری آگہی کا جوہر نکال دیا جائے تو یک طرف فن محض ذریعۂ تعیش ہو جائے دوسری طرف اسکا رشتہ زندگی سے ٹوٹ جائے۔ عصری آگہی فن کا رشتہ زندگی سے استوار کر کے اسکو توانائی، وسعت، ابدیت اور گہری معنویت عطا کرتی ہے۔

محض عصری آگہی یا اس کا اظہار ہی کافی نہیں۔ اگر عصری آگہی کا اظہار شاعری ہوتا تو ہر مفکر، دانشور، سیاست داں اور معلم شاعر ہو جاتا۔ یہاں تک کہ ریڈیو کا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی شاعری کا مقام حاصل کر لیتا جس طرح محض جمالیاتی عناصر پر تکیہ کرنے سے شاعری میں رومانی عناصر اور سستی لذتیت کی فراوانی ہو جاتی ہے اس طرح محض عصری آگہی سے بھی اعلیٰ شاعری کا وجود نہیں ہو سکتا۔ وہ اعلیٰ علمی شہ پارہ تو ہو سکتا ہے مگر شعری کارنامہ نہیں۔ اس لئے عصری آگہی اور جمالیاتی خصوصیت کی یکساں اہمیت ہے۔ اعلیٰ شاعری انہی دونوں کے امتزاج اور اس امتزاج کے شعری تجربہ کے بطن سے نمودار ہونے پر وجود میں آتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد تجربوں کا سیلاب آگیا ہے اور عصری آگہی کی لے بہت تیز ہو گئی ہے۔ تجربوں کے نام پر کاریگری اور آگہی کے نام پر ادعائیت کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ شعرا ترسیل سے ترسیل کی ناکامی تک اور ہیئت سے بے ہیئتی تک آگئے ہیں۔ مغرب کی ناکام ادبی تحریکوں سے سرسری واقفیت حاصل کر کے نئی نئی تکنیکیں تراشی جا رہی ہیں۔ بعض بالغ نظر نقادوں اور مخلص سیاسی کارکنوں نے نثری شاعری کا افتتاح فرما دیا ہے۔ عصری آگہی کے نام پر تنہائی، تشنج، بے یقینی اور قدروں کی شکست کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مغرب سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے یا انسان کے درد و داغ کی ترجمانی نہیں کرنی چاہئے یا ہیئت کے تجربوں کو فروغ نہیں دینا چاہئے۔ مگر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شعری ہیئت کے تجربوں کی جڑیں شاعر کی شخصیت کے توسط سے شعری تجربے کے بطن میں پیوست ہونی چاہئیں اور عصری آگہی میں مثبت قدروں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کے تاثر کو پیش کرنا چاہیے۔ بقول جگر

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اسلم پرویز
۱۹۱۱ - ترکمان گیٹ۔ دہلی ۶

عصری آگہی اور اردو نظم

شاعر کی تخلیقی قوت ہمیشہ خارجی زندگی کے اجزا و عناصر سے ہم آہنگ ہو کر ہی اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ خارجی زندگی کے ان اجزا و عناصر کو ہم روح عصر کا نام دے سکتے ہیں۔ روح عصر شاعر کی تخلیقی قوت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جس SYNTHESIS کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اسے شاعرانہ فکر کہا جا سکتا ہے۔ بہترین شاعرانہ افکار وہی ہیں جو عصری رجحانات اور میلانات کا احاطہ کئے ہوئے ہوں۔ عصری رجحانات کو نظر انداز کر کے تخلیقی قوت کا کوئی بھی مظاہرہ اہم اور کارآمد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک تخلیقی ادبی ذہن کا کام نئے افکار کی دریافت یا جستجو کے بجائے عصری زندگی کے اجزا و عناصر کو جس میں عصری فلسفے بھی شامل ہوں اپنی تخلیقی قوت کے ساتھ مرکب کر کے پیش کر دینا ہے اس عمل میں عصری ماحول کے فکری سرمائے سے فیضیاب ہونے، تن دہی کے ساتھ اسے تخلیقی قوتوں کے دامن میں سمیٹنے اور ان کو موثر اور دل کش انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہی سے اعلیٰ قسم کا ادب پیدا ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ادب کے اعلیٰ نمونوں کی تخلیق کے لئے دو قوتوں میں مطابقت ضروری ہے ایک انسانی قوت اور دوسرے عصری قوت۔ عصری قوت کے بغیر انسانی قوت مہمل اور بے کار ہے لیکن شاعر کی تخلیقی قوت جن عصری رجحانات اور افکار کو اپنے شعری عمل کے لئے منتخب کرتی ہے یا یوں کہئے کہ جن سے وہ ATTRACT ہوتی ہے وہ خود شاعر کی تخلیقی قوت کے قابو سے باہر کی چیزیں ہیں اور شاید اسی لئے شاعر کی تخلیقی قوت اور عصری قوت کے امتزاج کا نتیجہ وہ جمود کی طرح چار نہیں ہوتا۔ کسی بھی شاعر کی جانب سے اس طرح کی دانستہ اور باضابطہ کوشش گویا ادب اور تخلیقی قوتوں کے منافی ہے۔

اردو شاعری کی روایتی تنقید میں 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کی اصطلاحوں کا استعمال عام طور پر ہوتا رہا ہے۔ یہ اصطلاحیں اپنی جگہ کتنی ہی عمومی سہی لیکن ان کے ذریعہ بحث کو آگے چلانے میں مدد ضرور مل سکتی ہے۔ 'ادب برائے ادب' سے وہ ادب مراد لیا جاتا ہے جس میں شاعر کا مقصد محض فنی مہارت دکھلانا ہو جب کہ 'ادب برائے زندگی' کا مطلب گویا ایسا ادب پیدا کرنا ہے جس کے ذریعہ زندگی کی عکاسی بھی ہوتی ہو اور اس کی تزئین اور تہذیب بھی۔ 'ادب برائے زندگی' کا نظریہ ترقی پسند تحریک کے فروغ کے ساتھ اردو میں مقبول ہوا۔ 'ادب برائے ادب' یا 'ادب برائے زندگی' کا اطلاق مروجہ تنقیدی معیاروں کے مطابق ان شاعروں پر بھی کیا جا رہا ہے جو ان نظریات کی اختراع سے پہلے گزر چکے ہیں۔

شاعر بنیادی طور پر ایک تخلیقی ذہن کا مالک ہوتا ہے اور اس اعتبار سے وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ اپنی تخلیقی کارفرمائیوں میں اپنے گرد و پیش کے ماحول، زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو پیش کرتا ہے۔ مثنوی سحر البیان ہو یا مثنوی زہر عشق ان کی عمارت میر حسن اور نواب مرزا شوق لکھنوی نے لکھنؤ کی معاشرت پر کھڑی کی ہے۔ گویا وہ ادب بھی جسے ہم ادب برائے ادب کے زمرے میں شمار کرتے ہیں کسی نہ کسی نوعیت سے عصری

...حسیات کا حامل ہوتا ہے۔ تاہم عصری آگہی اس بات قدرے مختلف شے ہے۔ عصری آگہی کا اطلاق اس شاعر پر ممکن ہے جو نہ صرف اپنے عہد کا بھرپور شعور رکھتا ہے بلکہ معاشرے کی جانب اس کا مخصوص رویّہ بھی ہے۔

اردو شاعری میں انیسویں صدی تک تمام فکر فلسفۂ تصوف تک محدود تھا۔ چنانچہ اردو کے قدیم شعراء کے یہاں تصوف کا عنصر ہی غالب نظر آتا ہے یہ صورتِ حال انیسویں صدی کے وسط تک رہی۔ غالب کے زمانے میں ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات میں ایک تغیر پیدا ہو چکا تھا۔ سفرِ کلکتہ کے ذریعہ خود غالب کے ذہن پر نئی روشنی کے کافی اثرات پڑے تھے لیکن سماجی سطح پر کوئی واضح نظامِ فکر موجود نہ ہونے کے سبب غالب کی تمام تر تخلیقی قوت ان کی انا کے گرد گھومتی رہی جس کی بنا پر وہ عصری قوتوں کا احاطہ انفرادی انداز میں بہت مبہم اور غیر واضح طور پر ہی کر سکے۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب انگریزی علوم کے ذریعہ آزادی اور حقوقِ انسانی کے تصورات کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی تو اردو میں قومی اور وطنی شاعری کے دور کا آغاز ہوا۔ انقلابِ روس کے بعد اشتراکی نظریات نے اردو شاعری کے فکری سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور عصری آگہی کی اہمیت نے ترقی پسند تحریک کی شکل میں باقاعدہ ایک مہم کی صورت اختیار کر لی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب نوآبادیاتی نظام کی طنابیں ڈھیلی ہونی شروع ہوئیں تو ترقی پذیر ملکوں کے لوگ اقتصادی اور سیاسی شعور سے ہم کنار ہوئے اسی دوران ہندوستان میں آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیمِ ہند کا سانحہ پیش آیا۔ یہی وہ دور ہے جب ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے زندگی کی اقتصادی اور طبقاتی نوعیت پر غور و خوض شروع ہو چکا تھا۔ تقسیمِ ہند اور اس کے بعد برصغیر میں ہونے والے فسادات کے المیوں نے اردو کے شاعروں کو بے پناہ متاثر کیا اگرچہ حالی سے لے کر اب تک جدید رجحانات کی نمائندگی...

...نظم ہی کر رہی تھی لیکن اس دور میں نظم کو جو اہمیت حاصل ہو چکی تھی اس کا اندازہ خود جگر جیسے غزل گو شاعر کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اس دور کی نمائندہ نظمیں کوئی ایک دو نہیں بلکہ بے شمار ہیں تاہم وامق جونپوری کی نظم 'تقسیمِ پنجاب'، سردار جعفری کی نظم 'بغاوت سے انقلاب تک'، اور ظہیر کاشمیری کی نظم 'پاگلو' کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی اکثر نظموں میں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے مشرق اور خصوصاً ایشیا کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا۔ قمر اجنالوی کی طویل نظم 'مشرق' جو اینگلو امریکن بلاک کو خطاب کر کے کہی گئی ہے اسی رجحان کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ سردار جعفری کی نظم 'فریب' اس دور کی ان نظموں میں سے ہے جن کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کی وہ صورتِ حال سامنے آئی جہاں بیرونی منافع خوروں اور ملک کے عوام کے درمیان ہندوستانی سرمایہ دار کی صورت میں ایک اور منافع خور کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس کا بار بھی غریب عوام ہی کی گردن پر تھا۔ مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک کے سب سے قابلِ احترام شاعر ہیں۔ مخدوم نہ صرف عصری شعور رکھتے ہیں بلکہ ان کے ہاں صداقتِ جذبات بھی ہے۔ وہ شاید اس گروہ کے واحد شاعر ہیں جن کے قول و عمل میں کوئی تضاد مشکل ہی سے ملے گا۔ لیکن ترقی پسندوں میں ہمیں سب سے زیادہ تازگی اور استقامت فیض کے یہاں نظر آتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ فیض نے اپنی انفرادیت کو نظریاتی شاعری سے مغلوب نہیں ہونے دیا۔ ادبی سیاق و سباق میں ایک شاعر کے لئے سیاسی اور سماجی شعور کے علاوہ اپنے عصر کے ادبی رجحانات کی آگاہی بھی عصری آگہی کا ایک اہم ترین جز ہے۔ فیض نے مغربی زبانوں کے ادبی رجحانات سے بہت کچھ اثر لیا اور تمام تر COMMITMENT کے باوجود شاعری میں رمزیت کو برقرار...

نکلا۔ پانچویں دہائی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے جب ترقی پسندوں کے یہاں سیاسی سطح پر قناعت پسندی اور ادبی سطح پر تکرارِ مضامین (جو شاید لازم و ملزوم ہیں) حد سے تجاوز کر گئی تو ادب میں ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہوگئی صنعتی نظام جس کے اشارے پر تمام دنیا رقص کر رہی تھی ایک تخلیقی، حساس اور باشعور فن کار کے لئے محض اقتصادی نابرابری کا ہی نہیں بلکہ ذہنی اور روحانی ناآسودگی کا سبب بھی بنا جا رہا تھا۔ دوسری جانب اس دور میں مستند قسم کے ترقی پسند جنہیں خود ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو کے مطابق سیاست کے میدان میں انقلابی ہونا چاہیئے تھا عصری تقاضوں پر لبیک کہنے کے بجائے حکمراں طبقے کو انقلابی قدروں کا علم بردار سمجھنے لگے اور زندگی کا وہ کرب محسوس کرنے سے معذور ہوتے چلے گئے جو عمل کے میدان میں زندگی کو سنوارنے کی جستجو کرتا ہے اور ادبی سطح پر شاعری کو تنوع بخشتا ہے۔ تاہم اس صورت حال کے باوجود ادب میں عصری آگہی کا سلسلہ یکسر منقطع نہیں ہوا اور بہت سے شاعر اردو شاعری کے نئے افق تلاش کرنے میں محو رہے۔ اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' کو ہم اردو نظم کے ان رجحانات کا ابتدائی نقش کہہ سکتے ہیں جن کا تکملہ اس صدی کی چھٹی دہائی میں بھرپور طریقہ پر ہوا ہے۔

عصری آگہی کی حدود آج صرف ہندوستان کی خشک سالی، بے روزگاری اور افلاس یا بنگلہ دیش کی نوعیت اور پاکستان کی موجودہ حالت تک ہی نہیں بلکہ شکاگو میں ہونے والے مظاہرے، چی گوارا کا قتل، رجیس ڈبری کی گرفتاری، مارٹن لوتھر کنگ کا خون، ویت نام کی زبوں حالی، جنوبی افریقہ کے حالات، فرانسیسی طلبا کا احتجاج، مغربی ایشیا کی صورت حال، خلا کی تسخیر، برٹرنڈ رسل، سارتر اور کامو کا CONVICTION، ہوچی منہ، ماؤزے تنگ اور ہربرٹ مارکیوز کے افکار، وجودیت کا فلسفہ، احساسِ تنہائی کی تعبیریں، ہپی ازم، GURUDOM اور اقتصادیات کی بنیاد پر پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی اصطلاحوں میں کرۂ ارض کی تقسیم تو غرض یہ تمام چیزیں ہی تو عصری آگہی کے دائرے میں آتی ہیں۔

ادبی نقطۂ نگاہ سے عصری اور جدید دو اہم اصطلاحیں ہیں جنھیں ہم انگریزی میں COUNTEMPORARY اور MODERN کہتے ہیں اور جو مخصوص معنویت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان اصطلاحوں کے مطابق عصری شاعر وہ ہے جو اپنی منطق اور فکر کے ذریعہ خارجی دنیا کی ناانصافی اور ابتری کا جائزہ لیتا ہے اور اس صورت حال کا اظہار اپنے فن کے ذریعہ کرتا ہے۔ عصری فن کار اکثر ترقی پسند اور سوشلسٹ خیالات کا حامی ہوتا ہے چنانچہ جب وہ اپنے عہد پر نکتہ چینی کرتا ہے یا طنز کرتا ہے یا اس پر کاری حملہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عصری قوتوں کو متاثر کرنے پر مصر، اُن کی اصلاح و تحریک پر آمادہ اور بہ صورتِ دیگر مخالفت کے لئے برسرِ پیکار ہے۔ عصری فن کار کی تحریروں میں سماجی اور سیاسی اور دوسرے وہ تمام موضوعات ہوتے ہیں جن کے لئے وہ سماج کا ایک فرد ہونے کے ناتے خود کو COMMITTED تصور کرتا ہے۔ عصری فن کار کا تعلق نئی دنیا سے ہے اور وہ اپنی تخلیقات میں اسی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ زندگی میں جاری و ساری تاریخی قوتوں اور سائنس اور ترقی کی قدروں میں یقین رکھتا ہے اور وقت پڑنے پر شاید وہ انقلابی بھی ہو سکتا ہے۔ عصری شاعری کا ربط سماج سے گہرا ہے اور چونکہ سماج میں متضاد قوتیں کام کرتی رہتی ہیں لہٰذا عصری شاعر اس حالت میں خود کو غیر جانب دار نہیں رکھ سکتا بلکہ وہ سماج میں کام کرتی ہوئی متضاد قوتوں میں سے کسی ایک قوت کے ساتھ فریق کی حیثیت سے مخالف قوتوں کے خلاف کھڑا دکھائی دیتا ہے گویا وہ سماج میں ایک جانب دارانہ موقف کا قائل ہے لیکن یہ جانب داری زندگی کی تخریب کے لئے نہیں بلکہ اس کی تعمیر کے لئے ہے۔ عصری شاعر کے برعکس تو نہیں ہاں بالمقابل جدید شاعر کے یہاں نفسِ مضمون سے زیادہ صنفِ سخن اور الفاظ اور اسلوب کے نئے پن پر زور ہوتا ہے۔ اس کے یہاں ہمیں ایک ایسی صورت حال کی آگاہی ملتی ہے جو بالکل نئی [illegible] ہے، جدید، ماضی کے

افکار اور فلسفوں سے پوری طرح باخبر زندگی کے المیوں سے بخوبی آگاہ اور ان سے بکھرنا تا تمٹنے کی فکر میں غلطاں نظر آتا ہے۔ وہ تمام دنیا کا جائزہ بحیثیت مجموعی لیتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی ہی وہ اسکی مذمت کرتا ہے۔ جدید شاعر عصری صورتِ حال سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود عصری قدروں میں یقین نہیں رکھتا مغرب کی ہنگامہ خیز صنعتی ترقی نے وہاں کے فرد کے لئے جس طرح کے مسائل کھڑے کر دئے ہیں ان کے مقابلے میں ہندوستان جیسے نیم صنعتی ملک کے فرد کے مسائل شاید کچھ بھی نہیں اس اعتبار سے ہندوستانی معاشرے میں 'جدید' کا وہ تصور جس کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے فی الحال کچھ UTOPIA سا لگتا ہے ——— تاہم عصری اور جدید ا کوئی مطلق اور میکانکی تقسیم نہیں ———

——— اس دور کی شاعری میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں جدیدیت پسند عصری تقاضوں کو لبیک کہتے ہوئے اور عصری شاعر جدیدیت پسندانہ نقطۂ نظر کے حامی نظر آتے ہیں۔ دراصل تخلیقی فن کار جن قدروں کو بھی گلے لگاتا ہے انھیں احکام کی طرح اپنے سر پر مسلط نہیں کرتا بلکہ اولاد کی طرح پیار کرتا ہے۔ اردو شاعری میں اس طرح کے منچلے ذی ہوش سر پھروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو عصری اور جدید کی مبہم سرحد پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ عصری اور جدید کے اس ملے جلے طبقے کو میں اپنے نزدیک ریڈیکل تصور کرتا ہوں جو ایک جانب تو جدید کے NON COMMITTAL رویّہ کا مخالف اور اس کے برعکس تبدیلیوں کا خواہاں ہے اور دوسری جانب سیاق و سباق میں مسلک کو عقیدہ ماننے کا بھی قائل نہیں۔

اختر الایمان نے 'بنتِ لمحات' کے پیش لفظ میں اردو کی تمام شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصار کے اندر کی شاعری اور دوسری حصار کے باہر کی شاعری۔ وہ شاعری جسے ہم غزل کے روایتی مکتب سے منسوب کر سکتے ہیں اور جس کا حجم ہر دور میں دوسری تمام شاعری کے مجموعی حجم سے زیادہ رہا ہے حصار کے اندر کی شاعری کہی جا سکتی ہے (یہ شاعری موجودہ بحث سے خارج ہے) بقیہ شاعری کو جس میں عصری اور جدید دونوں ہی شامل ہیں ہم حصار کے باہر کی شاعری کہہ سکتے ہیں اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حصار کے باہر کا کوئی حصار متعین نہیں کیا جا سکتا ——— دبستانِ دلّی اور لکھنؤ کے ضمن میں داخلیت اور خارجیت کی بحث بہت ہوتی رہی ہے۔ لکھنؤ کی خارجیت شاعر کے داخلی وجود سے بالکل معریٰ تھی اس لئے اس کا درجہ دلی کی داخلی شاعری کے مقابلہ میں کم تر رہا لیکن موجودہ دور کی حصار کے باہر کی شاعری، جو تمام تر خارجیت پر مبنی ہے ہر دور کے لئے RELEVENT ہو جاتی ہے چونکہ یہ شاعر کے داخلی وجود سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے۔ کسی بھی عصر کی شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے ہمیں یہ مان کر چلنا پڑے گا کہ شاعر ایک تخلیقی فن کار ہے اور اس کی انفرادیت ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور جب ہم یہ مان کر چلیں گے تو ہمیں عصری شاعر کو اسی بھیڑ میں تلاش کرنا ہوگا جنھیں ہم جدیدیوں کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ جدیدیوں میں ایسے شاعر بھی ہیں جو کبھی ترقی پسند تھے اور اب دستوری قسم کی ترقی پسندی سے گریزپا مگر عصری قدروں کے علم بردار ہیں۔ انھیں عصرِ حاضر کے 'سند باد' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ان شاعروں کی حیثیت اہلِ شریعت کے مقابلے میں اہلِ طریقت کی سی ہے ان شاعروں میں باقر مہدی، قاضی سلیم، عمیق حنفی، بلراج کومل، اختر الایمان، ن۔م۔ راشد، سلام مچھلی شہری، وحید اختر اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ جدیدیوں کا ایک اور گروہ قدرے نوجوان شاعروں پر مشتمل ہے ایسے شاعر جو ترقی پسند تحریک کے دورِ زوال میں ابھرنے شروع ہوئے یہ لوگ بھی مختلف نظریاتی دھاروں سے بہتے ہوئے اب ایک ہی دھارے میں آ گئے ہیں۔ انھوں نے بھی اردو کی نئی شاعری کے خزانے میں قابلِ قدر اضافے کئے ہیں ان میں ندا فاضلی، مخمور سعیدی، کمار پاشی، زبیر رضوی، شاذ تمکنت، شہریار، شہاب جعفری، اور احمد ہمیش وغیرہ کے

کافی نمایاں ہیں۔ ــــــــــ ایسے شاعر تو 'جدید' کے اس تصور سے بہت قریب نظر آتے ہیں جس کا ذکر 'عصری' اور 'جدید' کی بحث میں پہلے ہو چکا ہے اردو میں بہت کم ہیں۔ عادل منصوری اور افتخار جالب وغیرہ اس رجحان کے نمائندہ شاعر ہیں مستند ترقی پسندوں کو بھی ہمیں عصری ہی ماننا پڑے گا اگرچہ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسی اقبال کے نزدیک ابلیس یا آدم جیسی متنوع شخصیتوں کے مقابلے میں اللہ ہو کہنے والے نیکی کے فرشتوں کی۔

اس دور میں جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کے نام ہی اپنی جگہ عصری زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی بشارت دیتے ہیں مثلاً 'نجات سے پہلے' 'ثبت لمحات'، 'سفر مدام سفر'، 'سندباد' 'آواز کا جسم' 'خواب تماشا' 'خشت دیوار' 'نیا عہد نامہ' 'لفظوں کا پل'، 'کالے کاغذ کی نظمیں'، 'اسم اعظم'، 'آئینہ در آئینہ'، 'پتھروں کا مغنی'، وغیرہ۔

آج کے دور میں ترقی پسند مصنفین کے پرانے منشور کی کسوٹی پر شاعر کو عصری آگہی کی سند دینا ایک غیر منصفانہ رویہ ہوگا۔ مذہب جیسی چیز میں بھی ایک خاص مدت کے بعد ہی صحیفے اور کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ آج وہ شاعر اور ادیب بھی جو پولیٹیکل COMMITMENT کی اہمیت پر زور دیتا ہے جب دنیا کے حالات پر نظر ڈالتا ہے تو اسے مایوسی ہوتی ہے شاید کچھ ہی دن کی اور بات ہے جب امریکا اور چین کے سفارتی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ روس جو سوشلسٹ انقلاب کی جنم بھومی ہے سوشلسٹ تحریکوں کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے ترقی پذیر ملکوں کے بورژوا حکمراں طبقوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ ہند چین، مغربی ایشیا، جنوبی افریقہ اور لاطینی امریکہ میں سامراجی قوتوں کو چیلنج کرنے والی کوئی عالمی طاقت نظر نہیں آتی۔ صنعتی نظام نے دو نہائی دنیا کو ایک طبقاتی سماج میں منتقل کر کے رکھ دیا ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں کا المیہ یہ ہے کہ ہم شعور و آگہی کی سطح پر دوسروں کے شانہ بہ شانہ اور صنعتی اور اقتصادی ترقی کے معاملے میں بے پناہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ زندگی چھوٹی اور کھوکھلی خواہشوں کے دام میں گرفتار ہے آج ملک کے سفید پوش پرولتاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جس کی آنکھیں صنعتی نظام کی چکاچوند سے خیرہ ہیں۔ ہر شخص اپنے سے زیادہ پچھڑے لوگوں کے بجائے اپنے سے آگے نکل جانے والوں پر نظر رکھتا ہے اور خود بھی ایک سیڑھی چڑھ جانا چاہتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے معاشرے میں لاٹری، چٹ فنڈ، معمے، پرائز بانڈ اور رشوت سبھی کچھ موجود ہے۔ ہر شخص دوسرے کو گرا کر آگے نکل جانے کی فکر میں ہے ہندوستان کے محنت کشوں اور مزدوروں کی ضروریات آج بھی دو روٹی سے زیادہ نہیں بڑھی ہیں اور جب تک وہ ان دو روٹیوں کی تگ و دو میں مصروف ہیں جو انہیں کبھی ملتی ہیں اور کبھی نہیں ان کے دماغ میں انقلاب کی چنگاری سلگتی رہے گی اس لئے رجز اور ترانوں سے زیادہ ٹھوس قسم کی عملی تنظیموں کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کی یوں ہی کمی ہے اور جو پڑھے لکھے ہیں ان میں بھی مطالعے کی روایت برائے نام ہے اور مزدور تو سرے سے پڑھنا جانتا ہی نہیں۔ مزدور کی شان میں کہی گئی نظمیں زیادہ تر دانشور لوگ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ طبقاتی نظام کے شکنجے میں پھنسے ہوئے مزدور کی شان میں سب سے بڑی شاعری تو یہ ہے کہ 'دنیا بھر کے مزدور ایک ہو جاؤ' ضرورت اس شاعری کی معنویت کو عملی جامہ پہنانے کی ہے جس کے لئے قلم کے علاوہ اور چیزوں سے بھی کام لینا ہوگا اور یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے اردو شاعری میں مخدوم اس کی زندہ مثال ہے۔ ایسے حالات میں محنت کشوں اور مزدوروں کی شان میں مطلق، واضح اور رسمی قسم کی رجز خوانی کر کے آسودگی کی زندگی گزارنا جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت ... پڑھی لکھی سفید پوش نسل کو راہِ راست پر لانے کی ہے ... وہ بے ربط اور الجھے فقرے اور وہ مبہم اشارات۔

کی کرب ناک حسیت کا تخلیقی اور دانشورانہ ردِ عمل ہیں آج کے ادبی تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ قابلِ قدر ہیں اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اردو جدید شاعری اس عصری حسیت سے اس قدر مالا مال ہے۔ اس کی مثالیں دینا بھی مضحکہ خیز لگتا ہے۔

ہم کسی پر لیبل نہیں لگا سکتے ہمیں لیبل لگانے کا حق بھی نہیں کیونکہ اس کے لئے سب کو اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا ہو گا۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو لے کر ساتھ چلیں۔ ادیب یا شاعر پر کوئی منشور نافذ نہیں کیا جا سکتا شیر کی نسل پنجروں یا عجائب گھروں میں بند کر کے سے محفوظ نہیں ہو جاتی اس کے لئے جنگلات کو فروغ دینا پڑتا ہے۔ ہم بغیر کوئی قانون وضع کئے کسی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ اور اگر ہم نے کوئی قانون وضع کر بھی لیا جس کے ہم حق میں نہیں تو بھی شاید ہم کچھ ہی لوگوں کو کافر قرار دے سکیں ＝

انور صدیقی

مقطع میں آپڑی ہے....

حضرات، کل کے سیمنار میں جو بحثیں اٹھیں ہیں، انھیں سن کر مجھے بار بار اس بات کا احساس ہوا کہ ہم اردو کے ادیبوں کو بات کرنی آتی ہے اور اس سے زیادہ بات بنانی آتی ہے اور جو چیز نہیں آتی ہے وہ ہے بحث کرنی۔ ہم لوگ نہ جانے کب سے مربوط اور دو ٹوک انداز سے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں ہم کبھی کبھی سوچنے کا انداز اختیار کرتے ہیں تو لگتا ہے جیسے قطرہ میں سوچ رہے ہوں۔ فکری تسلسل یا فکری نظام کی موجودگی کا احساس ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ لکھتے اور بولتے ہیں تو یہ تاثر دیتے ہیں گویا وہ فکر کی گہرائیوں میں اتر رہے ہیں جبکہ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فکری انتشار کے دلدل میں اُترتے جاتے ہیں اور انھیں گمان یہ رہتا ہے گویا گہرائیوں میں اتر رہے ہیں ہمارے اس ذہنی رویے کی بھی ایک تاریخ ہے اور اسکی بہت سی تہذیبی، سیاسی اور معاشی وجہیں ہیں جن کا ذکر یہاں کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مگر اس کے المناک نتیجے بہرحال ہمارے سامنے آئے ہیں کل کے بہت سے مضامین میں بھی اور بحثوں میں بھی ـــــ معلوم نہیں کہ ہم کب اور تہذیب کی کس منزل پر، مسائل کا حقیقی ادراک کریں گے۔ ہماری ذہنی بے باکی نہ جانے کب جاگے گی اور ہماری جذباتی پسماندگی نہ جانے کب ختم ہوگی؟ ایسا تو نہیں ہے کہ ہم ذہنی بزدلی کا شکار ہوگئے ہیں اور مسائل کا ادراک تو دور کی بات ہے انکا احساس۔ زندہ اور توانا احساس بھی ہمیں نہیں رہ گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم جب لکھتے ہیں تو دوسروں کے سہارے لکھتے ہیں بولتے ہیں تو زیادہ سخن سازی کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ المناک صورتحال یہ ہے کہ ہمارے جذبات بھی زیادہ تر وادین یا ideal Commonsenses میں ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ذہنی غلامی بھی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اُن چند مسائل کی طرف آپ کو متوجہ کروں جو میرے خیال میں بنیادی ہیں اور جن کے ادراک و احساس کے بغیر جدیدیت، ترقی پسندی، عصری آگہی اور یہاں تک کہ ادب کی بات بھی بے معنی رہتی ہے: میں انتہائی اختصار کے ساتھ آپ کی خدمت میں چند مسائل رکھنا چاہتا ہوں اور انکی حیثیت سوال کی ہے جواب کی نہیں اس لئے کہ سوال کرنا زیادہ اہم ہوتا ہے جواب دینے سے۔

ہماری اصل پریشانی یہ نہ ہونی چاہیئے کہ جدیدیت کے ماننے والے ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جو مشکل یا مبہم ہے یا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سادہ ذہنی سے بات نہیں بنے گی۔ ہر زمانے کے ادب میں کچھ فن پارے آسان، سادہ اور واضح ہوتے ہیں اور کچھ مشکل، مبہم اور پریشان کن۔ آخر ہم نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ آسان، سادہ اور براہ راست ادب ہی اچھا اور بڑا ادب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نئی اور مختلف انداز سے بامعنی تخلیق ہر دور میں ابتداً پڑھنے والے کو الجھن میں ڈالتی ہے اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی پڑھنے والے کے ذہن و احساس اور لکھنے والے کے تجربے اور وسائلِ اظہار میں فاصلہ موجود ہوتا ہے فن کار بعض باتوں کا ادراک پہلے کر لیتا ہے اور قاری کو جب

حقیقی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے، تو بات اسکی سمجھ میں آتی ہے
اس فاصلے کو اچھا فن کار کم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ فاصلہ نہیں
رہے گا یا اس فاصلے پر ادیب کو قدرت حاصل ہے کہ وہ جب چاہے
اسے گھٹالے یا بڑھالے یہ بات فن اور زندگی کی ناقص سوجھ بوجھ
کی غماز ہے اور میرا خیال ہے کہ اس بات پر زیادہ زور دینے کی
ضرورت نہیں ہے۔ جو بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ جدیدیت سے
تصور کے پیچھے زندگی، یا اس سے زیادہ موت کا جو فلسفہ ہے، اسکی
تردید کی جائے یا اُسے expose کیا جائے۔ اسکی ضرورت
کچھ یوں بھی ہے کہ جدیدیت پسندی کا ادب اظہار ہے اس
world view کا جسے جدیدیت کے ماننے والوں نے قبول کیا ہو
یا یورپ میں سرمایہ داری کے انحطاط نے جہاں اور بہت سی بوالعجبیاں
پیدا کی ہیں اُن بوالعجبیوں میں سے یہ بھی ایک ہے۔ یورپ کے تہذیبی
سفر کے پس منظر میں یہ تمام باتیں قابلِ فہم ہیں کہ وہاں ایک تہذیب
کا cycle مکمل ہو رہا ہے۔ وہاں تہذیب پر شام آچکی ہے۔
یہ استعارہ بھی اب غلط ہے وہاں تہذیب کی موجودہ منزل پر
وہاں تو تہذیب پر رات آچکی ہے اور وہ بھی بیمار کی رات۔ یہاں
اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا ایک طیارہ بن گئی ہے۔ وہاں اگر بادلیئر
نے بہت پہلے یہ کہا تھا کہ انسان، اچھا، نیک، شریف اور اعلیٰ
کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ اُس نے رحمِ مادر میں، پیشاب کی تھیلی
کے نیچے پورے نو مہینے گزارے ہیں، وہاں اگر گراہم گرین نے یہ
کہا ہے کہ جب تک کہ انسان کی Respectivity کے روحانی تصور
کی جگہ مسیحی عقیدہ ہم قبول نہیں کر لیتے کہ انسان نامکمل ہے اور
گناہ اولین کی یادداشت اُسے ستاتی ہے اس وقت تک ہم سچا
اور عقیدت پسندانہ ادب تخلیق نہیں کر سکتے، وہاں ایلیٹ اور
پاونڈ یہ کہتے ہیں کہ اب تہذیب صرف چند ٹوٹے ہوئے
جملوں کا ڈھیر بن گئی ہے یا ہم ٹوٹے ہوئے پیکروں کا انبار
... کہ تہذیب ایک ایسی بوڑھی کتیا ہے جس کے دانت تک جھڑ کر
گر چکے ہیں یا ورجینیا وولف Virginia Woolf دنیا کو
یہ اطلاع دیتی ہے کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ انسانی کردار

بدل گیا ہے" یہ باتیں مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے پس منظر
میں سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں نشاۃ ثانیہ کے بعد انسانیت پسندی
کا جو مسلک پیدا ہوا تھا اس کا زوال ہوا، مسیحی ہیومنزم کا بھی
زوال ہوا، انقلاب فرانس نے انفرادیت پسندی کے فلسفے کے زیر اثر
جو انسان پیدا کیا اُس نے سرمایہ داری کو جنم دیا اور سرمایہ داری
کے بطن سے، آزادانہ مسابقت کے تصوّر کی کوکھ سے معاشی انسان
The Economic man پیدا ہوا وہ جب مرنے لگا تو مذہب ساتھ
تھا اور نہ ہی روحانی مسلک انسان نوازی۔ نتیجے کے طور پر انسان
کی ایک نئی قسم پیدا ہو گئی جسے یورپ میں ہی، یورپ والوں نے جمالیاتی
انسان کا نام دیا اور اس نے فن اور فن کاری کو وہی درجہ دیا جو
یورپ میں پہلے مذہب کو حاصل تھا۔ نیا جمالیاتی مذہب، روایتی
مذہب سے مختلف تھا تو صرف ان معنوں میں کہ اس نے ادارہ بندی
قبول نہیں کی۔ اس نے اپنے انفرادی، جمالیاتی تجربے یا اپنی انفرادیت
کی تیرگی یا تر اکو مرکز و محور بنا لیا۔ اب سب کا تجربہ مختلف تھا تو
ان کا اظہار بھی مختلف ہونا چاہیئے اور جب تجربہ انوکھا اور اچھوتا
ہے تو اس کا اظہار بھی علامتی ہو گا۔ اور جب عقیدہ یہ ہو کہ یہ تجربہ
خود کھیل ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا مختلف ہے کہ
دوسرے اس میں شریک نہیں ہو سکتے تو عقیل صاحب کو یا مجھے کیا
حق حاصل ہے کہ ہم یہ شکایت کریں کہ ہمیں بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں
آتیں۔ افصح صاحب، آپ نے کل جس ادبی برہمنیت کا ذکر کیا تھا اُسکی
ابتدا یورپ میں یوں ہوئی ہے۔ میں نے یہ باتیں اس وجہ سے کہی ہیں کہ
ان کے بغیر اردو میں جدیدیت کی تحریک کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے اور
اس کی صحت یا عدمِ صحت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اسکے علاوہ
جدیدیت کے فکری اور تہذیبی پس منظر اور ادبی نقطۂ نظر کی تشکیل میں
علامت پسندی Post-Impressionism، Impressionism
Surrealism اور ... کا جو ہاتھ اور حصہ ہے وہ بھی
اسی پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ان معروضات کے بعد جو سوال اُبھر کر آتے ہیں ان کا جواب
دینے کی جرأت کوشش جو آج اور ابھی پیدا ہو سکے: کیا ہم جدیدیت کے

اپنایا گیا ہے اس تصور انسانی کو قبول کریں گے جو مغلوب، مفلوج، محدود، منتشر، ٹھکرائے ہوئے [illegible] زندگی اور سماج کو بدلنے کے عزم سے عاری [illegible] ملک نے ایک ایسے ہی انسان کا [illegible] ایسا ہی انسان ملک میں سوشلسٹ انقلاب لائے گا۔ انسان کی یہ Image ایسی ہے جس کا تعلق کم از کم مجھے تو اس سرزمین سے معلوم نہیں ہوتا۔ شمس الرحمٰن اور ان کے بعض دوستوں نے بغیر Legal documents By post (By post اس لئے کہ فاروقی صاحب کا محکمۂ ڈاک سے تعلق ہے) اس ملک میں کم از کم اردو والوں کے لئے اسے smuggle کیا ہے۔ اس انسان کی شناخت بھی آج عصری آگہی کا فرض ہے۔ اسلئے کہ عصری آگہی کا احساس ترین وسیلہ انسان ہی ہے۔ دوسرا مسئلہ حسن Values اور تہذیبی تصور کا ہے جسے ہمارے جدیدیت پسندوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ Project کیا ہے۔ یہ تہذیبی تصور سرمایہ دارانہ مغرب کے لئے اور اس کے پیدا کردہ بحران کے پس منظر میں سچا اور مخلصانہ ہے اور اس نے جو ادب پیدا کیا ہے وہ مغربی معیاروں سے عظیم ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے مگر اس ادب کے بارے میں ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ وہ جھوٹا ادب ہے۔ یہ ادب اس Situation کا فطری اظہار ہے، جو مغرب میں موجود ہے۔ ہاں آپ یہ شکایت ضرور کر سکتے ہیں کہ اس بحران پر قابو پانے کے لئے وہاں لوگوں نے کسی بہت بڑے نظریۂ حیات کا سہارا نہیں لیا ہے اور اگر لیا بھی ہے تو کم لیا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں مغرب کی پیدا کردہ تہذیب ابھی اپنے سفر کے ابتدائی مرحلوں میں ہے اور اسی مرحلے پر ہم نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ یورپ کی تہذیب کی طرح یہاں کی تہذیب نے بھی اپنا Climax مکمل کر لیا ہے اور زوال کے مرحلے میں ہے۔

یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب عمرانیات کے ہندوستانی ماہروں کو بھی دینا ہے، دانشوروں کو بھی اور ادیبوں کو بھی۔ اس لئے کہ اس سوال کے جواب پر ہی ہمارے ادبی اور تہذیبی رشتے کا انحصار ہے۔

اس سوال کا جواب اس لئے بھی اہم ہے کہ جدیدیت صنعتی تہذیب کی جمالیات تخلیق کر رہی ہے [illegible] جیسے وہ جمہوری کی جمالیات کہتی ہو۔ اس کا تعلق ہماری جمالیات سے بھی ہے جسے زرعی تہذیب نے جنم دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم نے غلط مفروضوں پر ساری عمارت بنالی ہے۔ اگر ہماری تہذیب ابھی اتنی نہیں ٹوٹی ہے تو ہمارے یہاں ابھی ترسیل کا بھی وہ المیہ نہیں ہے جس کا ڈھنڈورا آج پیٹا جارہا ہے۔ میرے خیال میں جدیدیت کا ہمارے ملک میں کوئی تہذیبی Base نہیں ہے۔ مصنوعی انداز سے Base بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جیسے امریکی جنوبی ویٹ نام میں اپنے Base بنانے کی کوشش کرتے تھے۔

ان سوالوں کے جواب سے ہی عصری آگہی کی بات آگے بڑھے گی اور ہمیشہ بڑھتی ہے۔

--

قاضی عبدالستار
آنند بھون ۔ سول لائنز ۔ علی گڑھ

سفر ہے شرط...

(تین سیمینار ۔ ایک رپورتاژ)

قرونِ دہلی کے مغرور شہریاروں کے عشرت خانوں سے دور ایک قلندر نے اپنا مسکن بنایا، اتنی دور کہ اگر دیوانِ شاہی کی ہولناک عشرتوں کی بے ادب اور بے محابا صدائیں باریاب ہونے کی جسارت کریں تو چلتے چلتے ہانپنے لگیں۔ سلطانوں کی سلطانیاں ماہ و سال کے آتشیں گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچلی گئیں۔ لیکن اس قلندر کے آستانۂ کج کلاہ کی ڈیوڑھی میں وقت آج بھی مودب کھڑا ہے۔ وقت اپنی ساری بے پناہی کے باوجود خاک ساری پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ یہیں خسرو سو رہا ہے۔ امیر خسرو جس کے دامنِ حیات پر سات سات بادشاہتوں کے دریا سوکھ گئے، اور جس کے قلم نے سات سات زبانوں کو سیراب کر دیا۔ جس نے اپنے مخدوم کے پائے مبارک سے اتری ہوئی ایک جوتی کی خریداری کے لئے سترہ اونٹوں پر لدی ہوئی دولت لٹا دی اور عمر بھر اس سودے کے سود پر ناز کرتا رہا۔ ہماری تاریخ ..... ہماری شاندار تاریخ کے پاس بھی ایسے کتنے صاحب السیف و قلم ہیں جن کے ایک ہاتھ میں فتوحات کی گردنیں ہوں اور دوسرے ہاتھ میں تصنیفات کی جلدیں؟ یہیں جہاں آرا بھی آسودۂ خواب ہے جو چاہتی تو اپنے حکم سے بنائی ہوئی شاندار مسجد کے کشادہ صحن میں سو رہتی۔ لیکن اس نے بھی مسجد پر سلطان جی کے جوارِ رحمت کو ترجیح دی۔ انسان مر کر بھی انسان کا قرب چاہتا ہے۔ یہیں غالب سو رہا ہے۔ کل تک جس کی قبر تھی اور آج جس کا مزار ہے

اور ایسے نہ جانے کتنے گردن فراز یہاں سر بسجود ہیں جن کی ہیبت سے ان کے زمانے کی دہلی کانپتی ہوگی۔ اسی قدیم بستی کو جانے والی سڑک پر جب ٹیکسی مڑنے لگی تو میں کانپ اٹھا کہ اس مقام پر تو بڑے بڑے شہنشاہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ پا پیادہ ہو گئے ہوں گے۔ تھوڑی دور چل کر مغلئی طرز کا وہ سالخوردہ اور شاندار پھاٹک ملا جس کے پہلو میں "غالب اکیڈمی" کی جدید طرز کی عمارت کھڑی ہے جیسے کسی بوڑھے عرب امیر کے پہلو میں نوجوان سکریٹری کھڑی ہو۔ اور جیسے دہلی کے ایک مخیر اردو پرست اور غالب نواز تاجر نے تعمیر کیا ہے۔ میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا جو ایسی تعمیرات کو تاجرانہ مصلحتوں کے فیتے سے ناپ کر چھوٹا ثابت کر دیتے ہیں۔ اسی گئی گزری حالت میں بھی دہلی کے مسلمان تاجروں میں ایسے کتنے ہی دولت مند ہوں گے جو ایسی کئی عمارتیں شراب کے گلاسوں میں گھول کر پی چکے ہوں گے۔ لیکن کسی کو اس کارِ خیر کی توفیق نہ ہوئی۔ اب اگر کسی کو اس کی توفیق ہوئی ہے تو وہ ہماری بے لوث داد و ستائش کا مستحق ہے۔ سیڑھیوں پر کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ ان میں قمر چمک رہے ہیں۔ قمر رئیس اردو کے ترقی پسند نقاد اور شاعر، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریڈر، میانہ قد، بھاری بدن، سلونا رنگ، پیشانی کے داہنے گوشے پر سیاہ بالوں کی جھالر پڑی ہوئی ہلتی ہوئی، لڑکیوں کی سی شرمائی شرمائی مسکراہٹ سے لال ہونٹ، کھلتی بند ہوتی آنکھوں

میں کچھ نیند کا تصور، کچھ بنتِ عنب کی خطا، بھوری ڈھیلی جیکٹ اور کرشچوف کی طرح ڈھیلے ڈھالے پتلون پر سُرخ ٹائی باندھے آنے والوں کے استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔ ٹائی تو نرکی طرف مائل ہوتے ہوئے پیٹ پر چمک رہی ہے۔ پھر کسی طرف سے انور عظیم طلوع ہوئے۔ سانولا رنگ، اچھا چوڑا چکلا بدن، بکھرا بھربال (جو کم بخت آج تک سیاہ ہیں) ٹوٹی پھوٹی کریز والا سُرمئی پتلون، کالا سا کوٹ کیسلی سی قمیض، اور عجیب سے چپل (جیسے پیشاوری ناگرے اور چپل کو جوڑ کر دو سے تقسیم کر دیا گیا ہے) اپنے سر سے پاؤں تک انتظام سنے میرے پاس رُک گئے ہیں۔ رسمیات کا تبادلہ ہوا اور وہ کسی طرف کھو گئے۔ پھر شارب آ گئے۔ شارب ردولوی.... میں تو اس شارب کو جانتا ہوں جس نے لکھنؤ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا تھا، جب میں یونی ورسٹی چھوڑ رہا تھا۔ وہ شارب تو دُبلا پتلا گورا چٹا ریشمی ریشمی سا ایک لڑکا تھا، اور آج کا شارب تو لمبا چوڑا بھاری بھرکم سُرخ و سفید آدمی ہے جس سے اظہار شفقت کرتے ہوئے تکلف ہوتا ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف شارب ردولوی اپنی بیگم کے ساتھ آ رہے ہیں، جو خود بھی دہلی یونی ورسٹی میں لیکچرار ہیں اور افسانے لکھتی ہیں اور کم از کم دو اچھے افسانوں کی خالق ہیں۔ لیجیے وہ اقبال مجید بھی آ گئے "پلور" نے پیٹ کو اور نمایاں کر دیا ہے "یاروں" سے ملاقات کی خوشی نے چہرے کی تھکن کو سُرخی میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب ہم لوگ لکھنؤ یونی ورسٹی میں پڑھتے تھے، اس وقت میں شعر کہتا تھا اور اقبال افسانے لکھتے تھے۔ اور "حلوہ چچا" لکھ کر ادبی حلقوں میں قبولیت حاصل کر چکے تھے، پھر اچانک کہیں کھو گئے اور اچانک ہی کہیں سے برآمد بھی ہو گئے۔ تھوڑے دن ہوئے ان کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ میں سیتاپور کی خیریت پوچھ رہا ہوں اور وہ اتنے خوش ہیں کہ بات ہونٹوں میں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ پھر براج کومل اور دیویندر اسر کے ساتھ سترا نظر آئے۔ براج سترا اور میں ان کو دیکھ کر علی گڑھ پہونچ گیا ہوں۔ ابھی علیگڑھ میں اُترا بھی نہ تھا کہ ننھے بھائی آ گئے۔ سر پر بیانزی کا ایک ایک تار سلیقے سے جما ہوا۔ عمر کی تاب سے کسی حد تک سنولایا ہوا رنگ سیاہ گو لگز، نیچے کی طرف ہلکا سا جھکا ہوا نچلا سُرمئی ہونٹ، اس کے نیچے عنابی ٹائی کی چست گرہ۔ خاکی کا رڈ رائے کا ہلکا سبز کوٹ، پریس کیا ہوا پتلون، پالش کیا ہوا جوتا۔ ٹپ ٹاپ۔ بڑھاپے کا اپنا حسن ہوتا ہے، جو اول جلول رہنے سے مسک جاتا ہے اور بناؤ سنگار سے مسخ ہو جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر کتنے ہی بوڑھے حسین آدمیوں کا خیال آ گیا۔ لیکن ان کا ذکر نہیں کر سکتا کہ ان میں سرِ فہرست تو احتشام صاحب ہیں۔ اور احتشام صاحب کے نام کے ساتھ صیغۂ ماضی کا استعمال کرتے ہوئے ہاتھ کانپنے لگتا ہے۔ ہڈیاں سرد ہونے لگتی ہیں اور آنسو!

آنسو رکیں تو قلم چلے

ننھے بھائی کی نرم شفیق آواز دالفاظ میں ترا بور ہو رہا تھا کہ رضیہ آپا نظر آئیں۔ رضیہ سجاد ظہیر— بالوں کی تھکی تھکی مصنوعی سیاہی کے نیچے ہلکا ہلکا "میک اپ" ڈھکے ڈھکے رنگ کی پھولی پھولی ساری پر سُرخ سویٹر۔ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی چلی آ رہی ہیں۔ وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ ہلال بارغ لکھنؤ میں سرور صاحب کی کوٹھی کے ورانڈے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہو رہا ہے۔ میں باقر مہدی کے ساتھ گیا ہوں۔ باقر مہدی تڑپ رہے ہیں۔ مچل رہے ہیں۔ اور میں دری کے کونے پر خاموش بیٹھا ہوں اور سامنے دیوار سے پشت لگائے سفید چکن کی ساری باندھے بڑے سے جوڑے میں بیلے کی کلیاں پروئے ایک شان دار خاتون بیٹھی سگریٹ پی رہی ہیں۔ میں نے باقر مہدی سے پوچھا "یہ کون ہیں۔؟" انھوں نے کہا "رضیہ سجاد ظہیر"۔ اور میں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ پھر اذان ہوئی اور انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ساری کا پلّو سر پر ڈال لیا، اور میرے ذہن میں کتنے ہی سوال پیدا ہو گئے۔ بلکہ سوال شکاری کتوں کی طرح مجھ پر غرّانے لگے۔ پھر رضیہ آپا سے میرا تعارف ہوا، اور لکھنے والے دوسرے لڑکوں کی طرح شفقت کی ایک جھلکی میرے حصے میں بھی آئی۔ یہ وہی رضیہ آپا ہیں! میری سوچ پہلو بدل رہی تھی کہ کسی نے کہا سہیل صاحب!

اور سہیل صاحب مجھے لپٹا رہے تھے۔ پھولوں کے انبار کی طرح نازک، سر سے پاؤں تک سفید۔ یاد نہیں کہ وہ کرتا پہنے تھے یا شیروانی کہ ان کا کرتا بھی شیروانی سے چھوٹا نہیں ہوتا بوڑھا جسم، بوڑھا چہرہ، لیکن جوان آنکھیں، جوان ہنسی اور جوان اخلاق، اور جوانوں ہی کی طرح منہ میں خوب رچایا ہوا پان۔ وہ مجھ سے اس کانفرنس کے متعلق پوچھ رہے ہیں اور میں ان سے اختر صاحب (اختر اورینوی) کی خیریت پوچھ رہا ہوں، شکیلہ آپا کی (بیگم شکیلہ اختر) مزاج پُرسی کر رہا ہوں ان دونوں کے متعلق جو کچھ میں سن رہا ہوں اس طرح سُن رہا ہوں جیسے لوگ افطار کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ ہم لوگ سیڑھیوں سے اتر آئے ہیں۔ سہیل صاحب کا حکم ہے کہ کسی چائے خانے میں چائے پی جائے۔ میں مذبذب ہوں کہ نگاہ قمر سے لڑ گئی اور قمر رئیس نے مجھے گھورا ہے۔ پھر کوئی سہیل صاحب کے پاس آ گیا ہے۔ وہ رُکے ہیں اور ساتھ ہی انور عظیم کی آواز آئی ہے کہ آپ لوگ اندر تشریف لے چلیں۔ میں داخل ہو رہا تھا کہ کے۔ پی۔ سنگھ سے ملاقات ہو گئی۔ کے۔ پی۔ سنگھ شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی میں اُستاد ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے سکریٹری ہیں اور اُردو کی ادبی تحریکات سے آشنا ہیں اور اس کانفرنس میں شرکت کے لئے علی گڑھ سے آئے ہیں۔ انھیں کے ساتھ بلدیو مرزا مل گئے۔ بلدیو مرزا "اسکائی لارک" کے ایڈیٹر ہیں اور شرکت کے لئے علی گڑھ سے آئے ہیں۔ لوگ بیٹھنے لگے ہیں کہ کسی نے آہستہ سے پیٹھ پر دھپ لگائی۔ مُڑ کر دیکھا تو عابد سہیل کھڑے تھے۔ اور ان کے ہونٹ مشین کی طرح چل رہے تھے معلوم نہیں وظیفہ پڑھ رہے تھے یا گالیاں بک رہے تھے، ویسے ان کی طرف سے پہلی بات کے سلسلے میں اندیشہ کم ہے۔ سانولا رنگ، کشیدہ اور نمایاں خطوط، بال، جیسے ابھی دیہات کی گاڑی سے اترے ہوں اور منہ پونچھ کر سیدھے چلے آئے ہوں۔ سفاری سوٹ پہنے، پائپ پچکارتے باتیں کر رہے ہیں۔ میں پائپ کو رشک سے دیکھتا ہوں۔ لیکن بولتا نہیں ہوں اور میرا نہ بولنا عابد کو کھل رہا ہے۔۔۔ جواب میں مسیح الحسن رضوی، منظر سلیم، احمد جمال پاشا اور عثمان غنی کا حال احوال بتلا رہے ہیں۔ عابد سہیل کی بیگم کو عابد کے کسی دوست کے بجائے "کتاب" سے شکایت رہتی ہے۔ اس لئے کہ عابد سہیل نے "کتاب" کو گود لے رکھا ہے، اور وہ اسے اپنی اکلوتی بیٹی پر فضیلت دیتے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ ہماری سوسائٹی میں جہاں اور بہت سی خامیاں ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لڑکا آخر بڑھاپے کا سہارا بھی تو ہوتا ہے۔ لیکن "کتاب" تو عابد سہیل کی جوانی کو گھن کی طرح لگ گیا ہے خیر یہ ان کا خانگی معاملہ ہے۔

"براہ کرم تشریف رکھئے تاکہ جلسے کی کارروائی شروع ہو۔"

انور عظیم نے تنبیہ کی ہے۔ میں یاروں سے باتوں کی لالچ میں پیچھے بیٹھنا چاہتا ہوں، لیکن ننّے بھائی نے اپنے پاس بٹھا لیا ہے۔ پھر قمر رئیس نے جو اس کانفرنس کے کنوینر ہیں، صدارت کے لئے میرا نام پکارا ہے۔ پریسیڈیم میں براج مینرا کے علاوہ اقبال مجید بھی ہیں۔ ہم تینوں اونچے شان دار ڈائس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ میرے داہنے بازو پر براج مینرا ہیں اور بائیں پر اقبال مجید۔ اور ان کے برابر رکھی ہوئی کرسی کے سامنے قمر رئیس کھڑے ہیں، تقریر کر رہے ہیں۔

> ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں نے ادب اور زندگی کے جس تعلق اور ادیب کے سماجی شعور اور آگہی پر جو زور دیا ہے، آج بھی اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

میرے سامنے ٹائپ کیا ہوا پروگرام رکھا ہوا ہے۔ پہلے اجلاس کی پریسیڈیم میں رتن سنگھ کا نام کٹا ہوا ہے، اس کی جگہ اقبال مجید کا نام لکھا ہوا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ رتن سنگھ کیوں نہیں آئے۔ رتن سنگھ کی شخصیت کے پاس دراز قد، سفید صافے اور قدرے ترشی ہوئی سفید داڑھی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے جس پر بہت سی سفید چیونٹیاں رینگ رہی ہیں، لیکن ان کے روئیں روئیں سے اُمڈتا ہوا بے محابا خلوص ہر شے کی تلافی کر دیتا ہے، اور

اپنے تاثر میں آدمی کو بہالے جاتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس سیمنار میں اگر کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، احتشام صاحب، اختر اورینوی اور ڈاکٹر محمد حسن نہیں ہیں تو نہ سہی کہ ان سب کا جمع کر لینا آسمان سے دودھ دوہنا ہے۔ لیکن غیاث احمد گدی، رام لال، جوگیندر پال، اقبال متین، بلونت سنگھ، شکیلہ آپا، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم کو تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔ کیسی خوبصورت محفل ہوتی۔ تھکا ڈال دینے والی محفل۔ تالیاں گڑگڑا رہی ہیں۔ قمر رئیس تعارفی تقریر ختم کر چکے ہیں۔ میں نے انور عظیم کا نام پکارا ہے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ڈائس کی طرف آ رہے ہیں۔ چہرے بشرے کی پریشانی سے انتظام کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔

اور میں ؛

ایک بار سرور صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

" اس سال میں قاضی صاحب کی رعایت سے فکشن پر سیمنار کرنا چاہتا ہوں"۔

اور فکشن پر سیمنار ہونے والا تھا۔ قرۃ العین حیدر نہیں آ رہی تھیں۔ راجندر سنگھ بیدی "دستک" کی نمائش میں مبتلا تھے۔ اختر صاحب بیمار تھے اس لئے شکیلہ آپا بھی نہیں آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے معذرت کر لی تھی اور میں غیاث احمد گدی کے جواب کے انتظار میں مبتلا تھا، کہ اچانک ان کا خط ملا۔ بالکل سہیل صاحب کے خط کی طرح مہین مہین لکھا ہوا۔ میں نے خط اس طرح پڑھا جس طرح میرے لڑکے مٹھائی کا دونا چاٹ کرتے ہیں۔ وہ سخت بیمار تھے لیکن میرے پاس کھڑے تھے۔

جولائی کا مہینہ اور یونیورسٹی میں سہالک کا زمانہ تھا، ایک شام کلب جانے کے لئے نکلنے والا تھا کہ کسی نے دستک دی۔ دروازے پر بڑھاپے کی طرف مڑتی ہوئی اور دبلے پتلے جسم والے ایک صاحب کرتا پائجامہ اور چپل پہنے کھڑے تھے اور ان کے منحنی سے سائے میں ایک صاحبزادے۔ میں ڈر گیا۔ کہ پکڑے گئے ــــــ وہی واسطے کا پکڑ!

"قاضی عبدالستار صاحب ہیں۔؟"

میں چونکا۔

"آپ ؛"

"غیاث احمد گدی!"

ان سے بغل گیر ہو کر مدتوں بعد اپنی جسمانی صحت کی برتری کا احساس ہوا۔

"آپ کا سامان کہاں ہے"۔؟

وہ بگڑ گئے اور بہت دھیرے سے بولے۔

"ہوٹل میں"۔

"کیا مطلب؟ آپ یہ چاہتے ہیں کہ جب میں جھریا آؤں تو کسی ہوٹل میں قیام کروں"۔

اور وہ کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت سامان آ گیا۔ اور ہم لوگ جو زندگی میں پہلی بار ملے تھے اس طرح ملے جس طرح برسوں کے بچھڑے ہوئے یار ملتے ہیں۔ ہم لوگ دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے بیچ بیچ میں داؤں پیچ بھی ہوتے رہے۔ وہ اودھ آ کر میرے ناولوں اور افسانوں کا ذکر کرتے اور میں جھکائیاں دے کر ان کی خوبصورت کہانیوں کو گھسیٹ لاتا۔ رات ایکسپریس ٹرین کی طرح اڑتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ باتوں کا یہ سلسلہ دہلی کی اس رات ختم ہوا جب غیاث حسن نعیم کے مہمان تھے اور میں شعیب قدوائی کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور ہم سب اس محفل ناؤ نوش میں خود فراموش ہو چکے تھے جیسے میرزا، کمار پاشی اور اظہار اثر نے برپا کیا تھا۔ اور اس عالم میں اور اتنی رات گئے شعیب کے گھر جانے کی نہ ہمت پڑ رہی تھی اور نہ غیاث اور حسن نعیم چھوڑ رہے تھے۔ اور ہم دونوں اسی کمرے میں رات بسر کرنے والے تھے جس میں چھوٹے قد کا موٹا تازہ ایک پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اور فرش پر قالین بچھا تھا۔ جب حسن نعیم چلے گئے۔ اور صبح کاذب انگڑائیاں لینے لگی اور نیند آنکھوں سے گزر کر اعصاب پر سوار ہونے لگی تو لیٹنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ غیاث مجھ سے بڑے تھے، بیمار تھے اور میں ان کا مہمان تھا اور پلنگ ایک تھا۔ جس پر ہم دونوں کی سمائی ممکن نہیں تھی۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کو لٹانے کے لئے

لڑ رہے تھے۔ پھر فیصلہ اسی طرح ہوا جس طرح پتھروں کے زمانے سے آج تک ہوتا آیا ہے۔ یعنی طاقت کے زور سے اور مقتول بعد میرے جسم نے ایک لڑائی جیت لی۔ میں نے غیاث کو پلنگ پر لٹا دیا اور خود قالین پر لیٹ گیا۔ وہ لیٹے لیٹے گھات لگا کر اٹھتے اور میں جھپٹ کر ان کے بازو دبا دیتا، اور وہ اس محبت سے مجھے دیکھتے جس محبت سے کم لوگوں نے دیکھا ہے۔ لیکن غیاث احمد گدی نہیں آ رہے تھے۔ غیاث احمد گدی نہیں آئے تھے۔

تالیاں بج رہی ہیں جیسے دیوالی کی رات دُور بہت سے پٹاخوں کے زنجیرے ایک ساتھ چھٹ رہے ہوں۔ انور عظیم جا چکے ہیں۔ میں اقبال مجید کا نام پکارتا ہوں۔ اب ہال بھر چکا ہے۔ تمام کا تمام۔ کچھ لوگ بالکونی پر نظر آ رہے ہیں، اور میں علی گڑھ میں ہوں۔

علی گڑھ...... سرسید کا علی گڑھ ...... جس نے ہندوستان کو اسپین بننے سے بچا لیا جس نے تاریخ کے اس جبر کو انگیز کر لیا جو بڑی بڑی قوموں کو مٹا دیتا ہے۔ علی گڑھ ... جس کیلئے ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ مستقبل کے ہندوستان کا جو مقدر ہوگا اس میں علی گڑھ کی رہنمائی کا بڑا حصہ ہوگا۔ علی گڑھ ..... جس نے اُردو نثر کو بلوغت عطا کی۔ جس کے مشرق سے تنقید کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور جس کے نقش پا اردو ادب کی تاریخ میں چراغوں کی طرح روشن ہیں۔ علی گڑھ علم و ادب کا معبد ہی نہیں تہذیب کا مرکز اور تمدن کا معیار بھی ہے۔ دُنیا کے پاس ایسے کتنے ادارے ہیں جن کے چہروں کی خراشیں کروڑوں دلوں کو لہولہان کر دیتی ہیں۔ اسی علی گڑھ میں آج بڑی چہل پہل ہے۔ فیکلٹی آف آرٹس کی شاندار عمارت کا ہال آہستہ آہستہ بھر رہا ہے۔ شمالی دیوار کے سیاہ تختے پر اُردو اور ہندی میں سیمینار کا عنوان لکھا ہے در اصل یہی وہ پہلا سیمینار ہے جس نے ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کو جھنجھوڑنے کا کام انجام دیا تھا۔ لمبی چوڑی میز کے پیچھے تین کرسیاں رکھی ہیں۔ ان کے درمیان سانولی رنگت اور دراز قامت کا ایک نوجوان تڑپ رہا ہے۔ یہ کے۔ پی۔ سنگھ ہیں۔ اس سیمینار کے کنوینر۔ اور جن کو میں اقتدار عالم خاں کا نگہبو کہتا ہوں۔ اور نگہبو کی اہمیت فوٹوگرافر جانتا ہے۔ لانبے قد کے گورے چٹے اقتدار عالم خاں پردے کے پیچھے کے آرٹسٹ رہے ہیں۔ لیکن اب کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ ادب کی تاریخ کا یہ عہد بھی خوب ہے ہکلاتے ہوئے خیالات اور تتلاتی ہوئی زبان کا چار جامہ چڑھائے، لکڑی کے گھوڑوں کو ٹانگوں میں پکڑ لوگ دندناتے پھر رہے ہیں۔ کسی کے پاس دیروں کی تعریف اور فن کاروں کی تضحیک سے بھرے پکھ خط ہیں۔ کسی کے پاس چند تبصرے ہیں۔ کسی کے پاس دو ایک مضمونچے۔ لیکن یہ سب ادیب ہیں کہ صحافت کے سیلاب نے ادب کے میزان بہا دیے۔ اقتدار عالم خاں نے تو مستقل موضوعات پر مفصل اور مدلل مضامین لکھے ہیں۔ جو نقوش اور فکر و نظر میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو ادیب نہیں کہتے۔ خاکساری میں۔ قدامت ہوئی نا؟ میرے داہنے بازو کی دوسری رو میں شعبۂ سیاسیات کے نامور صاحب ہیں۔ اقتدار عالم خاں کے اور میرے درمیان ڈاکٹر مہیندر بھرمر بیٹھے ہیں۔ ہندی کے مشہور شاعر اور نقاد اور نصف درجن کتابوں کے مصنف جن کی سیاہ ردی کے پاس قدر کی دلیل ہے میرے سامنے ڈاکٹر عقیل ہیں۔ دُبلے پتلے، بجھے بجھے سے۔ شاید ابھی سفر کی تکان نہیں اُتری۔ ان کے قریب نقن صاحب شیعہ تھیولوجی کے ڈین چھڑی کا سہارا لئے بیٹھے ہیں۔ جو لکھنؤ کو نہیں جانتا وہ بھی نقن صاحب کو جانتا ہوگا۔ انھیں کے برابر سُنی تھیولوجی کے ڈین مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں۔ ان کے پیچھے مسعود علی ذوقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر اور شہریار پاس پاس بیٹھے ہیں ہندی کے مشہور نقاد نامور سنگھ جی ان نے ڈاکٹر ہربنس لال شرما، صدر شعبۂ ہندی کے کان میں کچھ کہا ہے اور وہ سُرخ ہو گئے ہیں اسی قطار میں، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر انور انصاری، اولاد احمد صدیقی، ڈاکٹر ہریش رائے زادہ، اور ڈاکٹر منیر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دہلی سے قمر رئیس کے ساتھ شریف احمد اور صدیق الرحمان قدوائی بھی آ گئے، آگے جگہ نہیں ہے، پیچھے جا رہے ہیں۔ اب ہال بھر گیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ساتھ ڈاکٹر محمد حسن بھی داخل

ہوئے مجھیں جگہ نہیں ہے۔ بالکل پیچھے جا رہے ہیں، ان کی پشت پر جاوید کمال بھی ہیں۔ سچ پوچھئے جاوید کمال پورے سیمینار کی پشت پر ہیں۔ سارا انتظام، ساری دوڑ دھوپ ان کے بھاری بھرکم وجود کی مرہونِ کرم ہے۔ سجاد ظہیر آئے اور جذبی صاحب کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ کھڑے ہوئے سوٹ گلے تک بند نستعلیق شیروانیاں، سیاہ برقعے، جدید اور قدیم اور حسین اور سنجیدہ لباس سب مسکرا رہے ہیں، جیسے سبزے پر پھولوں کی کیاریاں دہک رہی ہوں۔ اور علیم صاحب آگئے، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ترقی پسند نقاد جو شعر بھی موزوں کر لیتے ہیں چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہنے ہیں، جس کا آخری بٹن سب سے بلند ہے۔ سرخ چہرے پر سفید فرانسیسی داڑھی، پیشانی کی طرف چڑھتے ہوئے ابرو اُن کے چہرے کی خصوصیت ہیں۔ ان کے بیٹھتے ہی کے پی سنگھ نے افتتاح کی گزارش کی، وہ مسکراتے ہوئے مائک پر آگئے، بالکل اسی طرح جس طرح درجنوں جلسوں کو خطاب کرتے دیکھ چکا ہوں۔ میں انھیں معروضی نہیں، تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں لیکن پروفیسر ڈاکٹر علیم اور وائس چانسلر ڈاکٹر علیم میں کوئی تبدیلی نہیں نظر آ رہی ہے، جو علی گڑھ سے واقف ہیں، وہ علی گڑھ کے وائس چانسلر کے معنی جانتے ہیں۔ کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایک بار کہا تھا کہ حیدرآباد، بھوپال، رام پور، سب کا اختتام ہو چکا، بس ایک علی گڑھ باقی ہے۔

علیم صاحب تقریر کر رہے ہیں۔

"میں افتتاح کو پسند نہیں کرتا، لیکن یہ افتتاح رسمی نہیں ہے، میں اس موقع پر اپنے خیالات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ سماجی عمل ادب کا ہے اور اس کا ذریعہ زبان ہے، جو خود سماجی عمل کی مرہونِ منت ہے، اس لئے تجریدی مصوری تو شاید ممکن ہو لیکن تجریدی زبان اور تجریدی ادب ممکن نہیں...... ترقی پسندی کسی فیشن یا فارمولے کا نام نہیں، کوئی ایک مجردسا نقطۂ نظر بھی نہیں ہے بلکہ انسانی تعلقات کی فکر دھڑے کی افراد و معاشرے کی کشمکش اور ہم آہنگی کی خواہش کے حقیقت پسندانہ اظہار سے عبارت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کشمکش کی عکاسی تو ہو لیکن ادبی تقاضے پورے نہ ہو سکیں۔ اس صورت میں فن کار اپنے منصب کو پورا نہیں کر سکا۔ ترقی پسند ادیبوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھیں اس میں ادبی حسن اور اعلیٰ فنی قدروں کو ملحوظ رکھیں جو لوگ ادب کی سماجی ذمہ داری سے انکار کرتے ہیں وہی لوگ روٹی، روزی اور سماجی منصب کے حصول کے لئے عام انسانوں کی طرح تمام گُن استعمال کرتے ہیں لیکن ادب میں اپنے آپ کو عام انسانوں سے اور سماج سے الگ تھلگ اور غیر متعلق رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کیا سماج کو اس کا حق نہیں کہ وہ بھی اپنے آپ کو غیر متعلق قرار دے سکے، جو ادب کسی کی سمجھ میں نہ آئے یا ترسیل سے بے پروائی برتے اس کو میں سماج دشمن سمجھتا ہوں نئی بات کہنے کی خواہش مبارک ہو لیکن اس کوشش کے نشے میں ادب کے بنیادی منصب کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"

تالیاں گونج رہی ہیں۔ مقبول احمد خاں اور رضا امام اور اقبال حسن سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کنوینر نے ڈاکٹر خورشید الاسلام کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا ہے۔ خورشید صاحب آ رہے ہیں، دبا ہوا قد، ڈھلکا ہوا رنگ، بالوں پر جمتی ہوئی راکھ، عنابی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے، چشمہ لگائے آہستہ آہستہ آئے اور کرسی صدارت پر بیٹھ گئے، جس نے خورشید صاحب کی تحریر پڑھی ہے وہ ان کے اسلوب کا قائل ہے، جس نے ان کی تقریر سنی ہے وہ ان کی طاقتِ لسانی سے چوُر ہے، خورشید صاحب

ان کی یہی باتیں ہیں۔ وہ خوبصورت اور نادر خیالات جو اپنے اظہار کے لئے ان کو تحریر پر مجبور کرتے باتوں کی کیچڑ میں کھو جاتے ہیں اور چالاک سننے والے چن چن کر اپنی گردن کا ہار بنا لیتے ہیں۔ اب سجاد ظہیر اپنا مقالہ پڑھنے کے لئے اُٹھے ہیں، سجاد ظہیر، بنے بھائی، نقاد شاعر افسانہ نگار، ناولسٹ اور رہنما... جنھوں نے ترقی پسند تحریک کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کو گرفتار کر لیا۔ گوگلس اتار کر جیب میں رکھے۔ نرم اور پُر اعتماد آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

"علی گڑھ یونیورسٹی کی کسی ادبی محفل میں زبان کھولنا آسان کام نہیں ہے۔ باہر سے ہر آنے والے کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ سید احمد خاں، حالی شبلی اور حسرت موہانی کی فکر اور ان کے تخلیقی سرچشموں کا مرکز ہے۔ آج بھی رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری ڈاکٹر عبد العلیم، معین احسن جذبی، آل احمد سرور اختر انصاری جیسے مستند اساتذہ یہاں موجود ہیں۔ خورشید الاسلام، منیب الرحمٰن، قاضی عبد الستار اور خلیل الرحمٰن اعظمی اور راہی معصوم رضا کی ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے جدید اردو ادب کے ایوان میں قابل قدر مقام حاصل کیا ہے۔"

اب ہندی کے نامور نقاد و ادیب ڈاکٹر نامور سنگھ چوہان تقریر کرنے اُٹھے ہیں۔ سفید کھدر کا لانبا کرتا (جسے ان کے قد نے اور لانبا کر دیا ہے) اور دھوتی پہنے ہیں، شانوں پر چادر پڑی ہے اور پوری شخصیت کی ساری آگ آنکھوں میں دہک رہی ہے ڈاکٹر موصوف کو احساس ہے کہ سننے والوں کی اکثریت ہندی کم سمجھتی ہے اور اسی لئے وہ انگریزی اصطلاحوں کی بھرمار کر رہے ہیں۔

اب مائک پر ڈاکٹر محمد حسن آرہے ہیں۔ مشہور نقاد اور ڈرامہ نگار، دبلے، سانولے، کشیدہ قامت، چشمہ لگائے، بالوں کی کھچڑی میں دال کم اور چاول زیادہ، اور آنکھیں دیکھئے تو گویا ابھی نہا کر نکلے ہیں بے جھجک اور بے باک انداز میں مقالہ پڑھ رہے ہیں، ان کی آواز میں وہ قوت ہے جو مطالعے اور غور و فکر سے پیدا ہوتی ہے، اور میں ان کی ذات سے وابستہ خوبصورت یادوں کے سُنہرے دیس میں کھو گیا ہوں۔

اب کنور پال سنگھ نے ڈاکٹر عرفان حبیب کا نام پکارا ہے۔ چھوٹا قد، چمپئی رنگ، اُلجھے بال، سیدھا سادا چشمہ، بے نیازی کے رنگ کا لباس پہنے تیز قدموں سے آئے اور مدھم آواز میں مضمون پڑھنے لگے۔ یہ واحد مضمون تھا جو انگریزی میں پڑھا گیا۔ بیچ بیچ میں خالص آکسفورڈ کے انداز میں مزاح لطیف میں لپٹا ہوا چھوٹا سا فقرہ چپکے سے ٹانک دیا۔ محفل تازہ دم ہوئی اور یہ آگے بڑھ گئے۔

تالیوں کی گونج میں عرفان صاحب جا رہے ہیں اور خورشید صاحب کھڑے ہو گئے ہیں۔ خورشید صاحب کی تقریر میں بھی تحریر کی طرح ان کا اپنا رنگ ہے۔ لطیف طنز، شیریں چٹکیاں، آواز کا زیرو بم سب کچھ انانیت کے دھاگے میں پرو دیا ہوا ہے۔ وہ گرج رہے ہیں اور برس رہے ہیں:

"چند ادیبوں کو جان لیوا تنہائی محسوس ہوتی ہے ایسے لوگوں سے سوال کرنا چاہئے کہ یہ کس بنا پر ہوئی ہے اور آپ اتنا سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ تنہائی کو FETISH بنانے والے ادیب ان فقیروں سے مشابہ ہیں جو اپنی پنڈلی پر پٹی باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر آنے جانے والے کو یہ زخم دکھا کر بھیک مانگتے رہتے ہیں۔ تنہائی کا احساس اگر آفاقی ہے تو مبارک ہے ورنہ ریاکاری ہے۔ موت کا خوف اگر تحمل پیدا کرتا ہے تو مبارک ہے ورنہ یہ درد شکم کو دردِ زہ سمجھنے یا جتلانے کے مترادف ہے۔"

اب آزاد لائبریری پر شام اتر رہی ہے۔ دور تک کاہی مخمل کی میٹنگ بچھی ہے جس کے حاشیے پر اشوک کے جوان درخت سبز ٹیڈی کا سوٹ پہنے کھڑے ہیں اور کچھ شمشاد اور صنوبر انسانوں کا روپ دھارے ٹہل رہے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دور پر ہفت رنگ قالین بچھے ہیں اور کنور پال سنگھ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمارے سیمنار میں مضمون پڑھئے۔ میں چپ ہو جاتا ہوں۔ پھر اسی رات

اقتدار عالم خاں اسٹاف کلب کے "بلیرڈ روم" میں داخل ہوئے۔ میں کیو لیے ہوئے ان کے پاس ہی رک گیا ہوں۔ انھوں نے مضمون پڑھنے کے لئے کہا ہے اور میں نے جواب میں قہقہہ لگایا ہے۔ اقتدار عالم خاں کا چہرہ کہہ رہا ہے کہ اس قہقہے سے ان کو خوشی نہیں ہوئی۔ شاید اسکالر جذبات کے بے محابا اظہار کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن فن کار تو جذبات کا پتلا ہوتا ہے۔ ہنستا ہے تو شادمانیاں چھننے لگتی ہیں، روتا ہے تو پتھر آب دیدہ ہو جاتے ہیں

اقتدار عالم خاں چلے گئے ہیں۔ میں کھیلتا رہا اور سوچتا رہا۔ ذہن ... جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے پر اصرار کرنے والا ذہن مادّی اور ذاتی فائدے اور نقصان کے درمیان پنڈولم کی طرح ڈولنے والا ذہن مجھے خاموش رہنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن دل جو ہمیشہ بائیں بازو میں رہتا ہے جو دن میں خواب دیکھتا ہے جو عاشق کو وفا اور ادیب کو جسارت پر اکساتا ہے، جو راتوں کی گردش میں بیداریوں کے انگارے روشن ہوتا ہے، جو جوانی میں چہرے کو مسخ اور بالوں کو سفید کروا لیتا ہے، ایسی کسی ڈگر نے پر اصرار کرتا ہے لیکن اب تیسرا مضمون ختم ہو گیا اور کنور پال سنگھ نے ڈاکٹر عقیل کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی ہے۔ ان کی آواز کمزور اور لہجہ دھیما ہے۔ دور بیٹھے ہوئے لوگ کچھ سن نہیں پا رہے ہیں اس امید پر کہ تھوڑی دیر بعد شاید آواز بلند ہو جائے، خاموش بیٹھے ہیں امید جس کے گرد خوابوں کے شامیانے لگے ہیں۔ اب لاؤنج بھر گیا ہے جگہ جگہ انسانی جسموں کے الاؤ روشن ہیں۔

اب ہندی کے شاعر اور شعبۂ ہندی دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر شیو ناتھ ترپاٹھی مضمون پڑھنے اٹھتے ہیں۔ چھوٹا سا دلچسپ اور خیال انگیز مقالہ پڑھا۔ داد لی اور چلے گئے۔ پھر شریف احمد استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی بحث کا آغاز کرنے اٹھتے ہیں۔ نہ شخصیت میں چمک دمک ہے اور نہ آواز میں گھن گرج ہے۔ سیدھے سادے اسکالر ہیں۔ پیچھے سے آئے، اپنی بات کہی اور بے نیازی سے چلے گئے۔ پھر نعمان احمد صدیقی کھڑے ہوئے نزلے نے جوانی سے جوانی چھین لی۔ پتلے سے چہرے پر شکنوں کا جال بچھا ہے۔

چھوٹے سے چھوٹا ردّ عمل ان کے چہرے کے خطوط کی معنی خیز جنبشوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے حساس چہرے کم ہوتے ہیں۔ اگر خاموش بیٹھے رہیں تو کسی کی نظر نہ پڑے، اور اگر بولنے کھڑے ہو جائیں تو بڑے بڑے جغادری ادیب و شاعر نوٹس لینے پر مجبور ہو جائیں۔ جب ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی تو یہ لبرل تھے۔ جب ترقی پسندی کا سیلاب اترا تو یہ ترقی پسند ہو گئے۔ دہی بائیں بازو والی بات آواز جس پر اعتماد کا صیقل ہے گونج رہی ہے۔ کنور پال سنگھ کھڑے ہوئے تو میں سمجھا کہ کسی کے نام سمن جاری کرنے والے ہیں لیکن وہ خود تقریر کرنے لگے ہیں۔

کنور پال سنگھ نے خلیل الرحمان اعظمی سے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے کہا ہے لیکن وہ بیٹھے رہے، اور اقتدار عالم خاں ڈائس پر آ گئے۔ جدیدیت کے سیمینار میں انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ اپنی اثر نفسی اور شعر بیانی کے لئے مدّتوں یاد رہے گی لیکن یہ اقتدار منزلت اقتدار ہیں۔ نہ صرف یہ کہ تلوار نیام میں ہے بلکہ سرے سے کر غالی ہے۔

پھر لنچ کا وقفہ ہوا۔

تیسرے اجلاس کی صدارت سید سجاد ظہیر کر رہے ہیں۔ علی گڑھ کے کسی ادبی جلسے کی آخری صدارت کر رہے ہیں۔ ابھی آنکھوں پر احتشام صاحب کی موت کا قرض باقی تھا کہ سجاد ظہیر کی موت نے دستک دینا شروع کر دی۔

صدیق الرحمٰن قدوائی ڈائس پر آ گئے ہیں۔ گول مٹول بدن، گول چہرہ، بڑھا ہوا شیو، خوش اخلاق، سنجیدہ اور کم گو۔ اسٹینڈ پر جھکے ہوئے اٹک اٹک کر مضمون پڑھ رہے ہیں۔ شاید صاف کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ سماعت لنگڑا رہی ہے لیکن سب پر سکون ہیں۔ طالب علموں کی ایسی مہذب خاموشی کا تماشا بھی علی گڑھ ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب قمر رئیس مقالہ پڑھنے جا رہے ہیں۔ مقالے کا لفظ ... تکنیک کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، ورنہ ضخامت میں ریڈیو ٹاک سے زیادہ نہیں تھا۔ کانفرنس اور سیمینار میں جو لوگ دفتر کھول کر

بیٹھ جاتے ہیں وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ قمر کو یہ راز معلوم ہے۔ میں مقالہ سن رہا ہوں کہ قمر نے مجھے دیکھا اور ایک تلوار سی چمکا دی۔

"قاضی عبدالستار کا مقالہ ایک تخلیقی فن کار کا مقالہ ہے لیکن انھوں نے پریم چند کی کہانی "کفن" کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، میں "کفن" کو پریم چند کی نمائندہ کہانی ماننے سے انکار کرتا ہوں۔"

قمر کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ علیم صاحب آگئے اور ڈائس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مجھے اپنی آواز سننے کا شوق نہیں ہے۔ لیکن قمر نے چھیڑ جو دیا۔ ڈاکٹر حسن احمد کے بعد ڈاکٹر بھر ﺍٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ اسٹینڈ پر رکھ لیا ہے دوسرے سے سیدھے پیچھے الٹے ہوئے کھچڑی بالوں کو سہلایا ہے اور عادت کے مطابق پنجوں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی تقریر کے بعد ڈاکٹر محمد حسن آگئے ہیں، اور جیسے اعلان کر رہے ہیں۔

"ترقی پسندی کوئی جامد فارمولا یا مذہبی عقیدہ نہیں ہے، در اصل ایک نقطۂ نظر ہے اور اس نقطۂ نظر کی تعبیر و توجیہ مختلف حالات میں مختلف طریقوں پر کی جائے گی۔ آج کے ہندوستان میں ترقی پسندوں کے تقاضوں کو جاننے اور خد و خال پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ آج کے ہندوستان کی تصویر پیش نظر ہو۔ قاضی عبدالستار نے اپنے مقالے میں یہ اہم بات کہی ہے کہ ہندوستان کی بیاسی فی صدی آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ لیکن ہم نے سماجی حقیقت نگاری کے لئے نمائندہ آبادی مزدوروں کو سمجھ لیا ہے جو کہ کروڑوں کسانوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں اور نمائندہ حقیقت نہیں ہیں۔"

میں ابھی علی گڑھ میں تھا کہ بلراج مین را نے مجھے جگا دیا۔ اقبال مجید جا چکے تھے، اور مینرا کہہ رہے تھے کہ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے تقریر کے لئے کہوں، میں نے انکار کر دیا کہ کرسی صدارت کسی سے گزارش نہیں کرتی۔ مینرا نے خود کہا، اور ڈائس پر آگئے۔ ڈاکٹر نارنگ کی تقریر ان کے اپنے نقطۂ نظر کی ٹھنڈے لہجے، پارلیمانی زبان اور استدلالی انداز سے سجی ہوئی وکالت کر رہی ہے، پورے سیمینار میں ایک خاص قسم کی جدیدیت کی وکالت نارنگ ہی نے کی۔ اب بنے بھائی ــــــ ڈائس پر آگئے ہیں۔ رک رک کر بول رہے ہیں۔ بڑھاپے کے باوجود آواز پر جوانی ہے، لہجے میں تیزی ہے، ڈاکٹر نارنگ کی تقریر کا جواب دے رہے ہیں۔ علم دلیلوں کے ڈھیر لگا رہا ہے۔ بلیغ ظرافت چٹکیاں لے رہی ہے۔ قمر نے میرے کان میں کہا کہ میں بنے بھائی کو ٹوک دوں کہ وہ بہت سارا وقت لے چکے، میں نے انکار کر دیا کوئی ہم عصر ہوتا تو شاید میں یہ کر گزرتا لیکن وہ تو بنے بھائی ہیں اور موجیں مار رہے ہیں اور میں تماشہ کر رہا ہوں۔ پھر عابد سہیل آئے۔ علامت نگاری پر چھوٹی سی خوبصورت تقریر کی اور چلے گئے۔ اب ڈیڑھ بج رہے ہیں اور کئی نام ہیں، جو بحث میں حصہ لینے کے لئے ڈائس پر آنا چاہتے ہیں، اور جسم روحانی غذا سے سیر ہو چکا ہے۔ تھک چکا ہے اور مادی غذا کے لئے بے قرار ہے۔ ماوہ ہم غالبوں کے اعمال کا محور ہے، جی چاہتا ہے کہ میں خطبۂ صدارت کے نام پر ایک چھوٹی سی تقریر کروں۔ لیکن ...... پٹنہ یونیورسٹی کا شعبہ اردو غالب سینٹیزی منا رہا تھا۔ تیسرے اجلاس کی میں صدارت کر رہا تھا۔ آج کی طرح وہاں بھی گھڑی دیکھی تھی، جس میں آج ہی کی طرح دو بج رہا تھا، اور میں نے جلسہ برخاست ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

لکھنؤ میں نئے ادیبوں اور شاعروں کا سیمینار تھا۔ رام لال کنوینر تھے اور میں صدر، وہاں بھی میں نے کرسی صدارت کو خاموش رہنے کی تعلیم دی تھی، پھر آج وہ روایت کیوں توڑی جائے۔ آج بھی میں جلسے کی برخاستگی کا اعلان کرتا ہوں۔

میری طرح دوسرے مہمانوں کے ساتھ کچھ میزبان بھی غالب

اکیڈمی کے زمین دوز ہال میں داخل ہو جاتے ہیں، جہاں تھوڑی سی پلیٹوں میں تھوڑا سا کھانا رکھا ہے۔ اور بہت سے آدمی تھوڑا تھوڑا کھا کر بہت سا پانی پی لیتے ہیں۔

دوسرا اجلاس جو دن کے ڈھائی بجے شروع ہونے والا تھا، ساڑھے تین بجے شروع ہوا ہے۔ ہال میں کرسیوں کی کی آخری قطار کے سامنے تاباں صاحب کھڑے ہیں۔ غلام ربانی تاباں گورے چٹے، لابنے چوڑے۔ خضاب آلود سیاہ بالوں کے نیچے سیاہ چشمہ لگا ہے۔ چاہتے تو مکتبۂ جامعہ کی سربراہی پر ڈٹے رہتے۔ لیکن اس عمر اور اس زمانے میں جبکہ لوگ ملازمتوں سے جونک کی طرح چمٹے رہنے پر عزت و آبرو کی بازی لگا دیتے ہیں محض ایک اصول کی خاطر ایسی ملازمت چھوڑ دی اور اس طرح چھوڑ دی جیسے لوگ دودھ کے پیالے میں کچھ کالا کالا دیکھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں ان سے گفتگو کر رہا تھا کہ سانولے رنگ اور گداز جسم کی ایک بی بی اپنی سفید ساری کا آنچل درست کرتی آئیں اور آداب کیا۔ میں پہچان گیا۔

"آپ صغریٰ مہدی ہیں۔؟"

"جی!"

"آپ کا ناول 'پا بجولاں' میں نے پڑھ لیا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔"

"میں نے تو آپ کو بھیجا تھا۔"

"جی ہاں ... اقتدار عالم خاں نے ذکر کیا تھا، لیکن عجیب اتفاق ہے۔"

قمر رئیس نے دوسرے اجلاس کا اعلان کر دیا ہے۔ عابد سہیل صدر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ پریسیڈیم میں دیویندر اسّر اور افصح ظفر بیٹھے ہیں، اور میرے ذہن میں علیم مسرور کا ناول "بہت دیر کر دی" گھوم رہا ہے۔ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کی طالبات کے جھرمٹ میں کوثر اور قیصر نظر آئی

ہیں، میں نے ان دونوں کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا ہے۔ سامنے نوجوان شاعر عنوان چشتی بیٹھے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر اس بیماری کا خیال آگیا جس کا ذکر انھوں نے لکھنؤ کی اساتذۂ اردو کی کانفرنس سے واپسی پر کیا تھا۔ اس سفر سے ایک حسین یاد وابستہ ہے۔ لکھنؤ ایکسپریس کے اسی ڈبے میں ڈاکٹر محمد حسن تھے، قمر رئیس تھے، شارب ردولوی تھے۔ عنوان چشتی تھے اور میں تھا۔ گاڑی چلنے کے بعد بھوک کی خاطر کم اور پذیرائی کے خیال سے زیادہ وہ ناشتے دان کھولا گیا جو عنوان چشتی یا ڈاکٹر محمد حسن کے کسی عزیز یا دوست نے ساتھ کر دیا تھا۔ تھوڑے سے اصرار کے بعد سب شریک ہو گئے۔ میں معذور تھا کہ میرے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا بُری طرح پک گیا تھا اور نوالہ بنانے سے قاصر تھا۔ میں انکار کر رہا تھا کہ ڈاکٹر محمد حسن کے ہاتھ کا نوالہ میرے ہونٹوں تک آگیا۔ میں نے ذرا سے تکلف کے بعد منہ کھول دیا اور وہ اسی طرح ایک نوالہ مجھے کھلاتے اور دوسرا خود کھاتے رہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے ہوش میں اس طرح کسی کے ہاتھ سے کھانا کھایا ہو۔ کھانے تو اس سے اچھے بھی کھانے کو ملتے رہیں گے لیکن اس کھانے کی لذت؟

صدیق الرحمان قدوائی مضمون پڑھ رہے ہیں۔ بھاری آواز چبھتے ہوئے فقرے۔ میرے بائیں طرف کا دروازہ کھلا ہے، اور "درگاہ مبارک" کی مشہور عمارت "بارہ کھمبا" سفید سنگین مغلی محرابیں چمک گئیں۔ اور میرے تخیل کے تلوؤں میں گرگدی ہونے لگی ہے لیکن میں تھوڑی دیر ذہنی طور پر بھی اس اجلاس میں موجود رہنا چاہتا ہوں۔ افصح ظفر میرے سامنے ہیں، بہار سے آئے ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ مضمون پڑھ رہے ہیں اور میں انکے گزشتہ مضامین کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ میرے پاس ہی تنویر علوی بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو ابھی حال ہی میں جامعہ ملیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی ریڈرشپ کے منصب پر فائز ہوئے ہیں۔ انھوں نے جھک کر عنوان چشتی کے کان میں کچھ کہا ہے۔ کیا کہا ہے یہ تو نہیں معلوم لیکن ان کی کرسی کی چیخ میں نے بھی سنی ہے۔ اب تقی حیدر مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ آج پہنچا ہے بہت دنوں بعد

ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن وہ ویسے ہی نظر آئے، جیسے فرج میں رکھے ہوئے ہوں۔ صرف بالوں پر بیتی ہوئی چاندنی راتوں کے نقش پالے اور گہرے ہو گئے ہیں۔ صاف ستھری، جچی تلی دو ٹوک باتیں ہیں جو تیز پاٹ دار آواز میں گندھی ہوئی ہیں۔ ذرا دور پر ظہیر احمد صدیقی بیٹھے ہوئے ہیں۔ خاموش اور پُرسکون۔ لئے دیئے رہنے والا انداز۔ سر سے پاؤں تک سلامت روی کا نمونہ۔ انھیں کے پاس ڈاکٹر شریف احمد ہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ خاموش کیوں ہیں۔ علی گڑھ کے سیمنار میں ڈاکٹر شریف نے بہت اچھا مضمون پڑھا تھا اور فکشن پر انھوں نے کئی قابل ذکر مضامین لکھے ہیں۔ تقی حیدر ڈائس سے اتر رہے ہیں۔ قمر رئیس نے ڈاکٹر عقیل کا نام پکارا ہے ڈاکٹر عقیل ڈائس پر جا رہے ہیں۔ سانولا رنگ، دُبلا پتلا جسم، پیشانی دور تک چلی گئی ہے۔ چندلے سے چہرے کے دونوں طرف ہلکے ہلکے کھچڑی بالوں کے چوڑے چوڑے برکیٹ لگے ہیں آنکھوں میں چھوٹے چھوٹے مدھم مدھم انگاروں کی چمک ہے جسے چشموں کے شیشوں نے اور دبا دیا ہے۔ مدھم مہذب آواز اور خاکسارانہ انداز میں مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ مطالعے اور محنت کی چمک سے فقرے جگمگا رہے ہیں۔ اور میں نیاز حیدر کو دیکھ رہا ہوں۔ زردی مائل سفید بڑے بڑے بال گردن پر ڈھیر ہیں۔ سفید گھنجان داڑھی گریبان کو سہلا رہی ہے۔ مرمری مرمری ہاتھ بار بار بالوں پر لپکتے ہیں، بار بار پہلو بدلتے ہیں۔ چہرے کا ایک ایک نقش بول رہا ہے۔ اس بیزاری کی جھلی کھا رہا ہے جسے باطن میں دہکتے ہوئے الاؤ جنم دیتے ہیں۔ اور جو اس عمر تک پہونچتے پہونچتے راکھ کا ڈھیر ہو جایا کرتے ہیں لیکن یہاں تو ابھی تک کسی نہ کسی طرح روشن ہیں۔ میں نے نیاز حیدر کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا ہے۔ شاید کسی بوڑھے آدمی کے ایسے جوان جوش و خروش نے متاثر کیا ہو۔

ڈاکٹر اسلم پرویز مضمون پڑھنے جا رہے ہیں۔ سلام مچھلی شہری کا ان سے کر بیٹھے ہیں، بیماری سے اٹھے ہیں۔ سدا بہار چہرہ مضمحل ہو گیا ہے۔ بدن کی تانت ڈھیلی ہو گئی ہے، لیکن سوچتی ہوئی ان میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ آج بھی زندہ ہے۔ ایک وہ ان کا ... نصف صدی ہونے کو آئی ہے کہ اردو شاعری کا ایوان سلام کے کلام سے گونج رہا ہے۔ وہ کون سا شعری تجربہ ہے جو ان کے قلم کی زد سے محفوظ رہ سکا ہے۔ اور سلام نے تجربے کے شوق میں تجربہ نہیں کیا ہے۔ یعنی سر کے بل نہیں کھڑے ہوئے ہیں بلکہ تجربہ ان کی شعری شخصیت کی زرخیز مٹی سے پودے کی طرح پھوٹا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے گنے چنے ہم عصروں کی طرح صاحب طرز بھی ہیں اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر اچھی شاعری ہی نہیں، بڑی شاعری بھی کسی جاتی ہے۔ اور اس سے اہم بات یہ کہ وہ آج تک لکھ رہے ہیں۔ ان کا قلم سوکھا نہیں کیسی ہی کڑی دھوپ ہو، ان کا قلم نم رہا، چلتا رہا۔ اضافے کرتا رہا سلام کی بدنصیبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت کی طرح، اپنے آرٹ کو وہ سنجیدگی نہ دی جس کا وہ مستحق تھا۔ کاش سلام کسی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہوتے تو کتنے ہی ریسرچ اسکالر ان پر مضامین لکھ کر لیکچرر ہو چکے ہوتے۔ اور اپنے قلم کے لٹھ سونت کر ان کی عظمت منوا لیتے۔ خیر سلام صاحب کم از کم یہ تو ہوا کہ آپ پدم شری ہو گئے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ نوجوان ہیں اسلئے غصہ ان کی جاگیر ہے مضمون لکھا بھی غصے میں ہے اور پڑھ بھی غصے میں رہے ہیں۔ میں ان کا مضمون بھی سن رہا ہوں اور ان کے ساتھی ضمیر حسن کو تلاش بھی کر رہا ہوں ضمیر حسن کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ مضمون پڑھنا چاہئے تھا۔ بحث میں حصہ لینا چاہئے تھا۔ انھوں نے کئی خوبصورت افسانے لکھے ہیں اور میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے استاد فضل حق سے پوچھنے گیا ہوں۔ اور فضل حق نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ضمیر حسن کو دعوت نامہ بھیجا گیا ہے۔

ڈائس پر ڈاکٹر نارنگ پھر آ گئے ہیں۔ صدیق الرحمٰن قدوائی کے مقالے پر اعتراضات کر رہے ہیں۔ لہجے سے ذاتی رنجش کا بخار اٹھ رہا ہے۔ عقب کی قطاروں میں بے چینی پھیل رہی ہے درمیانی قطاروں سے بھی آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ ان میں نیاز حیدر کی آواز اپنی پیرانہ سالی کے باوجود سب سے جوان اور تندرست ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ پیر خاموش کیوں ہے۔ قمر خاموش کیوں ہے یہ ڈاکٹر نارنگ کی نہیں، ہمارے

پریسیڈیم کی توہین ہے۔ یہ پہلا سیمینار تھا جس میں میری شرکت برائے نام تھی۔ مجھے بہت سی باتیں کہنا تھیں لیکن وہ باتیں اپنے طور پر سجاد ظہیر، عابد سہیل اور انور عظیم کہہ چکے تھے۔ اور میں اپنی آواز سننے کے شوق میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔ جو لوگ ہر سیمینار کے ہر مقالے پر بحث میں اپنی موجودگی کا ڈھول پیٹتے ڈائس پر بڑبڑ بولتے ہیں میرے نزدیک وہ ذہنی مریض ہوتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ میلے کے ہر خوانچہ فروش کی دکان پر پتے چاٹنے والے امیر نہیں چٹورے ہوتے ہیں۔ اپنی آواز سننے کی چاٹ بھی ایک طرح کا چٹوراپن ہے۔

میری ناگواری کا ایک اور بھی سبب ہے۔ آج سے کئی سال قبل علی گڑھ میں ایک سیمینار ہوا تھا۔ وہی سیمینار جس میں جدیدیت تولد ہوئی تھی۔ علی گڑھ کا وہ سیمینار اس لئے اور صرف اس لئے اولیت کا مستحق ہے کہ اسی سیمینار میں یہ طرح پڑی تھی کہ جو شخص ہمارے یعنی منتظمین سیمینار کے نقطہ نظر کے خلاف تقریر کرے گا اسے سننے نہیں دیا جائے گا، اسے بولنے نہیں دیا جائے گا مثلاً پروفیسر گوڈن واتسائن اور دیوراج کی تقریر پر ایک گروپ باتیں کرنے لگا، ہنسنے لگا، قہقہے لگانے لگا۔ ڈاکٹر دیویندر اسر کی تقریر پر سوال و جواب ہونے لگے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی تقریر پر لقمے دیئے جانے لگے۔ ایسا اس لئے ممکن ہو سکا کہ ہم کو سرور صاحب کی کونیرشپ کی سلامت روی اور میانہ روی سے اس کا اندیشہ نہ تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم کو گمان تھا کہ سرور صاحب سیمینار کے مضمون میں سیمینار کا انعقاد کر رہے ہیں۔ اور سیمینار ہوتا ہی اسی لئے ہے کہ مختلف نقاط نظر کے لوگ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ علمی غور و فکر کے بعد کسی ایک مثبت اور فعال نتیجے پر پہنچیں۔ لیکن ہوا یہ کہ سیمینار سیمینار کے مضمون کی نفی پر اصرار کرنے لگا۔ اور جو ہم سوتے میں پکڑے گئے تھے متحیر تھے۔ یہ عمل دوسرے مقامات پر دوہرایا گیا اور پھر رد عمل ہوا۔ جو ہمیشہ عمل کے مقابلہ میں شدید ہوا کرتا ہے۔ میں ہال کا ہنگامہ دیکھ رہا ہوں اور کئی سال قبل اسی دہلی میں ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کا تماشہ کر رہا ہوں۔ سجاد ظہیر صدر ہیں۔ احتشام صاحب تقریر کر چکے ہیں۔ میں ڈائس پر جاتا ہوں۔ سخت الفاظ اور کڑوے لہجے میں بنیادی اعتراضات کرتا ہوں۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری کو پرچہ لکھ کر ڈائس پر بلاتے ہیں۔ سردار جعفری جو اس وقت تقریر کے موڈ میں نہیں تھے بولنے کھڑے ہوتے ہیں۔ سردار جتنے بڑے شاعر اور نقاد ہیں اس سے بڑے خطیب ہیں۔ میں تو کس شمار میں ہوں اردو کے بڑے بڑے نام ان کی خطابت کی مار نہیں سہہ سکے۔ انھوں نے مجھے ادھیڑ کر پھینک دیا ہے۔ لیکن علم اور ادب کو ایک لمحے کے لئے فراموش نہیں کیا گیا۔ یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے کہ میں خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا جاتا۔ اور جب فکشن پر سیمینار ہوا اور اسی علی گڑھ کے اسی ہال میں وہی پرانی تکنیک دوہرانے کی کوشش کی گئی تو ناکام بنا دیا گیا۔ اس لئے کہ فکشن کے سیمینار میں ہم جاگ رہے تھے اور ہوشیار تھے۔ یعنی جب جوگندر پال، شمس الرحمان فاروقی کا جواب دینے کھڑے ہوئے تو شمس الرحمان فاروقی نے بڑے تحکم سے انھیں بیٹھ جانے کو کہا اور وہ مذبذب نظر آنے لگے۔ اسی وقت میں کھڑا ہوا۔ میں نے سرور صاحب سے کہا کہ جوگندر پال بھی ہمارے مہمان ہیں اور یہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور جو کچھ یہ کہیں گے ہمیں سننا پڑے گا اور سرور صاحب نے شمس الرحمان فاروقی کو بیٹھ جانے اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور جوگندر پال سے گزارش کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ ڈاکٹر نارنگ نے مائک چھوڑا ہی تھا کہ دیویندر اسّر اٹھے اور تلخ اور گرم لہجے میں منتظمین سے اس حادثے پر شکایت کی۔ یہ تو ٹھیک تھا، لیکن میں نہیں جانتا کہ اگر دیویندر اسّر علی گڑھ کے اس سیمینار میں ہوتے جس نے ادبی آمریت کی روایت کی بنا ڈالی تھی تو ان کا رویہ کیا ہوتا۔ تاہم میں ڈائس پر گیا، اور اس سے گزارش کی کہ پریسیڈیم کی حرمت کا تقاضہ ہے کہ ڈائس پر آنے والے کا احترام کیا جائے۔ مائک پر آنے والے ہر شخص کو جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے کہنے دیا جائے اور یقین کیا جائے کہ ہم ایک ایک بات کا بہتر باتوں سے جواب دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

جلسے کے بعد نیاز حیدر نے اپنے مخصوص بیقرار لہ

شکایت کی کہ میں نے زبان بندی کی پابندی لگا کر ان کی توہین کی ہے میں ہنستا رہا وہ مجھے ڈانٹتے رہے۔ ایک بار ہوش آیا تو پتہ چلا کر ہال میں بہت کم روشنیاں چھنے رات کھڑی ہے۔ رات ان خوابوں کو جنم دیتی ہے جو ہمیں زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ساڑھے سات نکا رہے تھے اور عابد سہیل صدارتی تقریر کر رہے تھے۔ جلسہ ختم ہوا۔ ۹ بجے صبح سے رات کے ساڑھے سات بجے تک یکساں مصروفیت۔ ہڈیوں کو تھکا ڈالنے والی مصروفیت کے باوجود ہم لوگ شاداب رہے۔ معلوم نہیں کیوں۔ شاید ذہنی شادمانی جسمانی تھکن کو جھاڑ دیتی ہے۔ باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ ڈیفنس کالونی میں مظفر امام کے فلیٹ پر ہم لوگوں کا کھانا ہے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں تھوڑی سی مزید کرسیاں ڈال دی گئیں اور مہمانوں کے ساتھ چند میزبان بیٹھ گئے۔ شہاب جعفری کی پوری شخصیت پر سیمابیت طاری تھی۔ شہاب کی شخصیت پر ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب میں مضمون لکھ چکے ہیں اس لئے میں اپنے قلم کو ایک لذت سے محروم کئے لیتا ہوں۔ ویسے اگر آپ نے شہاب کا یہ شعر نہیں سنا تو سن لیجئے ؎

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

شہاب کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کو ایسا شعر نصیب ہوا ہو شراب نے شہاب کو بھی بڑی مقدار میں پی لیا ہے۔ شاید یہ انکی بیگم کا نصیبہ اور سلیقہ ہے کہ بچا کھچا شہاب کسوت مینا میں پڑا رہ گیا ہے۔ شراب نے اردو کو جن سنگھ سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ کیسے کیسے قدآور فن کار اس کے آبگینوں میں ڈوب کر رہ گئے۔

کسی نے بوتل کی کاگ اڑائی ہے۔ اور اس کی آواز نے حال کے شیشے توڑ دیئے ہیں اور ان کے ٹکڑوں پر کیسے کیسے مناظر چمک اٹھے ہیں۔ مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد نے ایک کانفرنس کا اہتمام کیا ہے۔ میں شرکت کرنے اورنگ آباد جا رہا ہوں گاڑی پل سے گزر رہی ہے۔ نیچے چوڑے چکلے کناروں سے دور چاندی کی سانپ کی طرح سوکھا ہوا چنبل پڑا ہے۔ دریائے چنبل۔

.... جس کے چور اتاروں نے شاہجہانی جبروت و جلال کی بنیادوں میں سرنگیں بچھا دیں۔ اور جس کے ایک دھماکے نے دارائی منصوبوں کے دھوئیں اڑا دیئے۔ چنبل کے خنیہ گھاٹوں سے اگر گھاٹ نکی ہوتی تو اس کے پانیوں میں عالم گیری عزائم کی تحریریں بن جاتیں۔ ہندوستان کا سب سے بڑا باغی دریا۔ قرون وسطیٰ سے آج تک شاید ہی کسی ایک دریا سے حکومت وقت کے خلاف اتنی سازشیں بنی ہوں۔ اتنی بغاوتیں برپا کی ہوں۔ ریتیلے کنکریلے اوبڑ کھابڑ میدان، کانٹے دار درختوں کے گھنے جنگل جن کے سیاہ سایوں میں بھری دوپہریں منہ چھپائے سوتی رہتی ہیں۔ میلوں میں پھیلی ہوئی زمین دوز گھاٹیاں جو رگھاٹیوں کی قدرتی بھول بھلیاں لشکروں کے لشکر نگل جانے والی گھائیں۔ کوسوں پھیلی ہوئی بھاری چکردار چٹانوں کی ایسی ایسی پناہ گاہیں کہ ایک ایک سپاہی پورے پورے توپ خانے بچھا کر ڈال دے۔ یہ چنبل ہی کا فیض تھا کہ مان سنگھ ڈاکو مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ پورے سات برس تک تین تین صوبوں کی جدید ترین پولیس فورس سے ٹکراتا رہا۔ رات ہوگئی۔ قریب و بعید کی تاریخ کے قافلے آنکھوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔ یہ روز رات کیوں ہو جاتی ہے۔ رات بھی ایسی کہ ابھی آسودہ بھی نہ ہو سکے تھے کہ صبح نازل ہوگئی۔ شاید کبھی انسان زمین کی گردش کو بھی اپنے قبضۂ قدرت میں گھسیٹ لے اور رات دن کا یہ چکر ہی ختم ہو جائے۔ گاڑی جھانسی کے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں ویٹنگ روم میں شیو کر رہا تھا اور پلیٹ فارم پر ریشمی کوٹوں کا انبار لگا تھا۔ کیسے کیسے حسین کوٹ! اور قیمت؟ ... ان کے استر کی قیمت سے بھی کم۔ ان کوٹوں نے لاکھوں آدمیوں کو سردی کی شدت سے تو بچا ہی لیا، ایک کام اور بھی کیا۔ یعنی لندن اور پیرس کے سلے کپڑے پہن کر گردوں میں جو ترچھا پن پیدا ہو گیا تھا، وہ ختم ہو گیا، اور خارش کوٹ کی ریاستی امارت کی نہیں غربت کی دلیل بن گئی۔ اورنگ آباد جانے والی گاڑی میں بیٹھا تو زندگی میں پہلی بار کالی مٹی سے ملاقات ہوئی اس مٹی نے تو میٹھا لے رنگ کے معنی ہی اٹھا دیئے۔ دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے آدمی سر اور کمر پہ کپڑے بیٹھے رن جیسے بیگوں۔

والے چھوٹے چھوٹے بیلوں کے پیچھے رینگ رہے تھے۔ دور دور پر آباد چھوٹے چھوٹے گاؤں، مٹی اور چٹائی کے چھوٹے چھوٹے مفلس مکان، دروازوں پر سر گھٹنے جانور مکینوں کی غربت کا اشتہار بنے کھڑے تھے۔ شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی یکساں غریبی۔ حد نگاہ تک نہ کوئی ژرخیز، نہ شاداب ٹیلے، نہ بل کھاتے دریا، نہ لہراتی نہریں، نہ خاموش اور مہذب تالاب۔ سب کچھ سوکھا ہوا، جلا ہوا۔ ایک ایک قطرہ جیسے خشک سالی نے چوس لیا۔ نچوڑ لیا۔ دولت آباد بھوت بنگلہ سا لگ رہا۔ میں تو دولت آباد کو اورنگ آباد کے آگے سمجھ رہا تھا۔ دولت آباد پہونچتے ہی جیسے تخیل پر تولنے لگا، میں نے تھکے ہوئے شکاری کی طرح "باز" کو چشم پوش پہنا دیا۔ دو دن بعد یہ موقع ملا تھا کہ مناڈ سے اورنگ آباد تک پورے ڈبے میں تن تنہا سفر کر رہا تھا، اترنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کیوں نہ حیدرآباد چلا جاؤں۔ ایک کالے کوٹ سے مخاطب ہوا

"یہ گاڑی حیدرآباد کب پہونچے گی۔؟"

"حیدرآباد؟"

"جی ہاں!"

"کل صبح اسی وقت۔"

اور میں سہم گیا میرا خیال تھا کہ اورنگ آباد سے حیدرآباد بہت دور ہوگا تو سو پچاس میل ہوگا۔ آخر ایک ہی ریاست میں تھے تو دونوں شہر۔ گاڑی رینگنے لگی۔ اور میں کسی طرح اتر سکا۔ ارادہ یہ کر رہا تھا۔ جی چاہا کہ پہلے جوگندر پال کے گھر جاؤں پھر یونیورسٹی کے مہمان خانے پہونچوں۔ لیکن جوگندر پال کا خط مل رہا تھا اپنی ڈائری پورا بیگ وغیرہ ڈالا۔ گیسٹ کیپر سمجھ رہا تھا کہ میں ٹکٹ ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اس لئے خوش تھا اور میں اس کی غلط فہمی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بہرحال ہم دونوں خوش تھے باہر نکل کر ایک اسکوٹر رکشا والے سے گزارش کی کہ پورے شہر کا چکر لگا کر مجھے یونیورسٹی پہونچا دے۔ پورے شہر پر تاریخ کی سنگین مہریں لگی ہیں۔ جگہ جگہ گزرے ہوئے قافلوں کی ٹوٹی ہوئی طنابیں اور بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر پڑے دیکھا۔ ایک بلند و بالا دروازے سے گزرا تو محسوس ہوا کہ جیسے عظمت یا رفعت کی پرچھائیں منجمد ہو گئی ہو۔ بی بی کے مقبرے کے قریب سے گزرا تو جی چاہا کہ اتر پڑوں لیکن سوٹ کیس اور بستر بند شوق کو کچلے دے رہا تھا۔ گیسٹ ہاؤس پہونچا تو معلوم ہوا کہ میرے لئے دوسری منزل پر ڈبل روم ریزرو کیا گیا ہے۔ اور میں سنگل روم لینے پر مصر تھا کہ معلوم نہیں کس کو ٹھہرانا پڑے۔ ملازم حکم کے تابعدار۔ آخر ایک استاد تشریف لائے انھوں نے چھوٹتے ہی سوال کیا کہ بیگم صاحبہ کہاں ہیں اور میں نے تڑسے جواب دیا کہ یہ میرا خانگی معاملہ ہے۔ آخر مجھے ایک سنگل روم میں پہونچا دیا گیا۔ جو مہمان ٹھہرے ہوئے تھے وہ ترکاری خور تھے۔ اور علی گڑھ اور اردو اور قاضی نے ملازمین کو میری گوشت خوری کا یقین دلا دیا تھا۔ اور وہ انتظام کر رہے تھے اور دم بدم کھانا تیار ہونے کی اطلاع ہم پہونچا رہے تھے۔ گویا کھانا نہیں نکلنے والا ہے بلکہ کہیں قریب میں عالمگیر اترا ہوا ہے اور سراپردۂ خاص سے برآمد ہونے والا ہے۔ اور لشکر کو خبردار کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک بند دروازے کو کھولا تو بی بی کا مقبرہ جگمگا اٹھا اور بالکل قریب معلوم ہوا۔ جی چاہا کہ جب تک کھانا آ رہا ہے ایک چکر لگا آؤں۔ اور جب دوسرے دن دیکھنے گیا تو معلوم ہوا کہ گیسٹ ہاؤس سے فاصلہ ڈیڑھ دو میل ہے۔ قریب سے وہ تاثر برقرار نہ رہا جو دور سے دیکھنے پر قائم ہوا تھا۔ مغل شہزادے کو اپنی ماں کی یادگار کے لئے بھی اتنا سنگ مرمر میسر نہ آیا کہ پوری عمارت مرمریں ہو جاتی۔ پتھر تو پتھر ہے، اس عمارت بھر کی چاندی بھی [illegible] جاتی اگر زہرِ عالمگیری کا خوف نہ ہوتا۔

کھانا کھا کر لیٹا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ پھر دوسرے صاحب آداب مہمان نوازی برتنے آئے اور پھر جوگندر پال آ گئے۔ جوگندر پال سے پہلی ملاقات علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ نکشتیہ پر سمینار ہونے والا تھا۔ میں اسٹاف کلب کی خوبصورت شاندار عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ اسٹاف کلب کی عمارت پر چھت کے بجائے سیمنٹ کی بڑی بڑی تین کتابیں کھلی رکھی ہیں۔ جو تینوں ترلوک علم روایت اور تجربے کی علامت ہیں۔ میں اشوک کے سرسبز شاداب اور سدابہار ستونوں کے نیچے سے گزر رہا ہوں۔ پورے ہال میں

یہاں سے وہاں تک ایک قالین بچھا ہوا ہے۔ وہ رگذرتی ہوئی شام کی گلابی روشنی میں کچھ لوگ چائے پی رہے تھے۔ ٹینس کورٹ میں ایک سفید پتلون ٹہل رہی ہے۔ برج روم سے ایک قہقہہ آکر لگا ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ مکانوں کے تینوں کمرے سامنے ہیں۔ میں ایک کمرے کے نیلے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتا ہوں۔ دروازہ کھلتا ہے۔ سانولے رنگ کا بھاری بھرکم آدمی دروازے میں تصویر کی طرح لگا کھڑا ہے۔

"آپ جوگیندر پال ہیں؟"

"جی ہاں ... تشریف لایئے۔"

"میں کون ہوں؟"

سوئی سوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اور خاموشی اپنے آپ سے گذر جاتی ہے۔

"قاضی عبدالستار کے سوا کون مجھ سے اس طرح سوال کر سکتا ہے۔"

اور اس گداز جسم کا لمس میرے پورے وجود پر چھا گیا۔ گداز جسم عورت کا ہو یا مرد کا لمس کی لذت میں نشہ گھول دیتا ہے۔ ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا، کبھی ایک دوسرے کو خط نہیں لکھا تھا، لیکن ملے تو اس طرح جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ان کی اصل باتیں اس طرح پوری رفتار سے شروع ہوئیں جیسے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا جائے۔ پھر میں قطع کلام کرکے اٹھتا ہوں۔ کینٹین کے انچارج چاند خاں ۔۔۔ کو چائے کا آرڈر دیتا ہوں اور پھر باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ پال کے ی العفیر کو اپنی کے لفظوں سے زیادہ جھکے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں کے نیچے سوئی سوئی آنکھیں زیادہ واضح کرتی ہیں۔ وہ گفتگو "شب گزیدہ" اور "دارا شکوہ" کے دائرے میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں اور میں "رسائی" اور "بازیافت" کے راستے پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اور اس چھیڑ چھاڑ بازی میں افسانہ، ناول اور شاعری سب سمٹ آئے ہیں۔ پھر بہار سے ریسرچ اسکالر ہارون ایوب آجاتے ہیں۔ ان کے ساتھ حسن احمد نظامی ہیں اور خبر لاتے ہیں کہ بلراج مینرا

سریندر پرکاش اور شروان کمار ورما آگئے ہیں۔ پہلے بلراج کا پرجوش قہقہہ پائلٹ کی طرح کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد بلراج۔ میانہ قد، اکہرا جسم، سانولا رنگ۔ کشیدہ خطوط، قمیص کی طرح کرتے پر پتلون پہنے آئے اور گرم جوشی سے گلے لگ گئے۔ جسم کی کوئی ایک چیز کبھی کبھی پوری شخصیت پر حاوی ہو جاتی ہے۔ بلراج مینرا کے بال ان کے وجود پر چھا گئے ہیں۔ لیکن ان کے ترشے ہوئے بال دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔

"تمہارے بال دیکھ کر مجھے سیمسن کے بالوں کا خیال آتا ہے۔ یہ تم نے بال کیوں کٹوا ڈالے۔"

"قاضی صاحب ..... بہت بڑے ہو گئے تھے ... نا۔"

اور بیٹھتے ہی بلراج نے باتوں پر قبضہ کر لیا۔ مجسم کیا ہوا علم، پرجوش اور دردمند ذہانت، تیز اور گہری آواز نے مل جل کر ساری سماعت کو فتح کر لیا۔ جس نے بلراج کو عالم سرخوشی میں بولتے سنا ہے اس کے لئے ان کی کہانیوں سے متاثر ہونا دشوار ہے اس لئے کہ پھر کہانیوں سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اور

"قاضی صاحب .. دیکھئے! ابھی گرم پانی آرہا ہے ... آپ تکلف نہ کیجئے نہا ڈالئے .... تھکن اتر جائے گی۔"

جوگیندر پال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے ملازم کو رشوت دے کر گرم پانی کی بالٹیاں واپس کیں۔ اور کاہلی پر آرام کا گمان کئے لیٹا رہا۔ پھر دستک ہوئی وائس چانسلر کے پی۔ اے تشریف لائے۔ ان کے جانے کے بعد ریسپشن کمیٹی کے دو ممبران کا ورود مسعود ہوا، کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہے اور مجھے اس پرسش پیہم کے علاوہ کوئی تکلیف نہ تھی۔ آنے جانے کا یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا۔ جب تک میں پال کے ساتھ ان کے گھر نہ چلا گیا۔ پال کی طرح بیگم پال بھی زندہ دل خوب اور خوش اخلاق ہیں۔ ادیبوں میں جسمانی اور ذہنی مناسبت رکھنے والے جوڑے کم ملیں گے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دیر تک خود فراموش ہوتے رہے۔ کئی روز کے سفر اور تکان نے چور چور کر دیا تھا۔ بستر پر پہونچتے ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور ساتھ ہی گیلری

میں ہوتے گرجتے اور قہقہے دہنے لگے۔ باقر مہدی دستک دے رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ پھر ترقی پسندی کا ذکر نکلا اور فقروں کے خنجر چلنے لگے۔ لیکن ابھی خنجروں پر شیریں لہجوں کے غلاف چڑھے تھے۔ ہماری دوستی کی عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ یعنی دوستی بوڑھی ہو چکی تھی اس پر اختلاج قلب کا حملہ اس وقت ہوا جب بمبئی میں پروفیسر اختر اورینوی سے بدسلوکی ہوئی اور میں نے بقول ڈاکٹر محمد حسن کے "آہنگ" میں ایک سچا سچا خط شائع کرا دیا۔ دوسرا دورہ علی گڑھ میں پڑا۔ جب باقر مہدی علی گڑھ آئے تھے اور بات بات پر بکھرے جا رہے تھے اور میں سمیٹ سمیٹ کر انھیں کندھوں پر لاد رہا تھا یعنی ہم دونوں جانتے تھے کہ ہماری دوستی ایک کچے دھاگے سے بندھی ہوئی ہے۔ میں زیادہ اور باقر مہدی کم۔ اس لئے کہ باقر مہدی کو یقین تھا کہ اسی کی طرح اس بار بھی میں سنبھال لوں گا۔ لیکن اب میرے شانے دکھنے لگے تھے اور میں یہ بار گراں جھٹک دینے پر رضامند ہو چکا تھا۔ رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ہوئی۔ ہماری دوستی نے خوش خوش سیر ہو کر ناشتہ کیا گیسٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے کہ کسی بات پر الجھے اور بیس برس کی دوستی دو جملوں میں ختم ہو گئی۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے درد سے نجات پا گیا ہو۔ اور دل پر کچھ اس طرح گزر گئی جیسے کوئی عزیز شے کھو گئی ہو۔ لیکن اب اتنا دماغ کہاں تھا کہ میں اس متاع عزیز کو ڈھونڈتا پھرتا۔ شانے جھٹک کر سیمینار کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے سوار ہو گیا۔

جدید طرز کی عمارت کے فرسٹ فلور کے مستطیل ہال کی لانبی دیوار کے سامنے میزوں کی سیدھی قطار کے پیچھے صدر کے داہنے بائیں مہمان ادیب بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے زرد گلدستے رکھے تھے۔ ہال بھر رہا تھا کہ ڈاکٹر رفیق ذکریا تشریف لائے۔ مہمانوں کا تعارف ہوا۔ پھر وزیر موصوف نے افتتاحی خطبہ دیا جس سے معلوم ہوا کہ سارا علاقہ بھیانک خشک سالی میں مبتلا ہے۔ رام لال میرے پاس بیٹھے تھے گلے میں سخت تکلیف تھی، بولنے سے معذور تھے۔ لفظوں کے بجائے لفظوں کے ہیولے نکل رہے تھے۔ اور میں ان کو چھیڑ رہا تھا۔ ان کے کان میں منھ رکھ کر ان کو برا بھلا کہتا اور وہ گونگا اتار کے بہت غصے سے مجھے گھورتے۔ آخر مجبور ہو کر ایک پرچہ لکھا کہ جب اچھا ہو جاؤں گا تب تم سے نپٹوں گا۔ لیکن وہ اس عالم میں میرے ہاتھ لگ گئے تھے کہ میں کسی طرح انھیں بخشنے پر رضامند نہ تھا۔ اور انھیں مسلسل تنگ کرتا رہا۔ لنچ کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ مراٹھی ادب پر مقالے پڑھے گئے۔ گیسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بشر نواز سے ملاقات ہوئی۔ دبلے بدن اور پتلے چہرے والے بشر نواز کچھ کھوئے ہوئے کچھ سوئے ہوئے سے نظر آئے۔ سفید کرتے پائجامے پر جواہر کٹ پہنے بڑی محبت سے گفتگو کر رہے تھے۔ اور میرے حافظے میں ان کے اشعار گنگنا رہے تھے۔ وہیں قاضی سلیم سے ملاقات ہوئی۔ اکہرا جسم کشیدہ قامتی کی وجہ سے دبلا معلوم ہو رہا تھا۔ ڈھیلا [illegible] اور چھوٹی مہری والے کھدر کے بے داغ کرتے پائجامے پر [illegible] رنگ کی جواہر کٹ پہنے سگریٹ پی رہے تھے۔ ہر کش پر رخساروں کی شکنیں دوہری اور گہری ہو جاتیں۔ بڑے بڑے بال، گھنی سیاہ مونچھیں۔ بڑی بڑی مخلص آنکھیں۔ اور سب سے عجیب بات یہ کہ اس عمر کے باوجود چہرے پر ایک لڑکپن سا چمکتا تھا۔ مگر اداس تھے۔ شاید دوپہر کا واقعہ ان کے چہرے پر زندہ تھا۔ ہوا یہ کہ صبح [illegible] کے اجلاس سے پہلے سے ان کو [illegible] اور باقر مہدی نے اس گم شدگی میں چھپے ہوئے خود [illegible] کے معانی پڑھ لیے اور پھر ایسی چار چوٹ کی لڑائی لڑی [illegible] توبہ۔

ڈائننگ روم مہمانوں اور میزبانوں سے چھلک رہا تھا، اور پورے ہال میں مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ناتو صاحب چمک رہے تھے۔ متواضع، مہذب، خلیق اور ڈائننگ۔ جس کی پلیٹ خالی دیکھتے اسے ڈونگا پیش کرتے، وہ تکلف کرتا تو اصرار کرتے۔ وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نہیں ایک میزبان اور مہمان نواز پروفیسر معلوم ہو رہے تھے۔ ڈنر کے بعد ہم لوگوں نے جلدی جلدی کافی ختم کی کہ "شب افسانہ" کا وقت ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی تو شہر سے دور تیرتی ہوئی سڑکوں کے دونوں طرف اس طرح آباد ہے جیسے ٹیلوں کو ہموار کر کے ڈھلی دھلائی عمارتیں رکھ دی گئی ہوں۔ شہر سے نزدیک پولیس کلب کے ہال میں شب افسانہ کا اہتمام تھا۔ ہم لوگ وقت پر پہنچ

گئے۔ تھوڑے سے لوگ موجود تھے۔ تقریباً تمام ہال خالی تھا جو آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ سرخ رنگی ہوئی لوہے کی معمولی کرسیاں خاصی تکلیف دہ تھیں۔ شرفائے اودھ کے انداز میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ پال نے ان کا تعارف کرایا۔ ان کے پان کھا کر لکھنؤ کی گلوریاں یاد آگئیں۔ ہال بھرنے لگا تھا کہ ناتھ صاحب (وائس چانسلر) آ گئے۔ بھاری بدن پر چست سلیقے شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے آئے اور ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گئے۔ پھر ہم لوگ ڈائس پر بلائے گئے۔ ڈائس پر بیٹھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ان تکلیف دہ کرسیوں سے نجات مل گئی۔ کملیشور .... ہندی کے مشہور افسانہ نگار میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اوسط قد، شیام رنگ، دوہرا بدن، نمایاں اور شریف آنکھیں، کریم کلر کی بش شرٹ کے بند کوٹ جیسے کالر کا بٹن لگائے انتہائی مہذب انداز میں بیٹھے تھے۔ میرے داہنے ہاتھ پر رام لال تھے۔ ہم لوگوں کی کرسیاں نیم دائرہ بنائے ہوئے تھیں۔ جوگندر پال میرے سامنے تھے۔ پھر افسانہ خوانی شروع ہوئی۔ عجیب تجربہ ہوا۔ مراٹھی ادب کے مشہور فن کار مائک پر آتے اور چالیس چالیس منٹ تک منھ زبانی بے تکان کہانی سناتے رہتے جو صرف ان کے حافظے میں محفوظ ہوتی۔ میں ہال کو دیکھ رہا تھا سامعین میں اردو جاننے والوں کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ سارے سامعین مراٹھی کے تھے۔ یا شاید کچھ ہندی کے بھی ہوں۔

پُرسکون شائستہ اور زندہ مجمع آدھی رات تک اسی طرح جمع ہوا تھا۔ رام لال کے علاوہ ڈائس پر موجود تمام فن کاروں نے اپنی کہانیاں سنائیں۔ رام لال بولنے سے معذور تھے اس لئے خاموش بیٹھے رہے۔ گیسٹ ہاؤس آیا۔ کپڑے ٹانگنے کے لئے الماری کھولی تو بیئر کی بوتل لیٹی ہوئی تھی۔ سوچتا رہا کہ یہ محترمہ کہاں سے نازل ہوگئیں۔ میں نے انھیں اسی طرح سونے دیا اور اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ بہت مہذب سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو بلّو بیدل کھڑے تھے جو آئے تھے کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لیکن چلے گئے تھے "ابھنتا" دیکھنے۔ چست قمیص اور بہت چست پتلون پر اس سے زیادہ چست خوب چوڑا کالا پیٹی باندھے ہوئے جس کے دونوں طرف پیٹ اُبھر آیا تھا۔ بھرے بھرے نوجوان چہرے پر ترشے ہوئے سائڈ لاکس۔ پالش کئے ہوئے لہجے میں بولے۔

"اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ تشریف لے چلیں تو بڑی عنایت ہوگی۔"

تھکن میرے جگر کے جگر تک اتر چکی تھی۔ لیکن انکار کی ہمت نہ ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوا تو رام لال مہاتماؤں کے پوز میں بیٹھے تھے۔ بلّو بیدل نے بڑی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہوئے تو دانتوں میں بوتل دبا کر کاگ اُڑا دی۔ "کرر" کی آواز آئی (جو آج بھی ان کے خیال کے ساتھ آجاتی ہے) میں نے حلوے سے اپنے منھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے تمام دانت سلامت تھے۔ اور اس سے زیادہ خوشی یہ ہوئی کہ بلّو بیدل کے بھی دانت سلامت تھے۔ اور وہ باتیں کر رہے تھے۔ بہت دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ ہر چند کہ وہ پہلے ہی بہت پی چکے تھے اور ڈھیروں پی رہے تھے لیکن معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کافی پی رہے ہوں۔ آواز، الفاظ سب کچھ نارمل، سب کچھ فطری۔ جب نیند اور تھکن میری آواز سے ٹپکنے لگی تب میں نے اجازت لی اور اپنے خاموش کمرے کے تابوت میں لیٹ رہا۔

دوسرے دن کا پہلا اجلاس گوارا کر لنچ کے بعد دوسرے اجلاس کی شرکت کے لئے جوگندر پال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ ایک صاحب نے ایک شاعر کو سنبھال کر اگلی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر گاڑی چلتے ہی شاعر صاحب کے منھ سے الفاظ نکل رہے تھے لیکن اس طرح جیسے اناڑی کوزہ گر کے چاک سے ٹیڑھے میڑھے کوزے نکلتے ہیں۔ وہ بہت دیر تک کچھ کہتے رہے یا کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور میں بہت دیر تک کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور جوگندر پال کے چہرے کے خطوط تلوار کی طرح کھنچے ہوئے تھے لیکن ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ آخر میں سمجھا یعنی وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میرے ناول اور افسانے ان کو بہت پسند ہیں۔ لیکن میں جو حیرت کا پوز دیتا رہتا تھا اس سے ان کو بہت دکھ پہونچتا ہے۔ اب ان کی باہیں میرے گلے میں حمائل تھیں اور ہال کے

پونیکہ میں گاڑی کھڑی تھی۔ اور طالب علموں کے ہجوم میں گھر چکی تھی اور مراٹھا یونی ورسٹی کے مرہٹہ طالب علم اُردو بیچاری اُردو کے ایک شاعر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ آخر جوگندر پال نے ڈانٹا۔

"جناب.... یہ آپ کا کون سا پوز ہے؟"

میں نے شاعر کی باہیں اپنے گلے سے نکالیں اور واپس آیا جوگندر پال مجھے لے کر "ہال" میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔ لسانی غیرت چمک اٹھی تھی۔ ہمت نہ ہوئی کہ اُردو کے ایک شاعر کو، اُردو کے ایک سینئر استاد کو نوخیز طالب علموں میں تماشہ بننے کو چھوڑ جاؤں۔ میں پھر واپس آیا۔ اب شاعر صاحب موٹر سے نکالے جا چکے تھے شور اِلگ کھڑا مسکرا مسکرا کر بیڑی پی رہا تھا۔ جوگندر پال کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ میں شاعر کو سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا مگر شاعر صاحب وہی رٹے جا رہے تھے۔

"قاضی صاحب .... میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔"

ہال کے دروازے پر والنٹیر طالب علموں کا ہجوم کھڑا تھا ہال کو دیکھ کر ہٹ گیا۔ لیکن اب شاعر صاحب پھیل گئے۔ ایک بازو میری گردن میں پہلے ہی حائل تھا اب دوسرا بھی لپٹ گیا۔ پہلے صرف جھاگ بھر رہا تھا اب آنسو بھی بہنے لگے۔ اور گوگلز کے نیچے چمکنے لگے مجھے ایک طرف لے جا کر بولے۔

"قاضی میرے ساتھ چلو ... کہیں بیٹھ کر پئیں۔ خوب سی پئیں۔ خوب سی باتیں کریں۔"

میں انہیں بہلاتا رہا۔ کہ جلسے کے بعد چلوں گا۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر خوب پیوں گا۔ اور تمہاری گردن میں باہیں ڈال کر اورنگ آباد کی سڑکوں پر نشے کی دہائی دیتا پھروں گا ــــ میرا یہ کہنا تھا کہ بھڑک گئے۔

"تم طنز کر رہے ہو...... میری محبت کا یہ جواب دے رہے ہو۔۔۔؟"

کیا ذی ہوش مدہوشی تھی!

اب جوگندر پال ان کی طرف لپکے۔ اور ساتھ ہی کئی طالب علم اس کے ساتھ بڑھے۔ ہال کے کھلے ہوئے دروازے سے جتنے چہرے ہمیں دیکھ سکتے تھے دیکھ رہے تھے۔ لڑکوں نے پال کے قریب آ کر زبان سے تو کہا،

"سر! وی مے ہیلپ یو؟"

لیکن تیور کہہ رہے تھے کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم ان کو لاد کر نیچے ڈال آئیں۔ اور پال نے جن کی عجیب حالت تھی، لڑکوں پر اپنا غصہ اُنڈیل دیا۔

"جانتے ہو..... یہ ہمارے مہمان ہیں؟"

لڑکوں کی قطار ہٹ گئی۔ ایک طرف سے بشر نواز لپکتے ہوئے آئے۔ اور معلوم نہیں کون سا منتر پڑھا کہ شاعر صاحب ایک دم ہوش میں آ گئے اور ان کا سہارا لے کر کسی طرف چلے گئے۔ اور تماشہ ختم ہو گیا۔ ہال میں کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اورنگ آباد سیمنار کا تیسرا اور آخری اجلاس یادگار اجلاس تھا۔ لسانی غیرت اور اپنے نصب العین کی حمیت کی سرشاری نے کبھی اس طرح بے قرار نہیں کیا تھا جس طرح میں اس سیمنار میں بے قرار ہوا اس سے قبل کسی ایسے سیمنار میں شریک نہ ہوا تھا جس میں دوسری زبانوں کے مانے ہوئے اہل قلم موجود ہوں۔ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے اجلاس میں صرف ہندی کے ادیبوں کا ہجوم تھا۔ لیکن وہاں لسانی کتری کا گزر ممکن نہ تھا کہ احتشام صاحب کی موجودگی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم تھا۔ ان کے علم کا منارۂ نور روشن تھا۔ ان کی زبان کی تلوار بے نیام اور بے امان تھی۔ اور ہم صرف موجود اور محفوظ ہونے پر رشک کرتے تھے لیکن اورنگ آباد میں کون تھا۔ جوگندر پال، رام لال قاضی سلیم، باقر مہدی، مغنی تبسم اور نعیم الدین۔ سب کے سب ہم عمر تھے اجلاس کا آغاز ہی لسانی غیرت کی تڑپ سے ہوا۔ ابھی ہال بھر رہا تھا کہ ایک شاعر صاحب داخلے کے دروازے کے سامنے شراب میں دھت کھڑے سرخوشی فرما رہے تھے اور اب ایک بد نصیب زبان کے ہم بد بخت ادیب ہال میں موجود غیر زبانوں کے ادیبوں کی نگاہوں کا نشانہ بنے بیٹھے تھے۔ جیسے گرگٹ بیویوں کی محفل

میں ملوث نہیں بیٹھی ہوں۔ کوئی صاحب ہندی ادب پر مقالہ پڑھ چکے تھے اور کملیشور جی صدارت کے علاوہ تقریر بھی کر رہے تھے۔ جب بات روہانی افسانے تک جا پہونچی تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔ خوش اخلاقی سے معذرت کی اور روانہ ہوگئے۔ مجھ پر غلط یا صحیح یہ تاثر ہوا کہ آج کل اُردو افسانہ یا ترقی پسند عہد کا اردو افسانہ بھی ان ہی لعنتوں میں مبتلا ہے۔ میں تلملا کر رہ جاتا۔ کہ رام لال نے چٹکی لی۔

"کاش میں بول سکتا..... تو جواب دیتا۔"

کملیشور جی کے بعد مجھے جانا ہی پڑا۔ اُردو افسانے کے تحفظ میں چھوٹی سی تقریر کی۔ تھوڑی دیر بعد مضمون پڑھنے کے لئے میرا نام پکارا گیا۔ میں سیاسی ادیب نہیں ہوں۔ ادب کا مفاد پرست سیاست داں بھی نہیں ہوں کہ جیسی محفل ہو ویسی بات کروں۔ تالیاں پٹواؤں اور چلا آؤں۔ میں ادب کو تجارت نہیں عبادت جانتا ہوں۔ مجھے حرارت تو وہیں آتی ہے جہاں نعرۂ اعدا کی آستینوں میں خنجر تڑپتے ہیں۔ علی گڑھ ہی میں معلوم ہو چکا تھا کہ اس سمینار میں اُردو کی حد تک کس نقطۂ نظر کے لوگ شریک ہو رہے ہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اورنگ آباد میں اگر کوئی ادبی سیاست ہے تو اس پر قاضی سلیم اپنی سیاسی اور معاشی وجاہت کی بنا پر حاوی ہیں اور قاضی سلیم ان شاعروں میں سے ایک ہیں جو ترقی پسندی کے نام سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ عالم یہ تھا کہ اُردو تنقید پر جو مضمون پڑھا گیا اس میں انیسویں صدی کے مغربی نقاد موجود تھے۔ ابھی ابھی انڈے توڑ کر باہر نکلنے والے نابالغ نقاد تک براجمان تھے لیکن احتشام حسین کا نام نہیں تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا نام نہیں تھا۔ پوری ترقی پسند تحریک کی تنقید غائب تھی اور باقر مہدی تک خاموش تھے۔ میں اس لئے چپ تھا کہ ابھی اسی سشن میں تقریر کر چکا تھا۔ اور معلوم تھا کہ مضمون کے بعد بھی ایک بار جانا پڑے گا۔ وہیں دیکھ لوں گا۔ میرے لئے ایک مصیبت یہ تھی کہ مضمون انگریزی میں لکھنا تھا۔ حالانکہ دوسرے مضامین اردو میں پڑھے گئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی نئی بات غیر زبان میں لکھنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ تمام باتیں وہی تھیں جو گذشتہ دس سال میں کہی۔ کسی انداز سے کہتا رہا ہوں۔ یعنی اُردو شہری زبان ہے۔ اس نے عوامی زبان نہ بن سکی۔ اُردو شعری زبان ہے اس لئے نثر میں خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی۔ مخصوص تاریخی سیاسی اور معاشی حالات کی بنا پر اردو بولنے والوں کا حلقہ تیزی سے سمٹ رہا ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں نئی نسل پیدا ہی نہیں ہوئی۔ آج کا افسانہ اُردو افسانے کے عہد زریں کے شاہکاروں کے سامنے معمولی ہے۔ مضمون کے بعد قاضی سلیم نے تقریر کی۔ نکات مضمون سے اختلاف کے بجائے مضمون کے ترقی پسند رویے سے اختلاف کیا کہ یہی آسان بھی تھا۔ اور مجھے اسی کی توقع بھی تھی۔ باقر مہدی خاموش رہے۔ مغنی تبسم نے شمس الرحمان فاروقی کے اس اعتراض کو دوہرانے پر اپنے آپ کو مجبور پایا جو شمس الرحمان فاروقی "شب خون" میں ایک بار کر چکے تھے اور میں "کتاب" میں جواب دے چکا تھا، اور جب علی گڑھ کے فکشن کے سیمینار میں انھوں نے یہ مسئلہ چھیڑا ہے تو رو برو مسکت جواب وصول کر چکے تھے اس لئے اس کا جواب غیر ضروری تھا۔ یعنی کیا افسانہ ادبی صنف سخن ہے؟ ان کے بعد ایک اور صاحب مائک پر تشریف لائے۔ دس منٹ تک ایک لمبا چوڑا لطیفہ سنایا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم لوگوں کو ترقی پسندوں سے محفوظ رہنا چاہیے گویا ترقی پسند ڈاکو ہیں اور اس اجلاس میں بڑے بڑے توند والے پونجی پت بیٹھے ہوں اور ان کا کوئی کارندہ موٹی موٹی تجوریوں کی حفاظت کی دہائی دے رہا ہو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی کی جوتے کی نوک کے برابر نہیں ہیں۔ رام لال بولنے سے معذور تھے۔ جوگندر پال مصلحت اور سکوت کے عاشق۔ لیکن باقر مہدی تھے، قاضی سلیم تھے، مغنی تبسم تھے، بشر نواز تھے۔ سب خاموش تھے۔ گویا سکوت کی نیم رضامندی سے نفس تقریر کی تائید کر چکے ہوں۔ اس وقت ہندی کے ایک مشہور افسانہ نگار اور ایک اہم جریدے کے مدیر کملیشور کھڑے ہوئے اور اردو کے ایک بڑے افسانہ نگار کو جو اس محفل میں موجود نہیں تھا۔ اردو زبان، اُردو کلچر اور اُردو تہذیب کے ایک فرزند ارجمند انم فاروقی کی ہذیان گوئی سے محفوظ رکھنے کیلئے

آواز بلند کی۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کے لئے یہ بات یقیناً فخر کا موجب ہی ہوگی۔ کلکیشور کے بعد جب میں اُٹھنے لگا تو ایک دوست نے محبت سے مشورہ دیا کہ میں مصلحتاً خاموش رہوں۔ میں اگر مصلحت کی اس ناپاک صورت سے آشنا ہوتا تو علی گڑھ میں خاموش رہتا۔ جہاں ایک زمانے میں ترقی پسندی کا نام لینا اپنے "کیریئر" پر مہر لگا لینے کے مترادف تھا۔ جب میں وہاں خاموش نہ رہ سکا تو اورنگ آباد میں اُردو کا کون سا نام تھا جو مجھے خوف دلا سکتا تھا اور خاموش رکھ سکتا تھا۔ رہا خطابت کا مسئلہ تو ہندوستان میں تین آدمی ہیں جن کی خطابت کا قائل ہوں۔ ایک سردار جعفری، دوسرے اختر انصاری اور تیسرے خورشید الاسلام۔ سردار تو اپنی خطابت کے لئے بدنام ہیں۔ اختر انصاری نے اُردو ٹیچرز کانفرنس علی گڑھ میں سرور صاحب کے جواب میں جو تقریر کی، اس کی گونج سے علی گڑھ کی سماعت آج بھی آشنا ہے۔ خورشید الاسلام نے سنگم کے زیر اہتمام انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیمینار میں جو خطبہ صدارت دیا تھا وہ یادگار رہے۔ میں مائک پر گیا اور ایک سخت تقریر کی۔ اب اشمر فاروقی متوجہ ہوں۔ میں نے آپ کا جواب نہیں دیا تھا۔ اسلئے کہ میرا خیال تھا کہ بین السانی ادیبوں کی ہیبت نے آپ کے اعصاب پر جو بُرا اثر ڈالا ہے جب وہ زائل ہو جائے گا تو آپ تنہائی میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں گے۔ لیکن اب جبکہ آپ نے اپنے دو ورقی اخبار میں جس کے آپ خیر سے اڈیٹر بھی ہیں، سیمینار کی مسخ شدہ رپورٹ شائع بھی کر دی تو پھر جواب کا وصول کرنا آپکا حق ہو گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کی مسخ شدہ رپورٹ اُردو کی نہیں جدید اردو صحافت کی بھی نہیں بلکہ زرد نگاری کی بہترین مثال ہے میں اسنیکہ کی وضاحت کر دوں۔ اُردو کی جدید صحافت کی غلط نگاری کی مثال میں وہ رپورٹ پیش کی جا سکتی ہے جو جدیدیت کے سیمینار پر کسی نعیم جمیل احمد نے "شبخون" میں لکھی تھی، اور جس کا لب لباب یہ تھا کہ تین دن تک سارا سیمینار، سارا علی گڑھ صرف ایک شمس الرحمٰن فاروقی کی تقریر پر دلپذیر اور کلام بلاغت نظام سے استفادہ کے لئے سر بہ زانو رہا ہے۔ لیکن اس رپورٹ میں یہ نہیں ہوا، کہ کسی ایسے شخص کے منہ سے ایسی تقریر ٹھونس دی جاتی جو پورے سیمینار میں۔ بیماری کی وجہ سے ایک جملہ بھی نہیں بولا تھا۔ جیسے آپ نے بیچارے رام لال کے منہ میں ایک لمبی چوڑی تقریر دھانس دی۔ حالانکہ رام لال۔ بیماری کی وجہ سے اس حد تک معذور تھے کہ ایک جملہ نہیں بول سکے۔ ڈائس پر بیٹھے رہے لیکن کہانی نہیں پڑھ سکے دوسری بات یہ کہ ترقی پسندی انڈر گراؤنڈ نہیں ہے اور ترقی پسند بھیس بدل کر نہیں نکلتے۔ جن کی نشاندہی کر کے "بوڑھی بیتوں" کو محفوظ رکھنے کے لئے آپ کو دہائی دینا پڑے۔ ترقی پسند زندہ ہیں۔ ترقی پسندوں کی انجمنیں موجود ہیں۔ ان کے رسائل نکلتے ہیں۔ انکے سیمینار ہوتے ہیں۔ علی گڑھ اور دہلی میں ہو چکے اب لکھنؤ اور الہ آباد میں ہونے والے ہیں۔ اگر آپ کی خواہش ہوگی تو اورنگ آباد میں بھی برپا کر دیا جائے گا۔ ہاں فرق نئی اور پُرانی ترقی پسندی کا ہے۔ اور ہم نئے ترقی پسند پُرانے ترقی پسندوں کے فارمولے اور فیصلے سے آپ سے زیادہ مخالف ہیں۔ جی ہاں میں نے خالدہ اصغر اور محمد عمر میمن کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کا بھی نام نہیں لیا تھا۔ اس لئے کہ میرا مضمون ہندوستانی ادب تک محدود تھا۔ اور ہندوستان میں بھی صرف ان فن کاروں کو میں نے مضمون میں شامل کیا تھا جن کو میں جدید بھی مانتا ہوں اور افسانہ نگار بھی۔ رہی نئی نسل! اُردو ادب کی بدنصیبی تو یہی ہے کہ ہماری آخری نسل ہماری نئی نسل ہے۔ نئی نسل کا اطلاق ان فن کاروں پر ہوتا ہے جو اٹھارہ بیس سال سے چوبیس پچیس سال کی عمر کے اندر ہوتے ہیں۔ چالیس چالیس پچاس پچاس کے بُڈھے صرف اُردو ادب میں نئی نسل کا لبادہ اوڑھ کر دندناتے پھرتے ہیں بیچارہ اُردو زبان کے علاوہ ہندوستان کی کسی زندہ اور اہم زبان میں اس بوڑھی منگر نئی نسل کا جواب نہیں ملتا۔ تاہم میں آپ کے اعتراض کو توجہ سے سنتا اور خاکساری سے جواب دیتا اگر آپ نے تنقیدی مضمون میں احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کی عدم شمولیت پر احتجاج کیا ہوتا۔ لیکن یہ قصہ کہاں تھا۔ قصہ صرف اتنا تھا کہ میرے مضمون میں آپ کا نام موجود نہیں تھا۔

آخری بات! آپ نے تحریر کیا کہ کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی کے جوتے کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ اور آپ کو غلط فہمی ہوئی کہ آپ نے ایک تیر میں دو شکار کئے۔ یعنی ایک طرف کرشن چندر کو رنجور اور دوسری طرف بیدی کو مسرور کر دیا۔ میں بیدی سے دو چار مرتبہ ملا ہوں، تاہم یقین کرتا ہوں کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کی طرح بیدی کو بھی اس جملے سے دُکھ پہونچا ہوگا۔ رہا کرشن چندر کی رنجوری کا معاملہ تو کرشن چندر رنجور نہ ہوئے ہوں گے۔ اس لئے کہ پوری اُردو دُنیا میں آپ جیسے اشرفاروقی ہزار دو ہزار تو ہوں گے ہی اور سال میں چار چھ مرتبہ کرشن چندر کو گالیاں دے ہی لیتے ہوں گے یعنی ایسے فقروں کی تعداد سال میں چار چھ ہزار تو ہو ہی جاتی ہوگی اور سال میں دن ہوتے ہیں کل تین سو پینسٹھ۔ اب اگر کرشن چندر روز درجن بھر ایسے فقرے سُن کر رنجور ہونا شروع کر دیں تو سال بھر مرتے، رنجور ہوتے رہیں لکھنے پڑھنے کا کام تو ہو چکا۔ لیکن کرشن چندر لکھ رہے ہیں۔ اور عزیزم! آپ سے زیادہ لکھ رہے ہیں۔ اگر آپ بھی لکھتے ہیں تو...... اور آپ سے بُرا بھی نہیں لکھ رہے ہیں۔ ہاں وہ اپنے آپ سے بُرا لکھ رہے ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال اور رام لال کو بھول جایئے۔ اب آپ کی زبان میں کوئی بلراج مینرا، کوئی سریندر پرکاش اور کوئی شرون کمار ورما کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ غیر مسلم اُردو داں طبقہ مر چکا، جس کے بچے جوان ہو کر اُردو کے ادیب بنتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ مسلمانوں کے طبقۂ اوّل کو بھی بھول جایئے۔ اور یہ دیکھئے کہ مسلمانوں کے طبقۂ اوسط (مڈل کلاس) کے کتنے بچے اُردو پڑھ رہے ہیں۔ جی ہاں اُردو مر رہی ہے۔ آہستہ آہستہ مر رہی ہے۔ جب سلطنتیں مرتی ہیں تو ان کے ارباب اختیار بدکردار، بداعمال اور بداقبال ہو جاتے ہیں اور جب زبانیں مرتی ہیں تو ان کے ادیب کم نظر، کم فہم اور کم نصیب ہو جاتے ہیں۔ اُردو ایک ایسا درخت ہے، جس کی جڑیں سوکھ چکیں، صرف تنا باقی ہے۔ کچھ شاخیں لگی ہیں، کچھ زرد پتے، کچھ مرجھائے ہوئے پھول ابھی زندہ ہیں۔ زبانیں بھی سلطنتوں کی طرح دیکھتے دیکھتے بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور سلطنتوں ہی کی طرح دیکھتے دیکھتے مر بھی جاتی ہیں۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ معزول ہوا۔ ڈیڑھ سو برس تو لگے لیکن انجام وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ہم نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم کیا۔ یعنی اُردو مرض الموت میں مبتلا ہوئی۔ اب سارا کھیل وقت کا ہے۔ حکومت ایک کروڑ نہیں ایک ارب روپیہ خرچ کر دے تو بھی اُردو ــــ زبان کو بچایا نہیں جا سکتا۔ اُردو زبان کو بچانے کے لئے اُردو کی جڑیں سینچنا ہوں گی۔ دو تین نسلوں سے سوکھی ہوئی زمین کو سیراب کرنا ہوگا۔ کہ نیا بور آئے۔ نئے پھول کھلیں۔ نئے پھل لگیں۔ اور بور کی مہک کو خوش گوار، پھولوں کو خوش رنگ اور خوشبودار اور پھلوں کو لذیذ اور صحت مند ہونا پڑے گا۔ ورنہ میلوں بھاگتے ہوئے بازار میں کھپت نہ ہوگی۔ اور اس عظیم کام کے لئے جس قلم کاری اور جتھا بندی کی ضرورت ہے وہ ہم میں موجود نہیں۔

میں مائک سے آکر بیٹھا ہی تھا۔ کچھ طالب علم آئے۔ اصرار کر کے باہر لے گئے۔ اور تصویر کھینچتے رہے۔ واپس آ رہا تھا کہ حمید سہروردی نے اپنا تعارف کرایا اور ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جہاں کچھ نوجوان لکھنے والے پہلے ہی سے موجود تھے۔ ہم لوگ چائے پر ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر واپس آیا تو اجلاس آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔

گیسٹ ہاؤس کے "لان" پر وائس چانسلر نے "ایٹ ہوم" دیا تھا۔ کنجوں میں خوش رنگ روشنیوں کے ہجوم نے ماحول کو خوابناک بنا دیا تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے مل رہے تھے کہ دُور سے مائک پر وائس چانسلر کی آواز اُبھری، بھاری آواز، دوستانہ لہجہ، آداب میزبانی سے چھلکتے ہوئے الفاظ نے اس رسمی تقریب کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ ابھی پُرتکلف ایٹ ہوم چل رہا تھا کہ گاڑیاں لگ گئیں مہمان ادیب بھیجے گئے۔ مراٹھی زبان کی انجمن تنظیم و ترقی نے اپنی نئی عمارت میں ہمیں استقبالیہ دیا تھا۔ ڈھلی ہوئی عمر کے مشہور ادیبوں کی اکثریت تھی۔ انھوں نے کھڑے ہو کر اتنی خاک ساری سے پذیرائی کی کہ مجھے شرم آنے لگی۔ مجھے اصرار کر کے مسند پر بٹھایا۔ اتنے میں کیلشور آ گئے۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے مسند کیلشور کی

طرف بڑھا دی۔ کملیشور نے تھوڑے اصرار کے بعد اسے ڈھکیل کر الگ کر دیا۔ اب ہم لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے۔ کہ وہ سرک کر ہماری پشت سے لگ گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا، ایک مربٹہ بزرگ ہاتھ جوڑے مسکرا رہے تھے۔ کملیشور، باقر مہدی کے متعلق پوچھ رہے تھے اور میں ان کا تعارف کرا رہا تھا۔ کاغذ کی طشتریاں تکلفات سے لدی رکھی تھیں اور انجمن کے سکریٹری تقریر کر رہے تھے۔ دولت آصفیہ کے اس ظلم اور تشدد کا بیان کر رہے تھے جسے مراٹھی بھاشی اور مراٹھی ادیب انگیز کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن سب کچھ اس طرح بیان کر رہے تھے کہ ہم ان کے غم میں شریک تھے۔ اردو زبان کے کتنے ادیب اس محفل میں شریک تھے؟ صرف چار۔ جوگیندر پال، رام لال، باقر مہدی اور خاکسار۔ لیکن ہماری موجودگی کا احترام تھا، مہمان نوازی کے آداب تھے کہ اردو زبان کے ظلم کو بھی انھوں نے تقدیر کی صورت دے دی تھی کہ ہم اپنے ماضی پر شرمندہ نہ ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی بار اردو کی ترقی و ترویج کے لئے دعا بھی کی۔ سچ ہے کہ جب ایک کلچر مرنے لگتا ہے تو دوسرا کلچر مرتے ہوئے کلچر کی تمام خوبیاں اپنے گلے میں پہن لیتا ہے۔ واپسی میں عجلت کی گئی۔ کہ کھانا کھا کر مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔

آج ڈائیننگ روم کی رونق شباب پر تھی۔ گلدستوں اور سلاد کی پلیٹوں کا سجاؤ دعوت نگاہ دے رہا تھا۔ ہال کے دونوں کونوں پر سجی ہوئی چوکور میزوں پر سنہری شراب سے بھرے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ شیریں آوازوں، پُرتکلف لہجوں، اور مختلف زبانوں کے لفظوں کا شیریں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کی انچارج سیاہ حاشیے کی سرخ ساری پہنے اونچے قد پر سجے ہوئے بھاری جوڑے میں سرخ گلاب لگائے میزبان خاتون کی طرح میزبانی تقسیم کر رہی تھیں۔ میرے لئے کسی بھی یونی ورسٹی کا یہ پہلا دَر تھا جہاں شراب "سرو" ہو رہی ہو۔ جب وائس چانسلر ڈاکٹر ناتھ نے بڑے اصرار سے ایک گلاس میرے ہاتھ میں پکڑا دیا تو سیاہ رنگ مربٹہ "بیرر" اپنی چوڑی چوڑی سیاہ مونچھوں میں مسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک کہانی تھی۔ پہلے دن جب میں جوگیندر پال کے یہاں سے واپس آیا اور کھانا لگنے لگا تو اسی "بیرر" نے اشاروں اور کنایوں میں اپنی خدمات پیش کی تھیں اور میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھنجھلا گیا تھا، اور وہ میرے نام کے ساتھ لگے ہوئے قاضی کا احترام کر رہا تھا۔ اور جب اس نے ڈرتے ڈرتے اور لفظوں کو چباتے ہوئے شراب کے لئے پوچھا تھا تو میں نے تندی سے جواب دیا تھا کہ میں شراب نہیں پیتا، اور وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا تھا۔ اور اب اس کی باری تھی۔ اور میں اس کی نگاہ سے تجل ہو کر ایک طرف چلا گیا۔ میں کونے میں کھڑا تھا۔ کملیشور نان وجیٹیرین "میز پر اپنی پلیٹ کی خدمت کر رہے تھے۔ باقر مہدی وائس چانسلر سے اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ نہ گردن ترچھی تھی اور نہ لہجہ تیکھا۔ مجھے ایسا لگا، جیسے یہ وہ باقر مہدی نہیں ہیں جنھیں میں بیس سال سے جانتا ہوں۔ میں جوگیندر پال کو ڈھونڈھ رہا تھا کہ ایک طرف سے سیاہ آستینوں والے ہاتھوں کی بھری ہوئی پلیٹ نے میرا راستہ روک لیا۔ میں حکم کی تعمیل کر رہا تھا کہ مغنی تبسم آ گئے۔ اور بغیر کسی تمہید کے بولے۔

"ہم تو قاضی صاحب آپ کی محبت میں رسوا ہو گئے۔"

وائس چانسلر نے پلیٹ پکڑتے پکڑتے ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔ اتنے میں پال نظر آ گئے۔ میں ان کے پاس جانے لگا۔ پرنسپل ڈاکٹر نعیم الدین اس وقت تنہا تھے۔ ان سے ملئے تو شیریں ہی شیریں۔ میٹھے میٹھے۔ جیسے بچھے جا رہے ہوں۔ مزید کچھ لینے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ میں انکار کی سنت ادا کر رہا تھا۔ پھر پیچھے سے پلکیں اٹھائیں اور بولے۔

"آپ نے تو اورنگ آباد کو ہلا دیا۔"

میں جواب سوچ رہا تھا کہ پال کا وزنی ہاتھ شانے پر گر پڑا۔ میں ابھی ان سے باتیں کر رہا تھا کہ ہال خالی ہونے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہو گیا۔ میں پال کے ساتھ ٹیلی فون کی میز کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہیں ناتھ جی تشریف لے آئے۔ اور "بیرر" کو کافی لانے کا حکم دیا۔ پال نے کافی بنا کر کہا کہ مجھے مشاعرے میں چلنا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ "شب افسانہ" میں شاعر کب آئے تھے کہ میں ان کو سننے چلا جاؤں۔ ویسے اگر دُش

چانسلر صاحب کا حکم ہوگا تو چلا جاؤں گا۔ لیکن اس شرط پر کہ جب واپس آنا چاہوں، واپس آسکوں۔"

ناتھ جی مسکرائے۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں حکم نہیں دے رہا ہوں گزارش کر رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ جب آپ آنا چاہیں گے آپ کو گاڑی ملے گی۔"

پال بولے:"مشاعرے میں کچھ لوگ آپ کو دیکھنے بھی تو آئیں گے۔" اتنے میں بشر نواز آگئے۔ روداد سنی اور بولے کہ میں "شب افسانہ" میں موجود تھا۔ اور میں شاعر ہوں۔

اب ہم سب لوگ کھڑے ہوگئے۔ پورٹیکو میں صادق سے ملاقات ہوگئی۔ جو رنگ اور لفظ دونوں کے ذریعہ اپنی جستجو کے شوق میں گم ہیں۔ مشاعرہ جیسا عام طور پر ہوتا ہے ویسا نہیں تھا کہ خالص اردو والے بہت کم تھے۔ دوسری زبانوں کے شاعر تحمل اور تحمل، تہذیب اور بردباری سکوت اور وقار کا نمونہ بنے بیٹھے تھے۔ شعر اس طرح پڑھتے جیسے پھول مہک رہا ہو۔ اچھے بُرے کی قید تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ جبکہ اُردو کے اکثر شاعر دور سے پہچانے جا رہے تھے۔ تصنع کا غبار، تکلف کا سجاؤ "پوز" کے سہارے، لباس اور انداز، اور ادا ہر چیز جیسے ایک اشتہار تھی کہ مجھے دیکھو میں شاعر ہوں۔

صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ شاذی صاحب آگئے۔ شام جب انھوں نے صبح آنے کا وعدہ کیا تھا تو میں نے آداب میزبانی کا ایک طور جانا تھا۔ لیکن جب وہ تشریف لے آئے تو مجھ پر ایک عالم گزر گیا۔ انتہائی اصرار پر ایک پیالی چائے پی۔ راستے بھر اس محبت سے رہ نمائی کی کہ میں کھل کھل گیا ان کے احسان کے نیچے۔ اورنگ آباد سے گاڑی نکلی ہی تھی کہ تخیل انگڑائیاں لینے لگا۔ ننگی جلی بے ترتیب پہاڑیاں حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سڑک بہہ رہی تھی۔ دور پہاڑ کی چوٹی پر ایک قبہ کھڑا تھا جسے عالم گیری لشکر کے ایک سپاہی نے تعمیر کیا تھا لیکن موت کسی اور میدان جنگ میں نصیب ہوئی اور یہ خالی مزار آج تک اس کی قبر کا انتظار کر رہا ہے۔ کیسے لوگ تھے کہ موت کے استقبال و اہتمام میں زندگی صرف کر دیا کرتے تھے۔

دولت آباد کی جھیل کا وہ خشک حصّہ حد نگاہ تک پڑا سوکھ رہا تھا جو اورنگ آباد کو پانی مہیا کرتی تھی۔ اب ایک طرف پہاڑ تھے اور دوسری طرف غار۔ دور ایک گاڑی کھلونے کی طرح اڑتی چلی جا رہی تھی۔ بڑی چھوٹی خندقوں کی طرح حد نگاہ تک کمیں گاہوں کا سلسلہ دراز تھا جن کے چاروں طرف پہاڑیوں کا جال کھڑا تھا کہ بڑے سے بڑا لشکر ان پہاڑیوں، جنگلوں، دلدلوں اور خندقوں میں کھو جائے اور اپنی مجموعی طاقت کے خطرناک اظہار سے قاصر رہے۔ ایسی ہی سرزمین شیواجی کے عسکری منصوبوں کی جولانگاہ ہو سکتی تھی۔ یہی ویران اور سنسان اور خاموش پہاڑیاں شیواجی کی رازدار رہی ہوں گی جس نے مغل آفتاب کے آسمانوں پر کمندیں ڈال دینے کی جسارت کی تھی جسارت اور شجاعت اور شہادت وہ دولت ہے جو تاریخ کا حافظہ خرید لیتی ہے۔ تھوڑی دُور چل کر بائیں جانب پہاڑ پر ایک بارہ دری نظر آئی۔ معلوم ہوا یہی دولت آباد کا قلعہ ہے۔ اتنی فرصت کہاں تھی کہ اسے دیکھ سکتے۔ قلعے کی ہولناک بلندی کے سامنے علاؤالدین خلجی کا بنوایا ہوا "منار فتح" ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ اور مجھے اس شخص کا خیال آرہا تھا جس نے عظیم مغلوں کے زمانوں سے پہلے صدیوں پہلے ہندوستان میں شہنشاہی کی طرح ڈال دی تھی۔ جس نے کرنسی کا خواب دیکھ لیا تھا اور چین پر یلغار کی تیاریاں کر رہا تھا اور اب غلط آباد تھا۔ تھوڑی دور چل کر ڈرائیور نے ہارن دیا تو بائیں طرف بنی ہوئی مسجد کی پشت سے آواز کی تکرار ہوئی۔ ماضی کے عسکری تحفظات و اقدامات سے ہم دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ پھر گاڑی اس معمولی سی بستی میں داخل ہوئی جس کے مکانوں اور مکینوں کی صورتوں سے غریبی ٹپک رہی تھی۔ پھر وہ بڑی سی مسجد تھی جس کے پاس سیاحوں کو دینے کے لئے قدامت کے سوا کوئی تحفہ نہ تھا۔ بڑی بڑی دیگوں کو دیکھتے ہوئے خواجہ اجمیر کے سلسلے دار کے مزار مبارک میں داخل ہوئے۔ مزار مبارک کے پہلو سے ایک راستہ عالم گیر کی قبر کو جاتا تھا۔ مرمریں جالی کے کٹہرے میں قبر کا حاشیہ تھا۔ درمیان میں سبز گھاس کی تختی پڑی تھی۔ اور اس کے نیچے وہ شخص سو رہا تھا

جو اگر چاہتا تو اپنی قبر کے لئے دوسرا تاج محل کھڑا کر لیتا۔ تاریخ عالم کے پاس اس شخص کے علاوہ کسی ایسے تاجدار کا نام موجود نہیں جو چوتھائی صدی تک دارالحکومت سے غیر حاضر رہا ہو اور دارالحکومت بغاوتوں سے محفوظ رہا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ تاریخ عالم کے پاس کسی ایسی دوسری سلطنت کا نام بھی موجود نہیں جو اپنے شہنشاہ کی موت کے بعد اپنی تمام تباہیوں، بدبختیوں، بداعمالیوں اور بداقبالیوں کے باوجود اپنی موت کا ڈیڑھ سو برس تک انتظار کرتی رہی ہو۔ ایک طرف ایسی جاہ پرستی کہ اپنی شہنشاہی کے لئے باپ کی اسیری، بھائیوں کے قتل اور بیٹوں کی قید تک سے دریغ نہ کیا اور دوسری طرف ایسی دادگیا ..... پھر جیسے آوازوں کا لشکر زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے لگا۔ معلوم ہوا کہ شہریار[1] دکن نے آستاں بوسی کے لئے اپنے خدم و حشم کے جلو میں نزول اجلال فرمایا ہے۔ اپنے حکم سے بنوائے ہوئے مجمر کا دست بستہ طواف کیا اور قبر کے قدموں میں کھڑے ہو کر عرض کیا۔

'جہاں پناہ! صوبے دار دکن کا سلام قبول ہو۔'

اب 'ایلورا' کے غار سامنے تھے۔ صدیوں کی محنت اور صناعی ..... پہاڑوں کو سر سے پاؤں تک تراش ڈالنے والی محنت اور پتھروں کو موم کی طرح برتنے والی صناعی مجسم ہو گئی تھی۔ عمر بھر کے تپاک اور تاب اور تپسیا نے پشتہا پشت کی کمائی آنکھوں کے سامنے انڈیل دی تھی۔ سب کچھ سامنے تھا لیکن سب کچھ گمان معلوم ہو رہا تھا، سب کچھ خواب معلوم ہو رہا تھا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایسا طلسم جو ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔ ایلورا کے طلسم پر حقیقت کا جو باریک سا نقاب پڑا تھا وہ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ٹوٹ گیا۔ اور طلسم خالی طلسم ہو کر رہ گیا۔

رات کی محفل قاضی سلیم اور آپ کے اشتراک سے آراستہ ہوئی۔ قاضی سلیم میرے پاس سے اٹھ کر باقر مہدی کے کمرے میں گئے ہیں۔ بشیر نواز کا انتظار ہے۔ رام لال کچھ بہتر ہو گئے ہیں اور باہر گئے ہیں۔ یاں خوش خوش میرے پاس آئے ہیں اور بچوں کی سی خوش دلی سے کہہ رہے ہیں۔

"مراٹھی پریس نے آپ کو بہت اچھا 'کوریج' دیا ہے"۔

میں ان کو چشمے کی کمانی کے پاس سے دیکھتا ہوں اور "ایلورا" کا ذکر چھیڑ دیتا ہوں۔ پھر قاضی سلیم، بشیر نواز اور رام لال آ جاتے ہیں۔ پھر صراحی سے کرن پھوٹتی ہے۔ آفتاب طلوع ہوتے ہیں اور ان کی تیز روشنی میں سارے حجابات اور تکلفات کی سیاہیاں چھٹنے لگتی ہیں۔ اور باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ باتیں جن کی لپیٹ میں شخصیتیں بھی آ جاتی ہیں اور ادبی واقعات و حادثات بھی۔ شخصیتیں جن کی خوبیاں اسی وقت تک خوبیاں رہتی ہیں جب تک ہمارا ان سے ٹکراؤ نہیں ہوتا اور خامیاں اسی وقت تک خامیاں رہتی ہیں جب تک ہماری ان سے دوستی نہیں ہو جاتی۔ ادبی کارنامے ..... ادبی کارناموں پر ہماری رائے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے۔ خالق سے اگر گھٹ رہی ہے تو تخلیق کھوٹ آفریں۔ اگر بڑھ رہی ہے تو گوارا۔ اگر چل رہی ہے تو بکواس۔ شاید ہی اردو ادب کی تاریخ میں ایسا کوئی زمانہ گزرا ہو جب ساری ادبی اقدار ذاتی تعلقات کے آبخورے میں انڈیل لی گئی ہوں۔

"آپ کی تقریر نے بیزار کر دیا ..... ہم دونوں اس کا جواب دیتے رہیں گے مگر"۔

قاضی سلیم کے اس فقرے پر میں ایسی کیفیت سے گزر رہا ہوں جس کا بیان الفاظ کی پہنچ سے باہر کھسک جاتا ہے۔ پھر ہم دیر تک لسانی دردمندی کے ویران صحراؤں میں ایک دوسرے کے تلووں کے کانٹے چنتے رہتے ہیں۔

صبح تڑکے جب میں اجنتا جانے والی بس پر بیٹھا اور بشیر نواز نے خدا حافظ کہا اور بس چل دی تو احساس ہوا کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ ساری بس اجنتا کے زائرین سے بھری ہوئی تھی اور ہمارے گائیڈ صاحب بھرائی ہوئی آواز میں ایسی تقریر کر رہے تھے جیسے سڑک کے کنارے لگے ہوئے مجمع میں عطائی دوا بیچتے ہیں۔ ان کی تقریر کا صرف ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں سو نہ سکا، اور مجبوراً ویران کھیتوں، بدحال جانوروں اور کنگال آدمیوں کو دیکھتا رہا۔ اپنا سامان رکھوا کر جب میں ریسٹوران میں داخل ہوا تو محسوس ہوا جیسے میں کسی

۱۔ نظام حیدرآباد

دوسرے ملک میں آگیا ہوں، ساری میزوں پر مغربی سیاحوں کا ہجوم تھا بڑی مشکل سے بیٹھنے کو جگہ ملی اور بڑے دنوں بعد پچ مچ کی چائے ملی۔ اورنگ آباد میں صرف ایک تکلیف ہوئی، وہ یہ کہ چائے عجیب سی ہوتی تھی اور ہر جگہ یکساں ہوتی تھی اس لئے کہ نسخہ ایک ہی تھا۔ یعنی پتی دودھ اور شکر سب کو ایک ساتھ ابال کر ڈھال دیا گیا۔ اچھی چائے نے جیسے تھکن نچوڑ لی۔ سیکڑوں سیڑھیاں چڑھ کر ایک غار میں داخل ہو رہا تھا کہ ہماری بس کے گائیڈ نے لپک کر پکڑ لیا۔ میں نے لاکھ پیچھا چھڑانا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ اور میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا تھوڑی دیر بعد جب بوریت انتہا کو پہونچنے لگی اور میں فرار کی ترکیب سوچ رہا تھا تو ایک خوش پوش اور کم سن نوجوان نے مجھے پہچان کر اپنا تعارف کرایا، اپنے دوستوں سے ملایا۔ جب ہم چائے پی رہے تھے اور بیٹھے در گائیڈوں کے لطیفے سنا رہے تھے۔ تب میں نے اس نوجوان سے پوچھا کہ آپ کا کیا شغل ہے۔ اور اس نے برجستہ جواب دیا کہ وہ ایک پیشہ ور گائیڈ ہے اور لطیفے اچانک ختم ہو گئے کہ اس کے تہلکے کے لئے میرے پاس دہلا نہیں تھا اس نے ایک آرٹسٹ سے ملایا جو غار نمبر ۱۰ کی نقل کے انچارج تھے۔ اور میں ان کے علم اور فن کے اظہار سے دیر تک سیراب ہوتا رہا تاہم ایلورا نے جو طلسم باندھا تھا اسے ابھی بھی نہ توڑ سکا۔

سہ پہر کی بس سے جب شام کو جلگاؤں پہونچا تو معلوم ہوا کہ آگرے کے لئے گاڑی ساڑھے دس بجے رات کو ملے گی۔ سامان کلوک روم میں چھوڑ کر وقت گزارنے نکلا۔ معمولی سے شہر کے بہت معمولی پکچر ہال میں مدتوں بعد ایک اسٹنٹ فلم دیکھی مگر پیسے ضائع نہیں ہوئے۔

بڑی زحمت کے بعد سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بستر بند رکھنے اور اسی پر بیٹھ سکنے کی سعادت ملی۔ سارے ڈبے میں داہنے بائیں اوپر نیچے مسافر اس طرح جمے ہوئے تھے جس طرح ٹرک میں سامان بھرا ہوتا ہے۔ مسرتوں کی طرح گزرتے شہروں کی روشنیاں دور سے نظر آتیں اور قریب آئے بغیر دور چلی جاتیں کہ زندگی اسی کا نام ہے۔ ساری رات اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کسی نہ کسی اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی تو اترے گا۔ لیکن سب مسافر میری طرح آگرے جا رہے تھے مدتوں بعد صبح کاذب اور صبح صادق اور پھر صبح دیکھنے کا زرّیں موقعہ ملا۔ ابھی میں اس ساغرِ زرنگار کا آخری قطرہ نچوڑ رہا تھا کہ بھوپال آگیا۔ بعض شہر ایسے ہوتے ہیں جن سے یگانگت ٹپکتی ہے، جہاں پہونچ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنوں میں آگئے ہیں۔ احساس تحفظ بھی عجیب چیز ہوتا ہے۔ میں نے اضطراری طور پر قلی کو پکارا اور اتر پڑا۔ ویٹنگ روم کی صرف ایک کرسی خالی تھی اور میں سونا چاہتا تھا۔ جب امید کی کوئی کرن نظر نہ آئی تو میں ضروریات سے فارغ ہوا۔ سامان کلوک روم کے حوالے کیا اور شہر دیکھنے نکل پڑا۔

دھند میں سوتے ہوئے تالاب..... عظیم الشان تالاب کے کنارے کنارے لیٹی ہوئی سوتی جاگتی سڑک ایسی خوبصورت معلوم ہوئی کہ میں سونا بھول گیا، اور جب ختم ہونے لگی تو میں نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی گھمایئے اور اسی سڑک پر چلئے۔ اس نے گاڑی کے بجائے اپنی گردن گھمائی اور اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔

"کیا اس سڑک پر گاڑی کا گھمایا جانا قانوناً منع ہے۔؟"

"پیسے تو آپ میٹر دیکھ کر لیں گے نا۔؟"

"اور ذرا آہستہ چلئے۔"

ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ لکھنؤ کا نخاس یاد آگیا۔ نکڑ پر چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے ٹوٹے ہوئے پرانے دھرانے ترخا ایکتھیں اور گھٹنے پینے چائے میں نان پاؤ ڈبو کر کھا رہے تھے، اور اردو کے اخباروں کی چٹپٹی سرخیاں مزے لے لے کر پڑھ رہے تھے، اور انگلی پر جما ہوا جونا کتر رہے تھے، میں وہیں اتر پڑا۔ دیر تک اور دور تک چل پھر کر اس علاقے کو دیکھتا رہا۔ جس پر اسلامی تہذیب کی چھاپ لگی تھی۔ مسجدیں کھڑی تھیں اور چائے خانے بھنک رہے تھے، حلیے سے افلاس اور چہرے سے وقار اور آنکھوں سے غرور ٹپک رہا تھا۔ ایک دوکان پر ایک بزرگ اخبار خرید رہے تھے۔ میں ان کے پاس سے گزرتے گزرتے ٹھٹھک گیا اور بغیر کسی تمہید کے سوال اٹھا کر دے مارا۔

"آپ ابو محمد سحر کو جانتے ہیں؟"

"جی۔"

ان کی شفیق آنکھوں نے مجھے دیکھا گویا کہہ رہی ہوں کہ اگر نہیں جانتے ہیں تو اب جاننا بھی پڑے گا۔ اور میں کچھ نروس سا ہو گیا۔ انھوں نے اخبار کے پیسے دیے، اخبار لیتا اور میرے قریب آ گئے۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

گویا یہ طے ہو چکا کہ میں مسافر ہوں ... غریب الدیار ہوں۔

"اورنگ آباد سے۔"

ہر چند کہ سب کچھ اضطراری تھا لیکن اپنے اس جواب پر خود مجھے بھی حیرت ہوئی۔

"آپ کا اسم شریف۔؟"

جی میں آیا کہہ دوں ہو گُن دیال۔ لیکن بعد کے مراحل کے خوف سے باز رکھا۔

"قاضی عبدالستار۔"

"اچھا..... اچھا۔ بہت خوشی ہوئی .. بہت مسرت ہوئی۔"

میں ڈر گیا۔ مجھے قاضی عبدالستار کا بیٹا تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ وہ تہذیب اور تمدن کا مجسمہ بنے اسی جگہ معانقے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے کھڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیے۔

"آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔"

اور میں چلنے لگا کہ کسی تکلف کے اظہار کی بھی ہمت نہیں ہوئی —

دروازہ کھلا تو کمرے میں ایک طرف بستر لگا تھا لیکن اس طرح کہ جیسے ابھی ابھی کوئی اٹھ کر کوئی اندر گیا ہو۔ اور اس کے سامنے صوفہ پڑا تھا۔ اور بستر سے نیند کی خوشبو اور خوابوں کی مہک کے مرغولے نہیں بادل اٹھ رہے تھے۔ اور میں اپنے آپ پر جبر کیے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اور پلنگ پر بچھے ہوئے بستر حوان نعمت کو گھور رہا تھا۔ سارا سوپا پلنگ۔ اچھی خاصی موٹی، نرم و نازک، صاف ململی چادر، گورگدا گورگدا تکیہ، خوش وضع فرد کا موٹا موٹا لحاف اور میں ساری رات کی نیند اور تھکن ..... دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان سلیپنگ سوٹ پہنے تشریف لائے۔

"میرا نام آفاق ہے.... میں اجین کے شعبۂ اردو میں..."

میں نے لمبی سی جماہی لی۔ وہ فوراً واپس چلے گئے۔ کم بخت جماہی کو انھوں نے چائے کی طلب پر محمول کیا۔ پھر تکلفات شروع ہو گئے۔ چائے پھر ناشتہ پھر چائے۔ اور باتیں۔ مجھے اس علاقے کو دیکھ کر لکھنؤ کی یاد کیوں آئی۔ اب تو سب کچھ ہو گا اور آفاق صاحب نے میری بڑی خاطر کی بڑی پذیرائی کی۔ لیکن جھوٹ موٹ نہیں کہا کہ آپ اس بستر پر لیٹ جائیے۔ اگر وہ اتنا کہہ دیتے تو یقیناً لیٹ جاتا جی نہیں سو جاتا۔ اور رات کو اٹھتا۔ مگر....

حمیدیہ کالج کے شعبۂ اردو میں ابو محمد سحر صاحب کلاس لے رہے تھے۔ اور آفاق صاحب شرمندہ تھے کہ میں لان پہ وقت گزار رہا تھا۔ ٹہل رہا تھا کہ کھڑکی پر قہقہہ پڑا۔ زندہ، جوان، بے ساختہ اور بے محابہ قہقہہ۔ نگاہ اٹھائی تو دیکھا بڑے بڑے بال جن پر زمانے کی سفیدی چھائی ہوئی ہے۔ سرمئی پتلون پر فاختئی کوٹ پہنے، سرخ ٹائی لگائے ندا عباس کھڑے ہیں لکھنؤ اور علی گڑھ کے ندا عباس جو حمیدیہ کالج میں فارسی کے استاد ہیں۔

"ارے.... قاضی عبدالستار"۔

اور انھوں نے بزور بازو مجھے اپنے قبضے میں کر لیا اور آفاق صاحب کو بے دخل کر دیا۔ ملتے جلتے چائے پیتے، سگریٹ پھونکتے سحر صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میں نے ان کو پہلی بار دیکھا اچھا اونچا قد، ڈھلا ہوا رنگ، متین چہرہ، ذہین آنکھیں، بڑے رکھ رکھاؤ سے ملے۔ فطری کم آمیزی کے باوجود شخصیت کے خلوص کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ندا عباس نے کان میں پوچھا۔

"نیند آ رہی ہے؟"

"آ رہی ہے؟ .... چڑھی آ رہی ہے ... گھلے ڈال رہی ہے"

"تو اچھوتا۔"

گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی بیگم صاحبہ لکھنؤ میں تشریف رکھتی ہیں اور ان کے نوشک لحاف فدا صاحب کی مسہری پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور میں لاش کی طرح بستر پر گرا۔

نیند کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تھی کہ ڈرائنگ روم سے ایک قہقہہ آکر ٹھیک میرے کان پر لگا۔ ہر چند کہ معمولی تھا لیکن فدا عباس کا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی دو بج رہا تھا۔ اٹھتے ہی فدا عباس آگئے۔

"کیا حال ہے؟"

"چنگا"

"نہانا مانگتا؟"

"لاحول ولا قوۃ"

"تو پھر کپڑے پہنئے کھانا کھانے چلئے۔"

"وہ کہاں"

"اس کی نہیں ہوتی"

آفاق اور وسیم الدین کے ساتھ ہم دونوں مجاہد اللہ خاں کے گھر گئے۔ جہاں کھانا نہیں تھا دعوت تھی۔ اور پُرتکلف کھانا کھاتے اور چائے پیتے چار بج گئے۔ سحر صاحب ہمارے منتظر تھے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ابراہیم یوسف صاحب تشریف لے آئے۔ حالاں کہ میں خود ان سے ملنے جا رہا تھا، صرف اس لئے نہیں کہ وہ ایک اچھے ڈرامہ نگار ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ میرے ایک شاگرد ہارون ایوب کے چچا ہیں۔ آپ کے ایک ڈرامے پر ماہنامہ شاعر میں حاصی بحث چلی تھی۔ شیروانی پر کھلے پائینچے کا پاجامہ پہنے صیقل کئے ہوئے لہجے میں دُھلی دھلائی گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ کہیں اور جانے سے پہلے آپ کے گھر چلوں گا کہ ہارون ایوب کا تقاضا ہے۔

جب میں ان کے دولت خانے پر پہونچا تو شام گہری ہو رہی تھی۔ اکا دُکا روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی ان کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی کہاں ہارون ایوب اور کہاں یہ وجیہہ اور شان دار بزرگ۔ باپ بیٹوں میں اتنا اور ایسا تضاد مشکل سے نظر آتا ہے۔ بڑے اصرار کے بعد رخصت کی اجازت ملی۔ سیفیہ کالج کے ہال کے دروازے پر عبدالقوی دسنوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی گفتگو کی دلسوزی اور شخصیت کی بے قراری میں اردو کے لئے کچھ کئے جانے اور کرتے رہنے کی تڑپ تھی۔ میں نے جلسے کے آثار دیکھے تو فدا عباس کے کان میں کہا۔

"تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔؟"

"یہ جلسہ نہیں ہے ..... صرف کچھ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

لیکن بہرحال وہ جلسہ تھا۔ رسمی کارروائی کے بعد اخلاق اثر نے کچھ سوالات کئے۔ ناول اور افسانہ، جدید اور ترقی پسند ادب اور ابلاغ ادیب اور قاری تمام موضوعات کو سمیٹ لیا۔ میں نے بھی ایک ہی تقریر میں سارے جوابات لپیٹ دیے۔ ذرا سانس لینے کے لئے رکا تو اخلاق اثر نے لقمہ دیا۔

"اس تھکن پر تو آپ کا یہ عالم ہے اگر تازہ دم ہوتے تو کیا ہوتا۔"

"سپاہی جب تلوار اٹھا لیتا ہے تو ساری تھکن کے باوجود تھوڑی دیر تو چلتی ہی رہتی ہے۔"

ہم لوگ دوسری چائے پی رہے تھے کہ ایک رجسٹر آیا۔ بہت تندرست اور توانا۔ ساتھ ہی دسنوی صاحب نے چپکے سے غیر شخصی آواز میں فرمایا۔

"اس پر اپنے تاثرات لکھ دیجئے۔"

قیام بھوپال کا سب سے مشکل مرحلہ یہی تھا، جو بہرحال طے ہوا۔ میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا اور فدا عباس شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے جلسہ ختم ہوا۔ بھاگم بھاگ آفاق صاحب کے گھر پہونچے جہاں پورا دسترخوان دعوت سے رنگین تھا اور مجھے خوف تھا کہ ان تکلفات میں ساڑھے دس بجے والی گاڑی نہ چھوٹ جائے کسی نہ کسی طرح کھانا کر اسٹیشن پہونچے تو بڑی ندامت ہوئی کتنے بزرگ، ہم عصر اور دوست پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ دوستوں نے

ریزرویشن کرادیا تھا اور وہ بھی ایسے ڈبے میں کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کی سیٹوں پر آٹھ دس آدمی سفر کر رہے تھے۔

"تم تجارت منسٹر بننا چاہتے ہو؟"

شہاب نے نشے کی ترنگ میں قمر رئیس پر وار کیا۔ قمر نے مسکراہٹ کی ڈھال پیش کر دی۔ لیکن انور عظیم جو ہم لوگوں کو کھانے پر بلانے کے لئے آئے تھے تلوار کی طرح کھنچ گئے۔

"آپ بن جائیے نا"

لیکن قمر رئیس اور اقبال مجید دونوں شہاب کی اس انانیت کو سہار رہے ہیں جو نشے کی جھونک میں سب کچھ روند ڈالنے پر تلی ہوئی ہے۔ شہاب کسی کو مخاطب کر کے مجھ پر بھی چوٹ کر رہے ہیں۔ لیکن میں کسی میگزین پر جھکا بیٹھا ہوں۔ گویا سن ہی نہیں رہا ہوں۔ اب انور عظیم سب کو اٹھا رہے ہیں۔ ٹیرس پر کھانے کی لمبی چوڑی میز پیسرے درجے کے مسافر ڈبے کی طرح لدی کھڑی ہے اور سب لوگ پلیٹ اور چمچے سے مسلح اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

کھانا پیٹ میں پہونچا تو ہڈیوں میں جمی ہوئی تھکن نیند بن کر آنکھوں میں اتر آئی۔ جماہیاں آنے لگیں۔ پلکیں جھپکنے لگیں جب رکمی جملوں کے تبادلے ہونے لگے تو میں حسن نعیم کے ساتھ اٹھ آیا۔ حسن نعیم سے میرا ذہنی تعارف اور تعلق بہت پرانا ہے۔ جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور میں نے ایک غزل کہی تھی ــــ جس کا ایک شعر تھا ــ

جہاں میں منصب فرہاد کس کو ملتا ہے
تمہیں بہت ہے سلیقے سے خسروی کر دو

اور جسے حسن نعیم نے بہت پسند کیا تھا، اور پوری غزل کہی تھی لیکن ملاقات علی گڑھ میں ہوئی اور ہنگامہ خیز۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ تھا۔ علیم صاحب صدارت کر رہے تھے۔ حسن نعیم نے اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ خلیل الرحمان اعظمی، اور منظر اور شہاب جعفری نے بحث میں حصہ لیا۔ لیکن باقر مہدی نے تو ایسی دھواں دھار تقریر کی گویا حسن نعیم نے اپنا کلام سنا کر کوئی جرم کر ڈالا ہو۔ اسی محفل میں حسن نعیم نے بھی خوب جم کر چوٹیں سہیں اور خوب سنبھل سنبھل کر وار کئے۔

امریکہ کے طویل قیام کے بعد جب ملے تو محسوس ہوا جیسے لٹ گئے ہوں۔ امریکہ کی تیز رو زندگی نے ان کے جسم پر عمر کا بوجھ بڑھا دیا خوشبو کے شوق میں ابروؤں کے ایک ایک دو دو بال سفید کر لئے کمر کا گھیر بڑھ گیا۔ خوش پوشی میلی ہو گئی۔ ایوان غالب کی سیڑھیاں نے حاسدوں کی ایک فوج کھڑی کر دی حسن کے بچھائے ہوئے کانٹوں پر سنبھل سنبھل کر چلتے ہیں۔ لیکن احتیاط کا یہ شیشہ ایک ہی آبگینے میں ڈوب جاتا ہے۔ ہم دونوں انتہائی روشن سڑک کے فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمک اٹھیں۔ حسن نعیم نے ہاتھ دکھایا۔ گاڑی رک گئی۔ معذرت گزاریوں کے بعد جب ہم لوگ بیٹھ گئے اور گاڑی حرکت کرنے لگی تو حسن نعیم سیٹ سے دفعتاً اچھل پڑے۔ وہ صاحب حسن نعیم کے دوست تھے۔

دستک دی تو شعیب قدوائی نے دروازہ کھولا۔ بہت دن ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی میں شعیب قدوائی کا تقرر ہو گیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی پر دہلی کالج کو ترجیح دی۔ شعیب جب انگریزی بولنے پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انگلینڈ میں پیدا ہوئے تھے (وہ لیڈز میں رہ بھی چکے ہیں) جب ادب پر گفتگو کرتے ہیں تو کوفت ہوتی ہے کہ یہ شخص لکھتا کیوں نہیں۔ جب اردو تنقید مغربی مصنفین اور تصنیفات اور اقوال کا استقبال اور استحصال کرتی ہے یا بقول شعیب EXPLOIT کرتی ہے اور ان کو فقرے بازی پر اکساتی ہے تو وہ اتنا ہنسنے ہیں کہ رونے کا مزہ آ جاتا ہے۔ طالب علموں کو انگریزی اتنی خود فراموشی سے پڑھاتے ہیں کہ جیسے قرون اولیٰ کے امام نماز پڑھا رہے ہوں۔ ہم لوگ دیر تک چائے پیتے رہے بڑے بڑے سنہرے بالوں کے نیچے ذہین آنکھیں تڑپتی رہیں۔ کھڑی ناک کے پتلے پتلے نتھنے پھڑکتے رہے۔ ترشے ہوئے نکوٹین سے سیاہ ہونٹ حرکت کرتے رہے اور میں دیر تک ان کی کمنٹری سنتا رہا تھا۔ جب الفاظ منہ سے نکلنے کے بجائے پر کٹے کبوتروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے تو ہم لوگ بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔

ہلکے ہو گئے ہیں، میلے ہو گئے ہیں، پیشانی چھوڑنے لگے ہیں۔ ناک پر چشمہ، منھ میں پان۔ جسم پر سوٹ، ہاتھوں میں کاغذ سنبھالے چھوٹے مائک کے سامنے کھڑے مضمون پڑھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی چٹکیاں بھی لے رہے ہیں اور کڑوے کسیلے فقرے بھی چست کر رہے ہیں۔ انور صدیقی کے جاتے ہی مائک پر عمیق حنفی آ گئے ہیں۔ چھوٹا قد، بھرا بھرا بدن، سانولا رنگ، چہرے پر داغوں کے عدم وجود نے چشمے اور مونچھوں کی موجودگی کو ابھار دیا ہے۔ سوٹ پہنے پان کھائے ہوئے مضمون پڑھ رہے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے کہ شخصیتوں کی تاثیر میں آواز کو کتنا دخل ہوتا ہے عمیق حنفی کو سننا چاہئے۔ وہ اسی وقت تک آرٹسٹ معلوم ہوتے ہیں جب تک ڈائس پر کھڑے ہوں، قدرے ڈھیلی گونجیلی آواز، چہرے کے خطوط کی جنبش اور ہونٹوں کا تحرک سب مل جل کر متاثر کرتے ہیں، یہ تاثر خوش گوار بھی ہو سکتا ہے اور ناخوش گوار بھی۔ اور زعفران زار بھی۔ علی گڑھ میں اقبال پر سمینار ہو رہا تھا۔ حنفی نے مضمون پڑھا۔ سوالات ہو رہے تھے یا اعتراضات جڑے جا رہے تھے کہ وحید اختر نے حسب عادت حنفی پر کوئی فقرہ چست کر دیا۔ حنفی نے انھیں غور سے دیکھا، مسکرائے۔ ڈائس پر آئے۔ ایک کے اسٹینڈ کے اوپر اپنی گردن جھکائی اور وہ فقرے بازی کی ہے کہ توبہ پانچ منٹ تک ہال ہنستا رہا۔ لیکن یہاں بہت سنجیدگی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان کر رہے ہیں۔ جس پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر تعمیری اور تخلیقی ہو تو ادب کے کوچے جھڑتے ہیں اور ادب کے جالے صاف ہوتے ہیں اور اگر تنگ جھگڑے شوق کو انگیز کر لیا گیا تو ادیب بزدل اور ادب کم وقار ہو جاتا ہے۔ چائے کے لئے وقفہ ہوا ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں کہ ایک خاتون نے آداب کیا۔ اور میں شرمندہ ہو گیا کہ میں نے دیکھا کیوں نہیں۔ میں نے سبقت کیوں نہیں کی۔ وہ صالحہ عابد حسین تھیں ہلکے رنگ کی شال اوڑھے کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ علی گڑھ کے ایک لکچرر خاتون کو صالحہ عابد حسین کے دھوکے میں کتنی بار سلام کر چکا ہوں، اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اگر ... نے مجھ سے پوچھا نہ ہوتا کہ آپ نے یہ سلام کس کو کیا ...

تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید محمد عقیل کر رہے ہیں۔ ان کے داہنے ہاتھ پر کمال احمد صدیقی ہیں پریسیڈیم کی دوسری کرسی پر حسن نعیم ہیں۔ کمال احمد صدیقی بھورے اونی سوٹ پر خوب شوخ سرخ رنگ کی ٹائی لگائے بالکل خاموش بیٹھے ہیں، میں نے انھیں بیس سال بعد کسی ادبی جلسے میں شریک ہوتے دیکھا ہے۔ بیس سال پہلے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے سکریٹری تھے اور میں ان کی نیابت کرتا تھا۔ پھر وہ کشمیر چلے گئے جہاں سری نگر ریڈیو اسٹیشن پر ایک عمر گزار دی اور اب تبدیل ہو کر دہلی آ گئے ہیں۔ لیکن ذہنی طور پر کشمیر ہی میں رہتے ہیں۔ غالب پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اور اس کی قیمت پانچ سو روپے رکھی ہے تاکہ عامیوں کے مطالعے اور کج بحثیوں کے مناقشے سے محفوظ رہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کا وطیرہ ہے، کہ جب اپنی عمر تولنے بیٹھتے ہیں تو اتنے کھونڈے پن سے ڈنڈی مارتے ہیں کہ دور سے پکڑ لئے جاتے ہیں۔ ڈنڈی تو کمال احمد صدیقی بھی مارتے ہیں لیکن برعکس یعنی وہ ہمیشہ اپنی عمر بڑھا بڑھا کر بتلاتے ہیں تاکہ مخاطب اگر مہذب ہے تو ان کی بزرگی کے بوجھ کے نیچے کچلا بیٹھا رہے۔ اب ہال بھرنے لگا۔ ڈاکٹر عقیل نے اجمل اجملی کا نام پکارا ہے۔ سمینار کے اہتمام و انصرام کی پیدا کردہ خود فراموشی کا جو حصہ انور عظیم سے بچ رہا ہے وہ ڈاکٹر اجمل اجملی نے سمیٹ لیا ہے ذرا دبا ہوا قد، گندمی رنگ، معمولی جسم، معمولی چہرہ لیکن مجموعی تاثر پر ذہانت کی مہر لگی ہوئی۔ صاف و شفاف اور مضبوط آواز، صیقل کیا ہوا لہجہ، سب کچھ پھیلائے ہوئے، صرف ایک بات گرہ میں باندھے ہوئے کہ سمینار کامیاب رہے۔ مضمون کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلے کو چھوتے ہیں دو ٹوک رائے دیتے ہیں۔ لیکن لہجہ غیر معاندانہ اور الفاظ محتاط ہیں۔ مضمون اور تالیوں کا شور ختم ہوا تو انور صدیقی کا نام پکارا گیا۔ انور صدیقی بھی علی گڑھ کے پرانے پاپیوں میں ہیں۔ لیکن اب جامعہ ملیہ میں انگریزی کے استاد ہیں۔ عمر نے چہرے کے نقوش کا تیکھا پن دھندلا دیا ہے، جیسے تحریر کی روشنائی پھیل گئی ہو۔ لیکن ابھی ہنسی میں تازگی اور قہقہوں میں شادابی باقی ہے۔ بال

"صالحہ عابد حسین کو": میں نے گھبرا کر جواب دیا تھا اور وہ ہنس ہنس کر دوہرے ہوگئے تھے۔ پھر ان خاتون کا انھوں نے غائبانہ تعارف کرایا اور میں دیر تک اپنے آپ پر کڑھتا رہا۔ باہر نکلا تو سہیل صاحب کی شفیق مسکراہٹ سے ملاقات ہوئی۔ میں جسمانی طور پر ان کے پاس کھڑا ہوا باتیں کر رہا ہوں لیکن ذہنی طور پر بہار دلیش کی راجدھانی پٹنہ پہونچ گیا ہوں۔

چمن باغ کی ایک چھوٹی سی کوٹھی کا جو بیں برس تک چرچرا کر کھلا ہے۔ سامنے ہی لوہے کا جھولا کھڑا ہے اس کے پاس سیدھی سبز روش کے کنارے دور تک گلابوں کے تندرست درخت لگے ہوئے ہیں جن میں تھوڑے سے بوڑھے پھول اب بھی روشن ہیں۔ دراندے میں داہنی طرف کھانے کی میز لگی ہے۔ بائیں طرف صوفے کے سامنے کرسیاں پڑی ہیں کہ تمام کمرے بیڈ روم بنے ہوئے ہیں۔ اس مکان کے مکینوں کی اکثریت مہمانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مہمانوں کے نام، عمر اور جنس بدلتی رہتی ہے لیکن مہمان مقیم رہتے ہیں۔ میں بائیں سمت کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں کمرہ خالی ہے، ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ سامنے کا دروازہ بند ہے پھر وہی دروازہ کھلتا ہے۔ دراز قد اختر صاحب غسل کر کے نکلتے ہیں۔ مضبوط جسم نیائن اور تولیہ میں لپٹا ہوا ہے۔ کسی طرف سے ایک نوکر برآمد ہوتا ہے۔ تولئے سے بدن خشک کرتا ہے۔ کرتا پہناتا ہے۔ سر میں تیل ڈالتا ہے۔ اختر صاحب کنگھا کرتے ہیں۔ سرخی مائل گورا رنگ چہرہ دمک رہا ہے۔ پیشانی کی طرف چڑھتے ہوئے درمیان سے منقسم بال چمک رہے ہیں۔ الماری کھلی ہے۔ شیروانی نکلتی ہے۔ اور ان کے جسم پر آجاتی ہے وہ اسی طرح کوئی کاغذ پڑھتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دوست گداز ہاتھ پیچھے سے ان کا پیر اٹھاتا ہے اور جوتا پہنا دیتا ہے، اچانک وہ چونکتے ہیں۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہیں اور باہر نکلتے ہیں جہاں بوندیں پڑ رہی ہیں۔ ٹیکسی واپس کر دی جاتی ہے۔ اختر صاحب مجھے اپنے پاس ہی بٹھا لیتے ہیں۔ آواز دیتے ہیں۔

"تشکیلہ":

اور آپا آجاتی ہیں۔ پورے قد اور بھاری جسم پر سفید سنتھک ساری باندھے ہوئے ہیں جس کے کنارے سنہری ہیں۔ سیاہ چمکیلے گھونگھرالے بال گردن سے اترنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اختر صاحب کو دیکھتی ہیں چہرہ پوچھتا ہے۔ کیا ہے؟ اختر صاحب اخبار پڑھ رہے ہیں۔ پانی تیز ہو رہا ہے۔ وہ بھی بیٹھ جاتی ہیں ان کی قربت سے خلوص اور شفقت کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ وہ پہلے خوب ہنستی ہیں پھر پوچھتی ہیں۔

"ارے ستار ... تم سے کیا پوچھا تھا شفیع جاوید نے؟"

"مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"ہوں ... تو تم نے کیا کہا۔!"

"میں نے کہا کہ میں آپا کے یہاں ٹھہرا ہوں"

"پھر"؟

"پھر انھوں نے پوچھا اختر صاحب کے یہاں۔"

"میں نے کہا نہیں تو ... اختر صاحب بھی آپا کے یہاں رہتے ہیں"

اختر صاحب نے اخبار رکھ دیا ہے۔ اختر صاحب ہنس رہے ہیں۔ ان کی گردن اثبات میں ہل رہی ہے اور نچلا ہونٹ بھیج گیا ہے۔ اور آپا خوب ہنس رہی ہیں۔ اختر صاحب ذرا سا ابھر کر شیروانی اتارتے ہیں۔ ایک طرف سے ایک ہاتھ دراز ہو کر شیروانی تھام لیتا ہے۔ اختر صاحب باتیں کرنا شروع کرتے ہیں۔ نفیس شیریں خیال انگیز باتیں جو میں تین دن سے سن رہا ہوں۔ لیکن کسی کے لئے برائی کا ایک لفظ بھی سننے کو نہ ملا۔ میں اور آپا باری باری بولتے ہیں۔ لان سبز ہو گیا ہے۔ پھولوں کے منہ دھل گئے ہیں۔ پودوں نے نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ سب کتنا اچھا لگ گیا ہے

دفعتاً آپا اٹھتی ہیں اور باورچی خانے چلی جاتی ہیں۔ جب سے میں آیا ہوں۔ آپا صبح سے رات گئے تک باورچی خانے کے چکر لگایا کرتی ہیں۔ احکامات صادر کیا کرتی ہیں اور کوئی درجن بھر آدمی اور عورتیں اور لڑکے گھوم پھر کر باورچی خانے کی خدمت انجام دیا کرتے ہیں۔ اور کھانے کی میز اس طرح سجتی ہے جیسے دولہا کے لئے سجائی جاتی ہے میں انکار کرتا ہوں تو اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ لبریز کر دیتی ہیں'

حبس کو ختم کرنے کے خوف سے میں سوکھ جاتا ہوں۔ آپا آجاتی ہیں ہم لوگوں کی باتوں میں شریک ہو جاتی ہیں۔ پھر کچھ لوگ پھاٹک پر نظر آتے ہیں۔ آپا اندر چلی جاتی ہیں۔ پھر علی گڑھ میں ایک افواہ پھیلتی ہے کہ اختر صاحب سخت بیمار ہیں۔ اور میں تصدیق کے خوف سے خط نہیں لکھتا ہوں۔ پھر تصدیق نامہ آجاتا ہے۔ پھر اطلاع آتی ہے کہ آپا ان کو لے کر علاج کے لئے کینیڈا چلی گئیں۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ کیسے گئی ہوں گی۔ بیمار، نازک مزاج اور آرام طلب اختر صاحب کو کس طرح سنبھالتی ہوں گی کیا کچھ ان پر گزر گئی ہوگی۔ پھر وہ واپس بھی آگئیں۔ صحت یابی کی خبر بھی آگئی اور میں گھومتا گھامتا لکھنؤ پہنچتا ہوں۔ دیکھا چوبی پھاٹک چرچرا کر کھلتا ہے۔ لوہے کا جھولا اسی طرح کھڑا ہے۔ پودے افسردہ، پھول پژمردہ، روشیں کجلائی ہوئی، برانڈے میں داہنی طرف کھانے کی میز بائیں طرف صوفہ، سب کچھ خاموش، اداس گرد آلود۔ میرا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ لیکن میں دائیں کمرے کا دبیز پردہ ہٹا کر اسی بے تکلفی سے داخل ہو جاتا ہوں۔ لمبی چوڑی مسہری پر اختر صاحب پڑے ہوئے ہیں۔ بال بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ رنگ زرد، آنکھیں بند، چوڑی چکلی کلائی پتلی ہو گئی ہے۔ کھال نے گوشت کو چھوڑنا شروع کر دیا ہے میں سہم کر ایک کرسی پر ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ آپا آتی ہیں۔ وہی ہنس مکھ، طرحدار، خوش اخلاق آپا کھڑی ہیں۔ لیکن دبلی اور زرد ہو گئی ہیں۔ وہی خاطر، وہی پذیرائی، وہی مدارات، گویا سب خیریت ہے۔ سب کچھ ویسا ہی جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔ کاش سب کچھ ویسا ہی ہوتا۔

"آخاہ.... انصاری صاحب"۔

سہیل صاحب کی آواز پر میں چونکتا ہوں۔ سامنے حیات اللہ انصاری صاحب ہیں۔ سیاہ اونی کھدر کی شیروانی اور کھدر کے چوڑی دار نے دراز قد اور اونچا کر دیا ہے۔ جسم اور دبیز معلوم ہوتا ہے۔ بجلی سی بے داغ گاندھی ٹوپی کے نیچے مہین کمانی کی عینک لگائے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ میرے آداب کے جواب میں نرم ملائم ہاتھ نے گرمجوشی سے میرا سوکھا ہاتھ دبا دیا ہے۔ سہیل صاحب سے باتیں کر رہے ہیں دیکھنا اور پارلیمنٹ کا سفر کرتی ہوئی بے چاری اردو کے مستقبل تک پہونچ گئی ہیں۔ جو میری آنکھوں کے سامنے پڑا سسک رہا ہے اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہم سے جو خود روٹی اور روزی کے قطروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں آب حیات کی بھیک مانگ رہا ہے۔ قریب نیس کا اشارہ مجھے چھیڑ رہا ہے اور میں عقاوب کا مارا ہوا چپ چاپ کھڑا ہوں۔ پھر یہ دور رس رگ باتوں کی جھونک میں ہال کی طرف مڑ جاتے ہیں اور کوئی میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑا کر چلا جاتا ہے۔ میں چائے پی رہا ہوں اور گزرتے ہوئے چہرے پڑھ رہا ہوں۔ چہرے جو کتابوں سے زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔ پھر انور عظیم کی آواز بلند ہوئی۔ میں بھی ہال میں داخل ہو جاتا ہوں۔ گورے چٹے عنوان چشتی مائک پر ہیں اور پراعتماد انداز میں مضمون پڑھ رہے ہیں۔ سامنے کوثر چاند پوری ہیں جن کی سیاہ شیروانی نے سرخی مائل چہرے کو اور روشن کر دیا ہے۔ عنوان چشتی کے فقروں پر اتنی شفقت سے داد دے رہے ہیں کہ جیسے وہ مقالہ نہیں غزل سنا رہے ہوں۔ میں عابد سہیل اور اقبال مجید کے پاس بیٹھا ہوں اور چپکے چپکے لکھنؤ کے ذکر کی میٹھی اور خوش بودار کھٹیاں کٹکٹا رہا ہوں لکھنؤ.... جس کے نام سے سارے حافظے میں کتنی ہی ہولیوں کا رنگ بکھر جاتا ہے۔ کتنی ہی دیوالیوں کے چراغ منور ہو جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا مغرب حضرت گنج ہے اور مشرق نخاس ہے اور جس کا سنگم امین آباد ہے، بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ لیکن ابھی کچھ باقی ہے، جو مرنے کے انتظار میں زندہ ہے اور لکھنؤ یونیورسٹی جس کا رنگ بدل گیا ہے۔ ریوٹ ہوسٹل جس کی صورت بگڑ گئی ہے جس کی اینٹ جو ٹوٹ ٹوٹ کر گومتی میں بہہ رہا ہے مگر ان سے وابستہ یادیں کہیں جوان زندہ اور جاندار ہیں۔ نخاس سے گزریئے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی گلی سے انیسویں صدی چپکے سے نکل کر کھڑی ہو گئی ہے، اور حضرت گنج میں گھومئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کتنی دور نکل آئے ہیں کوئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کی رسم اجرا کا موقع ہے اور اس کو جلال پاشا کے گھر پر ہنگامہ ہے نگارن .... کرتک نگارن دوسری منزل کے ایک صحن میں کھڑا ہے۔ تخت کے سامنے بچھی ہوئی انواع و اقسام کی کرسیوں کو گھور رہا ہے۔ مردوری منزل کے اس صحن سے کیسی خفیہ ملاقاتوں کی خوابناک یادیں وابستہ ہیں اور کیسی دھواں دھار محفلوں

کی کہانیاں ذہنوں میں آباد ہیں۔ پستہ قد، گول مٹول سُرخ و سفید جمال جہین کمانی اور موٹے شیشوں کا چشمہ لگائے چہرے کو اور بوڑھا بنائے کھڑے ہیں۔ چھدرے چھدرے بال سلیقے سے جمے ہوئے ہیں آنکھیں لطیفے سوچ رہی ہیں۔ ہونٹوں سے ہنسی ٹپکی پڑ رہی ہے۔ قہقہے ابلے پڑ رہے ہیں اپنے آپ پر ہنسنے کا ہنر بھی جمال نے سیکھ لیا ہے۔ اتنی بے نیازی سے دوستوں کا استقبال کر رہے ہیں جیسے دوست ان کے گھر نہیں وہ خود کسی دوست کے گھر آئے ہوئے ہیں پھر مسیح بھائی آ گئے۔ مسیح الحسن رضوی جنھوں نے کئی مشہور کہانیاں تخلیق کی ہیں اور آج بھی چپکے چپکے اچھی اچھی کہانیاں لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ دفتر سے اٹھ کر چلے آئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی نہا کر نکلے ہوں۔ حسب دستور سیاہ .... کمبخت آج تک اسی طرح سیاہ بالوں کے بیچوں بیچ چوڑی چکلی مانگ نکلی ہوئی ہے اور دونوں طرف بال جیسے گوند سے چپکا دیے گئے ہیں۔ دہانے کے دونوں طرف رخساروں کی ہڈیوں تک سرمئی شکنوں کے دوہرے دوہرے بریکٹ اسی طرح لگے ہوتے ہیں۔ بیس سال کی طویل مدت ان کے سر سے گذر گئی ہے اس طرح کہ پیشانی ذرا سا اوپر سرک گئی ہے اور چاند کے ذرا سے بال اڑ گئے ہیں۔ باقی سب کچھ اسی طرح ہے۔ میں ان کے پاس جاتا ہوں اور ادب سے عرض کرتا ہوں۔

"مسیح بھائی ایک بات۔"

وہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور گرمجوشی سے مجھے جمال کے کمرے کی طرف لے جاتے ہیں اور جب تخلیہ مکمل ہو جاتا ہے تو ان کی بڑی بڑی مخلص اور شفیق آنکھیں جن میں ہلکی ہلکی سرخ سرخ دھاریاں پڑی ہوئی ہیں مجھ سے پوچھتی ہیں۔

"مسیح بھائی کیا آپ کا مکان ریفریجریٹر ہے؟"

وہ بڑے زور سے ہنستے ہیں۔ وہی کراری آواز .... وہی بیساختہ قہقہہ۔ میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ پھر سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ کے ساتھ کھنکھنے کی آواز آتی ہے جیسے مہذب لوگ اپنے گھر میں بھی داخل ہونے سے پہلے کھانس کھنکار دیتے ہیں۔ یہ منظر سلیم ہیں۔ شاعر منظر سلیم۔ جنھوں نے اس وقت جب ان کی عمر کے لڑکے یونیورسٹی سے بی اے کرتے ہیں دونوں ہاتھوں سے شہرت سمیٹ لی تھی۔ جنھوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور تجا زیر تحقیقی کام بھی کیا ہے لیکن آج تک شاعری کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ بلکہ اپنی اسی پرانی لیکن مضبوط شہرت پر زندہ ہیں۔ قومی آواز کے دفتر سے سیدھے چلے آ رہے ہیں۔ تھکے ہوئے چہرے پر اس کان سے اس کان تک چھائے ہوئے بالوں کے علاوہ ان کی ناک پر جو اوپر کی طرف ذرا سی اٹھی ہوئی ہے دور سے نگاہ پڑتی ہے۔ گندمی رنگ، یوں ہی سا قد، دبلا پتلا بدن لیکن آنکھیں .... آنکھیں پوری شخصیتوں کے مجموعی تاثر کو چمکا دیتی ہیں لیکن فنکار کی آنکھ شخصیت کو صرف چمکاتی ہی نہیں مستقل بھی کر دیتی ہے۔ لیکن منظر سلیم جب پڑھنے کے لیے چشمہ لگاتے ہیں نگاہ کا ذائقہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ کم لوگ ہوتے ہیں جن پر چشمہ اتنا برا لگتا ہے۔ ان کے پیچھے عثمان غنی ہیں۔ ان کے دونوں "لیبل" ان پر لگے ہوئے۔ بدن پر شیروانی اور ہاتھ میں پائپ۔ مدتیں ہو گئیں کبھی شیروانی اور پائپ کے بغیر نظر نہیں آئے۔ اور شیروانی ان پر چمکتی بھی خوب ہے۔ اس میں دبلے پتلے میانہ قد عثمان کی خطا زیادہ ہے درزی کے ہنر کا قصور کم۔ عثمان کا شمار بھی ادب کے ان عاشقوں میں ہوتا ہے جو خود لکھنے سے جی چراتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی مستعدی یا بے نیازی سے انجام دیتے ہیں گویا لکھنا ان کے مطالعے کی شان کے خلاف ہو۔

اور غالب اکیڈمی کا ہال جیسے اچانک جاگ اٹھا ہے۔ مائک پر نیاز حیدر کھڑے ہوئے اپنی نظم پڑھ رہے ہیں۔ گرج رہے ہیں برس رہے ہیں۔ اور مجھے آج سے پندرہ سال قبل کا زمانہ یاد آ گیا ہے۔ جب اپنی نظمیں سن کر کچھ کرنے اور کچھ کر گذرنے کا جنون طاری ہو جایا کرتا تھا۔ ہمارا احساس بالغ ہو گیا ہے یا مجہول ہو گیا ہے۔ ہال میں داد بھی دی جا رہی ہے۔ سرگوشیاں بھی ہو رہی ہیں۔ باتیں بھی ہو رہی ہیں ناگواری کا اظہار بھی ہو رہا ہے لیکن نیاز حیدر سب سے بے نیاز اپنی آواز کی گونج گرج میں

گم خود اپنے انداز نا الہانہ میں کھوئے ہوئے سناتے چلے جارہے ہیں۔ اب وہ مائک سے ہٹ گئے ہیں کسی سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ بنے بھائی مسکرا رہے ہیں اور سگریٹ پی رہے ہیں۔ قمر رئیس چپ ہیں۔ اجمل اجملی بے قرار ہیں پھر کسی طرف سے انور عظیم آتے ہیں اور تندی سے اعلان کرتے ہیں۔

"نظم اپنے آپ میں کیسی بھی ہو ہمیں اس سے بحث نہیں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس کے سنانے کا یہ موقعہ و محل نہیں تھا۔"

بحث جسے نظم نے پٹری سے اتار دیا تھا ایک بار پھر پٹری پر چڑھا دی جاتی ہے۔ حیات اللہ انصاری صدر کی اجازت لیکر ڈائس پر جاتے ہیں۔ اور جلد ہی تقریر ادبی میزان و معیار سے گزر کر سیاست کے نازک معاملات میں داخل ہو جاتی ہے۔ بعض جوشیلے نوجوان اس تقریر کو نظم کا ردِ عمل سمجھ کر سننے پر آمادہ نہیں نظر آتے ہیں۔ اور انصاری صاحب ناگواری سے ڈائس چھوڑ کر چلے آتے ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا ہر شخص کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ رہا جواب تو اس محفل میں ایسا کون ابوالکلام ہے جس کا جواب بن نہ پڑے۔ محفل کا رنگ ذرا مکدر ہو گیا ہے۔ صدر ڈاکٹر عقیل بڑی احتیاط اور صلابت استقلال سے پریسیڈیم کا وقار محفوظ رکھتے ہیں۔ ڈائس پر آنے والوں کی پانچ منٹ میں اپنی بات نافذ کرتے ہیں۔ اب تقریریں تند اور تیز اور طویل ہونے لگی ہیں۔ اور ڈاکٹر عقیل ہر تقریر کے بعد پابندیِ وقت کے احترام کی ہدایت کرتے ہیں۔ میں صرف ڈاکٹر عقیل کو چھیڑنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور ڈائس پر پہونچتے ہی عرض کرتا ہوں۔

"جناب صدر۔۔۔ کل جب میں اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر آج آپ بیٹھے ہوئے ہیں تو میں نہ کسی کو ڈائس پر آنے سے باز رکھا تھا اور نہ کسی کو اپنی بات ختم کئے بغیر چلے جانے کی ہدایت کی تھی۔"

اور ڈاکٹر عقیل نے تڑ سے جواب دیا ہے۔

"قاضی صاحب میری مجبوری وقت کی کمی ہے۔"

بحث پھر شروع ہو گئی ہے۔ اس سیمینار میں بھی بعض حضرات نے علامت نگاری کا ذکر خیر اس طرح کیا ہے جیسے علامتیں نہ ہوئیں جلیبیاں ہو گئیں کہ جس حلوائی کا جی چاہے کڑھاؤ چڑھا کر تلنے لگے۔ علامتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک اجتماعی دوسری انفرادی۔ اجتماعی علامتیں وہ ہوتی ہیں جو صدیوں کی مدت میں زبانوں کے چاک سے اترتی ہیں اور جنھیں ہم صبح سے شام تک استعمال کرتے ہیں جیسے صلیب سونا اور ترازو وغیرہ۔ دوسری قسم کی علامتیں انفرادی ہوتی ہیں جنھیں فنکار اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے تخلیق کرتا ہے۔ جیسے شاہین۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اجتماعی علامتوں کے خزانے میں سے کسی ایک علامت کو چن کر کوئی فنکار اپنے رنگ و روغن کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ اجتماعی ہونے کے باوجود انفرادی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ علامت کے نام پر ایک چڑیا کی تخلیق کے لیے علم کا ایک پہاڑ عبور کرنا پڑتا ہے الفاظ کا ایک جنگل کھوجنا پڑتا ہے۔ قدرتِ بیان کا ایک صحرا چھاننا پڑتا ہے نہ صرف یہ بلکہ علامت کے گرد بُنے ہوئے ادب پارے کو دوہری سطحوں پر معانی کا ابلاغ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ جب کہ اس افراتفری کے زمانہ میں یہ ہو رہا ہے کہ بے مغز، گنجلک اور کاواک تحریروں کی کم مائگی کو چھپانے کے لیے علامت نگاری کا زریں غلاف ڈال دیا جاتا ہے۔ اور یہ کرتے ہوئے علامت اور استعارے کے فرق کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ استعارے سے علامت تک کا سفر اتنا دشوار ہے کہ بڑے بڑے قادر الکلام بھٹک جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جو محض بے داغ نثر کا ایک صفحہ لکھنے سے عاجز ہیں علامتوں کی جلیبیاں اتار رہے ہیں۔ تاہم افسانوی ادب میں علامت نگاری کا ہنر دیکھنا ہو تو "زرد کتا" "بادل" "وہ" "ہڈیاں کھانے اور دودھ بھیگے ہوئے لوگ" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تجریدی ادب کا بھی ذکر اذکار ہوا۔ یہ سچ ہو کہ تجریدی مصوری کی کامرانی نے تجریدی ادب کی تخلیق میں کارِ نمایاں انجام دیا مغرب کی اس روایت بالغ اور شاندار روایت کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے

پہلے ہمارے قلم کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ رنگ بولتے نہیں ہیں۔ suggest کرتے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں۔ اور یہ اشارے ہماری تخیل کو مصوری کی منزل تک پہنچانے کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتے ہیں۔ یہ تو پتہ ہے کہ رنگ بولتے نہیں جب اشارے کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ رنگ سے منسوب اشارے کی پشت پر صدیوں کی تاریخ اور تہذیب اور روایت کا سایہ ہوتا ہے۔ اور مصور کے بنائے ہوئے یہ "رنگ پارے" پورے کے پورے رنگ پارے ہماری نگاہ کے دائرے میں محصور ہوتے ہیں اس لئے بھی رنگوں کے سہل اشارے تک مبہم اور واضح اشاروں کی معیت میں مہمل نہیں رہتے اور تخیل کو مصور کے معانی تک کسی نہ کسی طرح گھسیٹ لے جاتے ہیں لیکن لفظ بولتا ہے۔ ہر لفظ بذات خود ابلاغ کی اکائی ہوتا ہے۔ اور جس کے وجود پر معانی کی مہر لگی ہوتی ہے اور جس کے وجود کا دار و مدار ہی معانی کے ابلاغ پر ہوتا ہے۔ یعنی لفظ ابلاغ کرتا ہے۔ ابلاغ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ہر "ادب پارے" کو ابہام کی ساری نزاکتوں سے عرفان اور احساس کی لطافتوں کو لفظوں میں ترجمہ کرنے کی تمام دشواریوں کے باوجود معانی کا ابلاغ کرنا پڑے گا۔ ایک تجریدی لفظ پارے کی دشواری یہ ہوتی ہے کہ وہ رنگ پارے کی طرح پورے کا پورا یہاں سے وہاں تک۔ دراصل ہماری ایک نگاہ کی گرفت میں نہیں آتا۔ جبکہ ہر رنگ پارہ آ جاتا ہے۔ ہم لفظوں کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں اور فقروں کی سیڑھیاں طے کرتے معانی کی سمت چلتے ہیں۔ اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسی تلاش کرتے رہتے ہیں اور اس طرح جب تھوڑی دور نکل آتے ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے اشارے جو اگر مہمل نہیں تو ابہام اور اہمال کے خطِ تقسیم پر کھڑے ہوتے ہیں یادداشت کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور آخری سیڑھی تک پہنچنے کے باوجود ہم کو وہ پُر مغز اور خیال افروز یا زندہ معانی نظر نہیں آتے۔ ادب پارے کے خالق کا معرکہ دشوار ہو جاتا ہے اور اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ ادب پارے کی تخلیق کے وقت رنگ پاروں کی تکنیک کے نقشِ قدم پر آنکھ بند کر کے چلنے سے گریز کرے۔ اور خود کوئی ایسا راستہ دریافت کرے جو ادب پارے کی پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک اشاروں کا ایسا سلسلہ قائم کر دے کہ آخری سیڑھی کے ختم ہوتے ہوتے منزل یا معانی کی تصویر کا ابلاغ ہو جائے۔ ایک بات اور۔ لفظ بولتا تو ہے۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ لفظ زبان سے جتنے معانی کا ابلاغ کرتا ہے اس سے زیادہ معانی کے ابلاغ کا اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس لیے بھی لفظوں کے مصور کا کام دشوار ہو جاتا ہے۔ اور مزید احتیاط لازم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہنر بھی علامت نگاری ہی کی طرح بڑے ریاض کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

جدیدیت کا بھی اس زمانے میں بہت نام لیا گیا ہے اور اس سیمینار میں بھی ذکر کیا گیا۔ اس تمغے اور تازیانے سے بھی وہی کام لیا گیا ہے جو ترقی پسند تحریک کے عہدِ عروج میں بعض متعصب ترقی پسند نقادوں نے سماجی شعور سے لیا تھا۔ یعنی جس ادیب سے ذاتی چشمک ہو گئی اس کے فن پارے سماجی شعور سے عاری قرار دیدیے گئے اور اس کے غیر محفوظ بدن پر سماجی شعور ایک تازیانے کی طرح برسنے لگا اور جس ادیب کو ذاتی تعلقات کی بنا پر نوازنے اور سرفراز [illegible] تو اس کی تحریر یا چاہے کتنی ہی گئی گذری کیوں نہ ہوں ان پر سماجی شعور کی مہر لگا دی گئی۔ سینے پر تمغہ سجا دیا گیا اور صفِ اول کی وہ کرسی جو ہوا میں معلق تھی اس کے نام معنون کر دی گئی۔

ہوا یہ ہے کہ پچھلے بیس تیس برسوں میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو کی کلاسوں پر تنقید چھائی رہی ہے۔ تنقید۔۔ اس سکہ بند تنقید کے کوئی ایک ایک ہنر ہے ایک پینترہ ہے۔ عام طور پر یہ ہنر یہ برتا جاتا ہے کہ مغرب کی تنقیدی کتابوں سے نظریاتی تنقید کو نکال کر اپنے الفاظ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ ایک سی کتاب یا متعلق جلتی اصنافِ سخن کے فنکاروں کے متعلق جو کچھ درج ہے اسے بھی ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو خیریت رہی ہے مصیبت اس وقت آتی ہے جب مغربی تنقیدی کتابوں میں نظریوں اور اصولوں اور نتیجوں کی وضاحت کے لیے اسی زبان کے فنکاروں کے کارناموں سے مثالیں دی جاتی ہیں اس لئے کہ اصل تو وہ تخلیقات ہی نہیں

پڑھی گئیں اور اگر پڑھ بھی لی گئیں تو وہ فنی اور ادبی خصوصیات اسی رنگ و آہنگ کے ساتھ اپنی زبان کے فنکاروں پر کس طرح تھوپ دی جائیں۔ یہی بنیادی سبب ہے کہ ہماری تنقید کا بیشتر سرمایہ نظریاتی تنقید کے حجم پر مبنی ہے۔ عملی تنقید اس سطح اور اس انداز کی عملی تنقید بھی زیادہ محنت زیادہ ذہانت اور زیادہ بصیرت مانگتی ہے۔ اسی لئے کمبخت نظر انداز کر دی گئی اور بیشتر یہ ہوا کہ مغرب کے نقادوں یا اپنی ہی زبان کے مرحوم و مغفور نقادوں یا کم نام" اور کم یاب نقادوں کے تاثرات و فرمودات کو اپنی تحریر میں اس طرح ہضم کر لیا گیا ہے کہ جب تک بال کی کھال نہ نکالی جائے نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔

اس آفتِ سماوی نے اردو ادب کو بہت نقصان پہونچایا۔ پہلا نقصان یہ ہوا کہ تنقید کو تخلیق پر برتری حاصل ہوئی۔ اور یہ برتری ایک ادبی فریضے کی طرح تسلیم کرائی گئی۔ دوسرے نقصان کا بیان ذرا تفصیل طلب ہے۔ یعنی فرض کیجئے کہ ایک طالب علم نظم یا غزل یا افسانہ تخلیق کرتا ہے اور یہ تخلیق دوسرے درجہ کی ہوتی ہے کہ عام طور پر طالب علم زیادہ سے زیادہ دوسرے ہی درجے کی تخلیق پر قادر ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرا طالب علم ہے جو چوتھے درجے کی تنقیدی مضمون لکھتا ہے۔ تو سربراہانِ شعبہ جنھیں تنقید پڑھنے کا شوق ہے، (اور اگر اس شوق کا بھی ذرا دقت نگاہی سے تجزیہ کیا جائے تو مجبوری پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شعر کہا تو قبولیت نہ ملی اور افسانہ لکھا تو شہرت نہ ہوئی اور تنقید لکھی تو کچھ نہ کچھ چل نکلے) اُدھر اگر اس دوسرے طالب علم کے چوتھے درجے کے تنقیدی مضمون پر اپنے سر کی خسروانہ جنبشوں کی بارش فرما دیں گے۔ اور وہ ساری سہولتیں جو ان کے جنبشِ قلم کی مرہونِ منت ہیں اسی طالب علم پہ صرف ہو جائیں گی اور وہ طالب علم جو دوسرے درجہ کی نظم یا غزل یا افسانے کی تخلیق کے مرتکب ہوئے تھے اپنے جرم سے تائب ہو کر تنقید نگاری کے "تورِ تنور" میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ شہر میں منٹو یا جوش وارد ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صف اور سطح کے فنکار ان سربراہانِ شعبہ کے مربیانہ سلوک کو بجا طور پر انگیز نہیں کر سکتے تو پھر یہ فنکار کسی حد تک ان تمام طالب علموں کی نظر میں جو سربراہانِ شعبہ کی لئے کے یقیناً زیر اثر ہیں ہیچ ہو جائیں گے۔ اب انھیں کے مقابلے میں وہ لوگ شہر میں نازل ہوتے ہیں جو لفظوں کی تجارت کرتے ہیں جو حصولِ استناد کی جستجو میں ستو باندھ کر نکلتے ہیں اور سربراہانِ شعبہ کی خدمت میں ہدیۂ نیازمندی پیش کرتے ہیں اور بدلے میں تحسین و ستائش کا بمقدارِ ضرورت حصہ پا کر نہال ہو جاتے ہیں پھر وہی طالب علم ان کی جھوٹی ادبی اہمیت کے جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ گرفتاری قیدِ عمر سے بھی منسلک ہو سکتی ہے۔

طالب علم بڑی حد تک مجبور ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا مسئلہ امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ڈویژن حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ خود و نمائش کے چھوٹے بڑے جلسوں میں نمایاں ہونا ہوتا ہے۔ چوتھا مسئلہ معاشی امداد کا حصول ہوتا ہے اور پانچواں اور آخری مسئلہ ملازمت کا پروانہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ اور ان پانچوں سوالات کا واحد جواب سربراہانِ شعبہ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتا ہے۔ اب طالب علم جس کے ذہن کی تختی عام طور پر سادہ ہوتی ہے اور نہ سر پھرا نہیں ہوتا تو کچھ لاشعوری طور پر اور بہت کچھ شعوری طور پر اس سادہ تختی کو سربراہانِ شعبہ کی لرزشِ ابرو کی تحریروں سے سیاہ کر لیتا ہے۔

چونکہ اسے تنقید لکھنے کا شوق ہوتا ہے اس لئے اپنے ہی جیسے بھولے بسرے ٹوٹے پھوٹے لکھنے والوں کو جہاں تہاں سے گھیر گھار کر اپنے ارد گرد جمع کر لیتا ہے اور اپنے طالب علموں کے ہجوم میں ان کی تعریفوں کے ڈونگرے برسانے کے بیج بوتا ہے اور جب خود اپنے ہم پیشہ لکھنے والوں کے شہروں میں نزول اجلال فرماتا ہے تو اپنی تعریف کی پوری پکی ہوئی فصل تیار پاتا ہے۔

نصابات میں "تنقید" اتنے دروازوں سے چور دروازوں سے اور اتنی بڑی مقدار میں داخل کر دی جاتی ہے کہ نہ صرف تخلیق کچل جاتی ہے بلکہ سچ یہ ہے ہماری اردو کے پاس جو کچھ بھلی بری واقعی تنقید ہے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ صفِ اوّل کے فنکاروں کے

کارناموں سے زیادہ ان پر لکھی ہوئی دوئم اور سوئم درجے کی تنقید کو اتنی صناعی اور مہارت سے اہمیت دی جاتی ہے کہ گرفت نہیں کی جا سکتی۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غالبؔ کے اشعار کے معنی طالب علم نہیں جانتا حالیؔ اور بجنوری نے کیا لکھا ہے اس کا اس بچارے کو علم نہیں لیکن استاد کے مضمون پچے میں غالبؔ کے سلسلے میں کیا درج ہے اسے منھ زبانی یاد ہے اس لیے کہ ڈویژن اسی طرح بنایا جاتا ہے۔ نصابات میں تنقید کے حجم کی اہمیت پر جو اس قدر زور دیا جاتا ہے اس میں یہ نکتہ پیشِ نظر رہتا ہے کہ تنقیدی کتابوں اور مضامین کے کثیر اندراجات کے چور دروازوں ہی سے اپنی کتابوں اور مضامین کا داخلہ کرایا جا سکتا ہے نہ صرف یہ بلکہ انھیں مار مار کر حفظ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ طالب علم حالیؔ، شبلیؔ، سرسید، محمد حسین آزادؔ اور عبدالرحمٰن بجنوری کے کارناموں کے متنی مطالعے کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ ان کے اندازِ تحریر، طرزِ استدلال اور علم و فضل سے بے نصیب رہا لیکن اُسے سربراہانِ شعبہ کی کج مج آرائیوں کے از بر کر لینے کی محنتِ فضول کا متحمل ہونا پڑا۔

ادبی تحسین کی مبادیات کی طرف ان کا رویہ کچھ اس طرح کا رہا جیسا قرونِ وسطیٰ میں مہا پنڈت کا سنسکرت کے سلسلے میں رہا کرتا تھا۔ اوّل تو معاملہ گول رکھا جائے اور اگر کچھ ارشاد بھی فرمایا جائے تو اس درجہ ادق اور ناقابلِ فہم ہو کہ سننے والے اپنا سر اور دوسروں کے زانو پیٹتے رہیں اور قدم قدم پر ان کے ارشاداتِ گرامی کے لیے گوش بر آواز رہیں اور جو کچھ سماعت کی جھولی میں گر پڑے اسے ذہن کے بازو پر تعویذ کی طرح باندھ لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کا عام معمولی طالب علم موٹی موٹی اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے میں اس عجز کا مرتکب ہوا جو شریعتِ تعلیم میں کفر کے مصداق ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اصطلاحات کی تعریف میں ایسے مغلق انداز اور ایسے ادق الفاظ کا استعمال کیا گیا کہ اچھا خاصا ذہین طالب علم ذرا سی بوند میں چکمہ کھا گیا۔ کل سماجی شعور کی گنجلک تعریف کر کے مثالیں عام طور پر ایسے ادب پاروں سے دی گئیں جن کا ادب

ہونا ہی مشتبہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ سب کچھ سیاسی نہیں ذاتی مصالح کی بنا پر ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ تو ہوا اور ہمارے ہاتھوں ہوا جو خیر سے اردو کے استاد تھے یا ہیں لیکن اس طریقۂ کار کو آج وہ لوگ بھی برت رہے ہیں اور اس سے زیادہ شدّ و مد سے برت رہے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اردو کے استاد نہیں ہیں بلکہ اردو کے استادوں کی اس روش قدیم کے سخت مخالف بھی ہیں۔ آج بھی جدید حسیت کی مبہم تعریف کے بعد مثالیں ایسے نثر پاروں اور شعر پاروں سے دی جا رہی ہیں جن میں اور ادب میں وہی رشتہ ہے جو ہم میں اور بابا آدم میں ہے۔ اگر سیاسی معاشی اور سماجی اور عمرانی شعور بالغ ہو چکا ہے تو جدید حسیت ایسی کہاں کی عنقا ہے کہ کسی طرح دسترس ہی میں نہ آسکے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ ہزاروں میل پر پھیلے ہوئے اس ملک کے دو حصوں میں دو براعظموں کا فاصلہ موجود ہے۔ سیاسی پرچم کی پرچھائیں کہیں لانبی ہے کہیں چھوٹی۔ سماجی فلاح کے قافلے کہیں ڈیرہ ڈالے پڑے رہے اور کہیں صرف ان کا شور پہونچ سکا۔ بعض مخصوص اسباب کی بنا پر بعض مقامات پر اقتصادی و معاشی ترقی زمین سے پھوٹی ہے اور آسمان سے برسی ہے۔ اور بعض مقامات پر حسبِ دستور پشتہا پشت سے انسان ایک وقت کی روٹی کے لیے جانور پر رشک کر رہا ہے۔ اسی ہندوستان میں کلکتہ بمبئی دہلی اور مدراس موجود ہیں اور ان کے مقابلہ میں لکھنؤ پٹنہ بھوپال اور سری نگر آباد ہیں۔ پھر اسی ہندوستان میں وہ سیکڑوں شہر ہیں جو اضلاع کے صدر مقام ہیں اور اسی ہندوستان میں قصبات و دیہات کے علاوہ ایسے ہزاروں گاؤں موجود ہیں جو ترقی پذیر ہندوستان کے نقشے پر ایک نقطے کے بھی حقدار نہیں۔ کیا جدید حسیت کا کوئی ایک ایسا پیمانہ وضع کیا جا سکتا ہے جو بمبئی سے کرما پور تک کے تمام کرداروں کی تخلیق کی گہرائی اور گیرائی کو ناپ سکے۔ ایک صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ جو شخص بمبئی میں نہیں رہتا وہ جدید نہیں ہو سکتا دوسرے کو حق پہونچتا ہے کہ وہ اعلان کرے کہ جو شخص بھلائی اور درگا پور میں نہیں رہتا وہ جدید نہیں ہو سکتا۔ تیسرے کو یہ حق دیا جانا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جدید حسیت کا واحد نمائندہ قرار دے

ڈالے کہ وہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے جہاں آج تمام مکان پختہ ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام دعوے ہیچ ہیں۔ بے معنی ہیں سوال یہ ہوتا ہے کہ فنکار نے اپنے کرداروں کی تخلیق کے پس منظر کے لیے کس علاقے کا انتخاب کیا ہے۔ پھر اس علاقے کے کس کلاس یا طبقے کو منتخب کیا ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی کردار ادب میں پیش کیا جاتا ہے اور وہ "فینٹسی" کا کردار نہیں ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی locale علاقہ بھی ہوگا اور کوئی نہ کوئی کلاس بھی ہوگا۔ اس چھان بین کے بعد یہ پرکھنا چاہیے کہ بمبئی یا لکھنؤ یا سیتاپور یا کرناپور کے پس منظر میں اور اس منتخب شدہ کردار کی روشنی میں تجربے اور مشاہدے اور مطالعے کی پیش کش پر جدیدحسیت کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر ہوتا ہے تو کرناپور کا کردار بھی جدیدحسیت کا حامل ہوگا اور اگر نہیں ہوتا تو بمبئی کا کردار بھی جدیدحسیت کی دولت سے عاری ہو جائے گا۔

اگر ہم تنقید کرتے وقت اس دروں بینی اور ژرف نگاہی کا ثبوت نہیں دیتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم جدیدحسیت کے نام پر لکھنے والوں کو موضوعات کے انتخاب کے سلسلے میں آمرانہ احکامات دے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں حکم دے رہے ہیں کہ یہ لکھو اور یہ نہ لکھو۔ اور یہی وہ فاش غلطی ہے جس نے ترقی پسند تحریک کی عظیم دیوار میں رخنے ڈال دیے۔

کسی مقرر کی تند و تیز آواز نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ وہ ڈائس پر کھڑے ہوئے گرج رہے ہیں۔ اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت میں اپنے آپ سے گزرے جا رہے ہیں۔ اور مجھے علیگڑھ کا وہ سیمنار یاد آ رہا ہے جو ابھی حال ہی میں اقبال کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ اور جس میں دو مقالے اردو تنقید کی عام ڈگر سے ہٹ کر پڑھے گئے تھے۔ ایک پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا مقالہ جس میں اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا تھا اور دوسرا اولاد احمد صدیقی کا مضمون جس میں اقبال کے معاشی نظریے کی وضاحت کی گئی تھی۔ ظاہر ہو کہ اولاد احمد صدیقی کے اس مضمون پر بحث کی گنجائش کم تھی کہ اقبال کے کلام اور معاشیات دونوں سے یکساں واقفیت عام نہیں ہے لیکن

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے مقالے پر کچھ ٹیڑھے ترچھے سوالات ہوتے۔ اور جب آخر میں وہ جواب دینے اٹھے تو پانسہ پہلو بدلنے لگا۔ کہ اسلوب صاحب انگریزی ادب کے پروفیسر ہیں۔ ادب کی تدریس اور تنقید میں ایک عمر گذاری ہے دیکھیے جوابی تقریر میں کیا کچھ گلفشانیِ گفتار کا تماشہ ہوتا ہے۔ اسلوب صاحب گلے تک شیروانی کے بٹن بند کیے۔ چھوٹے چھوٹے سہمے تلے قدم رکھتے مائک پر آئے۔ شیریں لہجے اور مدھم آواز میں مسکرا مسکرا کر شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مقالے کو اتنی توجہ سے سننے کی زحمت گوارہ فرمائی اور یہ بھی کہ جب مقالہ شایع کیا جائے گا تو ان اعتراضات کا خیال رکھا جائے گا۔ اس طور پر اور اس خوبصورتی سے ہماری ذہنی تربیت کر گئے کہ ہم کچھ حیران سے ہو کر رہ گئے۔ میرا خیال ہے کہ اسلوب صاحب کا یہ انداز انگریزی زبان و ادب کی صحت مند تنقیدی روایت کے عرفان کی دین ہے۔ اس لئے کہ فکشن ہی کے سیمنار میں جب پروفیسر سلامت اللہ خاں اور ڈاکٹر یاسین صدیقی نے اپنے مقالے پڑھے اور دوبارہ جواب دینے ڈائس پر آئے تو محسوس ہوا جیسے ان حضرات کو دوسروں کے اعتراضات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کی فکر ہے۔ اسی طرح ایک اور سیمنار یاد آ رہا ہے جو شعبۂ ہندی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ افسانے کا اجلاس تھا شعبۂ ہندی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر ہربنس لال شرما نے مہمان پروفیسر ڈاکٹر نگیندر صدر شعبۂ ہندی دہلی یونیورسٹی سے گذارش کی کہ وہ اجلاس کی صدارت کریں۔ ڈاکٹر نگیندر ڈائس پر جانے کے بجائے مائک پر آئے۔ ڈاکٹر شرما کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہندی کے افسانوی ادب پر مجھے وہ ماہرانہ دسترس حاصل نہیں ہے جو اس اجلاس کی صدارت کے لیے ضروری ہے اس لئے میں کرسی صدارت پر بیٹھنے سے معذور ہوں۔ کتنے ہی سیمنار میں شرکت کا موقعہ ملا لیکن کبھی اردو کے کسی پروفیسر کسی نقاد نے اس بلند نظری کا اظہار نہیں کیا۔ جب کسی کو جس کسی اجلاس کی صدارت کے لیے یاد کیا گیا وہ اس تمغہ سے کرسی صدارت پر متمکن ہو گیا کہ

گویا یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ اور نثر و نظم کی تمام اصناف کاظم و فسو راحمد کے نمونوں میں گرداں ہے۔ کاش ہم کو بھی اپنی لاعلمی اپنی کم علمی کے اقرار کی سعادت نصیب ہو سکتی۔

دو بج رہے ہیں۔ اور صدر اجلاس اپنا خطبہ دے رہے ہیں۔ اور پورا ہال خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ بنے بھائی اور قرۃ العین اور انور عظیم اور راجندر سنگھ بیدی سب کے چہروں پر کامیابی اور طمانیت کی یکساں عبارت دور سے پڑھی جا سکتی ہے۔ اجلاس کے اختتام کا اعلان ہو چکا ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں کچھ جا رہے ہیں کچھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ روزن لئے لئے ہیں کہ کھانا کھانے کے بعد آئندہ کی کارکردگی پر گفتگو ہوگی۔ لائحہ عمل مرتب ہوگا۔ رتن سنگھ آ گئے ہیں ان کی سفید پگڑی اور کھچڑی داڑھی دور سے چمک رہی ہے۔ بلراج مینرا عمیق حنفی سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور میں سجاد ظہیر کے پاس کھڑا ہوں مگر انھیں دیکھ نہیں رہا ہوں۔ یہ کہاں معلوم تھا کہ بنے بھائی سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔ کاش میں مینرا کے ساتھ جانے کے بجائے بنے بھائی کے ساتھ چلا جاتا۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس اور بیٹھ لیتا۔ تھوڑی دیر ان کو اور سن لیتا تھوڑی دیر ان کو اور دیکھ لیتا کاش......

علمی ادبی کتب

مطالعۂ داغ	ڈاکٹر سید محمد علی زیدی	۲۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۱۰/۵۰
شرح بال جبریل	یوسف سلیم چشتی	۱۴/-
شرح ضرب کلیم	" " "	۱۲/-
مقدمہ شعر و شاعری	حالی	۲/۴۰
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم	۶/۵۰
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	۱۲/-
تنقید کے بنیادی مسائل	" " "	۶/۵۰
فن سوانح نگاری	ڈاکٹر امیر اللہ شاہین	۴/۷۵
اردو غزل ولی تک	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۴/۲۵
اردو ادب کی ایک صدی	ڈاکٹر سید عبداللہ	۶/-
باغ و بہار	مرتبہ رشید حسن خاں	۷/۵۰
ہماری تہذیبی میراث	سفارش حسین رضوی	۶/-
ہندی کی نئی ڈکشنری	قیام حسین جاکلی	۴/۵۰
دکنی کلچر	پروفیسر شیروانی	۲/-
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا آزاد	۴/-
نیا افسانہ	وقار عظیم	۶/-
جدید شاعری	عبادت بریلوی	۲۰/-
نکات مجنوں	مجنوں گورکھپوری	۷/۵۰
کاروان معیشت	نجم الدین شکیب	۶/-
اردو صرف و نحو	مولوی عبد الحق	۱/۲۵
اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر	ڈاکٹر تارا چند	۹/۵۰
فریب تمدن	اکرام اللہ	۱۰/-
حیات سعدی	حالی	۳/۲۵
محاکات العروس	ترجمہ/ڈاکٹر بہرام	۹/۵۰
جدید اردو لسانیات	ڈاکٹر امیر اللہ شاہین	۵/۵۰

نکات غالب	نظام الدین	۲/۵۰
تاریخ فلسفہ اسلام	ڈاکٹر عابد حسین	۶/۵۰
تاریخ فلسفہ سیاست	محمد مجیب	۱۸/-
قصیدہ نگاری کا جائزہ	ڈاکٹر محمود الٰہی	۱/۲۵
سیرت اقبال	عطا فاروقی	۱۵/-
فکری زاویے	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۴/۵۰
فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ	سید ضمیر حسن	۳/-
شعرائے اردو کے تذکرے	ڈاکٹر سید عبداللہ	۴/-
آب حیات کا مطالعہ	سید مسعود حسن رضوی	۳/۵۰
شرح دیوان غالب	حسرت موہانی	۵/-
غالبیات	عبد القوی دسنوی	۷/-
نقطۂ نظر	عبد المغنی	۵/۷۵
ہمارا قدیم سماج	سید سخی حسن نقوی	۱۰/-
غزل اور مطالعۂ غزل	عبادت بریلوی	۲۰/-
انقلاب ۱۸۵۷	پی سی جوشی	۱۴/۷۵
غبار خاطر کا مطالعہ	ملک زادہ منظور احمد	۳/-
آزاد الہلال کے آئینے میں	" "	۴/-
حسرت موہانی حیات اور کارنامے	ڈاکٹر احمد لاری	۲۰/-
تذکرۂ شعرا		۸/-
آب حیات	تلخیص احتشام حسین	۶/۷۵
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین	۱۲/۵۰
تجزیے	ڈاکٹر گیان چند	۱۱/-
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۸/-
طنزیات و مضحکات	" "	۹/-
گنجہائے گراں مایہ	" "	۴/-
شاہکار احتشام نمبر		۵/-

رموز ادب	مہ لقا اعجاز	۵/-
اسلام کی اخلاقی تعلیمات	رشید الوحیدی	۹/۵۰
آپ سے ملیے	علی جواد زیدی	۳/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین	۲/-
چند ہم عصر	مولوی عبد الحق	۲/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	۴/-
اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	۶/-
منور لکھنوی شخصیت شاعری	راج نرائن راز	۷/۵۰
مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلے	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
انشاء اللہ خاں انشا	اسلم پرویز	۴/-
ادب اور نفسیات	دیویندر اسر	۳/۵۰
محاسن کلام غالب	عبد الرحمٰن بجنوری	۱/-
دوش و فردا	مجنوں گورکھپوری	۹/۵۰
تنقید شعر	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	۴/-
کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	خلیق نارنگ	۴/-
آب حیات	مولانا آزاد	۷/-
چند تصویر بتاں	شمیم احمد	۴/۲۵
حیات غالب	شیخ محمد اکرام	۳/-
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	۵/۷۵
تیشۂ نظر	ابو الفیض سحر	۵/-
بیان غالب	آغا محمد باقر	۱۰/۵۰
اشخاص و افکار	ضیاء الحسن فاروقی	۶/۵۰
مطالعہ	ذکی کاکوروی	۴/-
اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ	گنپت سہائے	۱۰/-
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں	ڈاکٹر سالم قدوائی	۱۴/-
دو صورتیں الٰہی	مالک رام	۱۰/-

نصرت پبلشرز۔ کپور مارکیٹ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ ۳

ہری شنکر پرسائی

ترجمہ: نقوی امام

مڈیکل طلاح، املی چٹی۔ مظفر پور (بہار)

دوسرا فرہاد

یہ ابھی حال کی بات ہے۔ ایک بادشاہ تھا۔ جس کی لڑکی شیریں بے حد خوبصورت تھی۔ فرہاد نام کا ایک لڑکا اس سے محبت کرنے لگا تھا کیونکہ اس نے لیلیٰ مجنوں کا قصہ سن لیا تھا (جس نے قصہ سن لیا وہ عاشق ہو جاتا ہے)۔

فرہاد بادشاہ کے پاس شیریں سے شادی کرنے کی درخواست کرنے پہنچا۔ اس وقت وہ ایک نہر کا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے فرہاد کی بات سنی اور کہا — اور برخوردار! میں اس وقت بچبالہ منصوبہ میں غرق ہوں۔ دیکھو یہ نہر کھدوانی ہے۔ اسے کھدوانے سے بہت بڑے علاقے میں آب پاشی ہوگی اور غلہ کا قحط نہیں رہے گا۔

فرہاد نے نادران لاکو متاثر کرنے کے لیے کہا — ڈیڈی یہ کیا ہائیڈرو الیکٹرک پروجکٹ ہے یا ...؟"

بادشاہ نے کہا۔ "نہیں بیٹا صرف نہر کھودنا ہے جو بھی یہ کھودوائے گا اسی سے میں شیریں کی شادی کر دوں گا۔

فرہاد نے کہا — مجھے یہ شرط منظور ہے۔ میں ایک سال میں نہر بنوا دوں گا۔ یقین ہے تب تک شیریں کسی آوارہ کلاس فیلو کے چکر میں نہیں پڑے گی۔

بادشاہ نے کہا — تم بے فکر رہو۔

فرہاد نے لوٹ کر ایک ٹھیکیدار کو بلایا اور نہر کھودنے کا ٹھیکہ دیدیا اور کہا — روپے جتنے چاہو لو مگر سال کے اندر نہر تیار ہو جانی چاہیے۔

ٹھیکیدار نے کام شروع کر دیا۔ ادھر فرہاد نے شیریں کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ سال بیت گیا۔ فرہاد نہر دیکھنے نکلا۔ نہر تیار نہیں ہوپائی تھی۔ ٹھیکیدار دھوکا دے گیا۔ روپے کھا گیا اور نہر بھی نہیں کھدوائی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک سال میں نہر کھدوادوں گا۔ مجھے ایک موقع اور دیا جائے۔" فرہاد نے کہا۔

شیریں کے باپ نے کہا — اب تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فرہاد نے پوچھا — کیوں ....؟

بادشاہ نے کہا — اس لئے کہ شیریں ٹھیکیدار کے ساتھ بھاگ گئی ہے ■■

نشیکانت

ترجمہ: نقی امام

سُکھ

ایک آدمی کی نصف سے زائد عمر جنگل میں بیت گئی۔ وہ جنگل ہی میں لیٹا رہتا، پھل پھول کھاتا اور فطرت کی دلکشی کا نظارہ کرتا۔ اسے اور کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ اسے اسی میں سکھ تھا۔

ایک دن ادھر سے ایک اور آدمی جا رہا تھا۔ اس نے لیٹے ہوئے آدمی کہا — تم کچھ کام کیوں نہیں کرتے؟ آدمی اٹھ بیٹھا۔ مسکرایا اور بولا — کام کرنے سے کیا ہوگا؟

"پیسہ ملے گا۔"

پھر کیا ہوگا؟ اس نے پوچھا

پھر اور پیسہ ... اور پیسہ .... اور پیسہ ... وہ آدمی آگے اٹک گیا۔ گلا صاف کرتے ہوئے اس نے مزید کہا ـــ پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے پاس پیسہ ہی پیسہ رہے گا۔ تمہارا کام بڑھتا جائے گا اور تم اسی طرح آرام سے لیٹے رہوگے۔ اس طرح سے تو میں آج بھی لیٹا ہوا ہوں۔ کہہ کر آدمی پھر لیٹ گیا۔

■■

شرد جوشی

ترجمہ: نقی امام

خوبصورت ڈر

کنڈاگو گاؤں کی راہ سے چل کر ایک جوان عورت آئی اور کٹ گنی گاؤں کی راہ سے ایک مرد ـــ راہ میں دونوں ایک سڑک پر ملے۔ دونوں آگے بڑھے۔ مرد کی پیٹھ پر ایک بڑا سا مٹکا تھا۔ بغل میں ایک مرغ دبا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی اور ساتھ ہی وہ ایک بکری رسّی سے باندھے لئے چلا جا رہا تھا۔ دونوں چلتے چلتے ایک گھنے بن میں پہنچے، جسے انھیں پار کرنا تھا جبھی یکایک وہ جوان عورت گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم ٹھٹک کیوں گئیں ـــ؟" نوجوان بولا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس بات کا ڈر ـــ"

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اس گھنے بن میں مجھے پکڑ کر اپنی من چاہی نہ کرنے لگو۔ تب میں کیا کر سکوں گی ـــ؟"

"عجیب ہو تم۔ کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ میں مٹکا اور مرغ لے چل رہا ہوں۔ ساتھ میں رسّی سے بندھی بکری بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ میں اتنا لدا پھندا کیا کر لوں گا تمہارا ـــ ڈرو مت، آجاؤ ـــ"

"مجھے بھروسہ نہیں ہوتا۔ اگر تم اس لاٹھی کو زمین پر گاڑ دو اور اس سے بکری باندھ دو۔ مرغ کو نیچے رکھ کر اس پر مٹکا ڈھک دو تو تمہاری جو طبیعت آئے کر سکتے ہو ـــ"

اب کہیں جا کر کٹ گنی گاؤں کے اس مرد کی سمجھ میں بات آئی۔ ہائے میں تو اتنا سوچ بھی نہیں پاتا۔ اس نے دل میں کہا ـــ پھر اس نے لاٹھی زمین پر گاڑ دی۔ اس سے بکری باندھی۔ مرغ کو زمین پر رکھ کر اس پر مٹکا ڈھک دیا۔ اس کے بعد اس نے وہی کیا۔ جس کا اس عورت کو ڈر تھا۔

■■

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں۔

تبصرے

● **چوپٹ راجا** ● قیمت: ۶ روپے
● مصنف: فکر تونسوی ● ناشر: لاجپت رائے اینڈ سنس۔ دہلی

آج سے پینتیس چالیس برس پہلے "زندہ دلانِ پنجاب" سے نثر لکھنے والوں کا جو گروہ ابھرا تھا، ان میں سے زیادہ تر افسانے کی دنیا میں نکل گئے اور باقی صحافت کی نذر ہو گئے۔ صحافت کی ایک خوبی یہ ہو کہ ادیب کے نام کو تو زندہ رکھتی ہے لیکن اس کی ادبی حیثیت کو فنا کر دیتی ہے۔ صحافت کی دنیا میں رہ کر بھی اگر کوئی اپنی ادبی حیثیت کو برقرار رکھ سکے تو اس کی سخت جانی کی داد دینی چاہیے اور اس کے عزم اور ارادے اور سچی لگن کی دل سے قدر کرنی چاہیے۔ اردو میں طنز و ظرافت کا میدان زیادہ وسیع نہیں۔ اس وقت صرف چند نام ہیں جن کی محنت و کوشش سے اردو میں اس صنف کی الگ حیثیت برقرار رہ سکی ہے۔ ان میں فکر تونسوی ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اخبار میں ان کے کالم ہمیشہ بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ شوخی، خوش طبعی، اور شگفتہ مزاجی ان کے خاص حربے ہیں۔ ان کے سیاسی اور سماجی طنز کا براہ راست تعلق روزمرہ کی زندگی اور گردوپیش کے واقعات سے ہوتا ہے۔ ان کی حالیہ تصنیف "چوپٹ راجا" اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اُن کا سماجی اور سیاسی طنز ایک نکھری ہوئی صورت میں سامنے آیا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یا نہیں لیکن جس سیاسی رسہ کشی، سودے بازی، خود غرضی اور منفعت بازی کے دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کی دوسری نظیر ممکن نہیں۔ شاید ہی کسی ملک کی سیاست کے کردار و گفتار میں ایسی خلیج ہو، جو ہمارے ہاں ہے اور شاید ہی کسی نو آزاد ملک کی سیاست کو اپنے عظیم پیش روؤں اور رہنماؤں سے اعلیٰ اقدار کا وہ ورثہ ملا ہو جو ہمارے حالیہ رہنماؤں کو ملا ہے اور شاید ہی کسی ملک میں خوابوں، وعدوں اور اعلیٰ قدروں کو اس ڈھٹائی سے پیروں تلے روندا گیا ہو جیسا ہمارے ہاں ہوتا رہا ہے۔ فکر تونسوی کا "چوپٹ راجا" ایک گہرا سیاسی طنز ہے جس میں انھوں نے برسر اقتدار طبقے کے گھناؤنے چہرے سے بڑی جرأت اور بے باکی سے نقاب اٹھائی ہے۔ طنز نگار کو کسی نہ کسی set of values کو لے کر چلنا پڑتا ہے جن سے اتحاد یا انحراف ہی میں وہ قارئین کی ہمدردی کو حاصل کر سکتا ہے۔ اسی عمل کا دوسرا نام پڑھنے والے کی دلچسپی ہے۔ اس کتاب کی دلچسپی کا راز یہی ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ طنز کا وار مصنف کی طرف سے نہیں خود اس کی طرف سے ہے جو حکمران طبقے کی کھوکھلی مگر بظاہر چمک دمک کی زندگی پر کیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "چوپٹ راجا" مقبول ہوگی اور طنزیہ تحریروں کی دنیا میں اسے وہ مقام دیا جائے گا جس کی یہ مستحق ہے۔

——— گوپی چند نارنگ

● **بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا**
● قیمت: بیس روپے ● مصنف: مشتاق احمد
● ناشر: اقبال احمد اینڈ برادرس، ۱۴ سید صالح لین کلکتہ

بنگال اردو کا بڑا مرکز ہے۔ کلکتے کے علاوہ صوبہ کے چودہ پندرہ شہروں میں اردو کا بہت رواج ہے۔ بہت لوگوں کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ بنگال کے تقریباً ایک درجن ہائی اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور اردو ذریعہ تعلیم کے پرائمری اسکول صرف کلکتہ میں چالیس سے اوپر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے صوبے میں جو اردو کا مرکز سمجھا جاتا ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسکولوں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ہائی اسکول ایسا ہو جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ آج بھی شہر کلکتہ سے اردو کے چار روزنامے سویرے اور چار شام کو نکلتے ہیں جس سے اردو پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بنگال میں اردو شاعری کے متعلق اب تک سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جام نو (تاباں قادری)، بنگال میں اردو (وفا راشدی)، مشرقی بنگال میں اردو (اقبال عظیم)، نساخ سے وحشت تک (لطیف الرحمن)، بنگالی ہندوؤں کی

اردو خدمات (شانتی رنجن چاریہ)، اردو اور بنگال (شانتی رنجن بھٹا چاریہ) اور انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (جاوید نہال)۔ اب آٹھویں کتاب مشتاق احمد صاحب کی کوششوں سے بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا کے نام سے سامنے آئی ہے۔ اس میں بیسوی صدی کے صرف اُن شعرا کا ذکر نہیں جو بنگال میں پیدا ہوئے بلکہ مشتاق صاحب نے ان تمام شعرا کو شامل کر لیا ہے جنھوں نے بنگال میں معتدبہ عرصہ تک قیام کیا اور وہاں کی ادبی زندگی کا جزبنے۔ اس فہرست میں جہاں جمیل مظہری، حرمت الاکرام، مظہر امام موجود ہیں وہاں آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی اور آغا حشر کی کمی محسوس ہوتی ہے جنھوں نے کلکتہ میں کافی دن مقیم رہ کر وہاں کی ادبی زندگی پر اپنے نقوش چھوڑے۔ میرا مشورہ ہے کہ آئندہ اڈیشن میں مرتب ان کو بھی شامل کرلیں۔

تذکرۂ شعرانے قدیم شاعروں کے بارے میں ہمارے لیے قابل قدر مواد فراہم کیا ہے اور ان کی وجہ سے اردو کی تاریخ کے بہت سے گوشے روشن ہوئے ہیں۔ مگر آج کل تذکرۂ شعرا کی تدوین لکیر کا فقیر ہونا بے وقت کی شہنائی اور ANOCHRONISM کہی جاسکتی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بکھری ہوئی معلومات اور حالات کو محفوظ کرنے کا یہ بڑا اچھا ذریعہ ہے جسے ماخذ اور حوالے کے لیے مفید طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں ۱۰۲ شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے مشتاق صاحب نے بڑی عرق ریزی اور تن دہی سے اکٹھا کیے ہیں۔ ناساعد حالات میں یہ دردِ سر ان کی لگن اور ذوق و شوق کا بیّن ثبوت ہے۔ ان کی محنت اور توجہ سے ۱۰۲ شعرا کے بارے میں بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں اور بنگال میں اردو کی سرگرمیوں کا ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔ کتاب کی طباعت اور گٹ اپ بہت اچھا ہے۔ اس میں مرتب اور ان کے والد کے علاوہ ۱۰۱ شعرا کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

—— مسیح الزماں

● فردوس نظر ● قیمت: چار روپے
● از شاداب لکھنوی ● ملنے کا پتہ: نواب صادق حسین خاں، ترمسی گنج۔ لکھنؤ۔

شاداب لکھنوی کا یہ مجموعہ کلام بھی اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مالی امداد سے شائع ہوا ہے۔ وہ آج کل لکھنؤ کے خوش گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یوں تو وہ غزل، رباعی، قصیدہ، نظم، سب ہی کہتے ہیں لیکن ان کا خاص رجحان غزل کی طرف ہے جس میں کلاسیکی رچاؤ اور روایتی ترکیبوں کے ساتھ وہ نئے خیالات لانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ شاید یہ زندگی کی افراتفری اور قدروں کی شکست کا عام نظارہ ہو جوان کے جیسے وضع دار شاعر کو بھی غزل کی روایتی حدوں سے باہر نکال لاتا ہے۔ اگرچہ لب و لہجہ وہی رہتا ہے مگر حقیقتوں کا احساس شدید ہے جو ان سے اس طرح کے شعر کہلواتا ہے:

آتی ہیں بہاریں تو جلتے ہیں نشیمن بھی — شکوہ نہ کر دیا روبہ رسم گلستاں ہے
اسی محفل میں اب میں اجنبی ہوں — جہاں ہر اک مجھے پہچانتا ہے
شاداب یہ کیا ہوا کہ ہر اک شے ہے اجنبی — وہ ہم نہیں رہے ہیں کہ محفل نہیں رہی
ہر اک موج کو میں سمجھتا ہوں ساحل — ڈبو دے گی مجھ کو مری خوش خیالی

غزل کے روایتی انداز میں بھی انھوں نے جابجا اچھے شعر نکالے ہیں اور علامتوں میں معنویت پیدا کی ہے:

ناقدری سجدہ کی قسم میں نہیں سمجھا — کیوں میری جبیں پھر ترا سر ڈھونڈ رہی ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے خدا خیر کرے — آج ظالم نے بڑے پیار سے باتیں کی ہیں

—— مسیح الزماں

بقیہ پہلا ورق (صفحہ ۲ سے آگے)

سجاد ظہیر اور احتشام حسین اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی یاد کی خوشبو سے ساری ادبی فضا معطر ہے۔ ہم نہایت عقیدت اور خلوص سے یہ دونوں نمبر ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

اس شمارہ کی ایک ایک سطر آپ کی توجہ کی منتظر ہے۔

اگلا شمارہ افسانوی ادب اور تنقید سے متعلق اجلاسوں کے مضامین، سمینار کی تفصیلی رپورٹ، گوشہ سجاد ظہیر اور نظم و نثر کے ایک ایسے گلدستہ پر مشتمل ہوگا جس کی خوشبو تادیر قائم رہے گی ...

تلخ، ترش، شیریں

آہ فرحت اللہ انصاری

سردار جعفری

فرحت مرحوم میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ممتاز ہاسٹل میں ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کے قیام لکھنؤ میں دن رات کا ساتھ تھا۔ میری زندگی کی نہ جانے کتنی یادیں فرحت اللہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مرنے والے مرجاتے ہیں اور ہم ان کی باتیں کرکے رہ جاتے ہیں لیکن کا باعث صرف قرآن کی آیت رہ جاتی ہے۔ اِنّا للہ وَ اِنّا الیہ راجعون۔ مجھے قرآن کے سورہ رحمٰن کی ایک آیت بہت پسند ہے جس میں موت کو بھی خدا کی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ فرحت مرحوم جس موذی مرض میں گرفتار تھے اس سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا۔ اور وہ راستہ انہوں نے اختیار کر لیا۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ

فرزانہ جبیں۔ پٹنہ

تازہ شمارہ میں قرۃ العین حیدر کا افسانہ افسانوی حصہ کی جان ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ آپ نے ایک عرصہ سے اتنا اچھا افسانہ شائع نہیں کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر کو ماضی کے آئینہ سے حال کو دیکھنے میں بلا کی قدرت حاصل ہے۔ افسانہ کی یہ تکنیک انہی کا حصہ ہے۔ اس افسانہ کی اشاعت کے لیے قارئین کتاب کی جانب سے مبارکباد قبول کیجئے۔

کتابت کی غلطیاں

عشرت ظہیر

میرا افسانہ "نیند نیند" کتابت کی چند خامیوں کا شکار ہو گیا ہے۔

دوسرے صفحہ کی پہلی سطر میں "گڈمڈ ہونے لگتے اور" کے بعد یہ جملے چھوٹ گئے۔ "میں یہ سوچتی ہوئی کہ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر کام پورا کر لوں گی، لحاف تان لیتی۔ جاڑے کی طویل۔"

دوسرے صفحہ کی چھٹی سطر کے بعد یہ جملہ چھوٹ گیا: "امتحان کی تیاری اور روز امتحان کے درمیان ــــ"

افسانے کے اختتامیہ چار سطروں سے پہلے کا جملہ اس طرح ہونا چاہیے تھا: "یہ مسہری پر بچھے نرم و گداز ڈنلپ سے ابھرنے والے بستر بھی بڑے عجیب ہیں۔ ان کے مدوجزر میں۔۔۔"

● جاوید اقبال

"قدیم ادبی تنقید" پر ڈاکٹر فصیح ظفر کا بہت عمدہ تبصرہ پڑھا لیکن ادارہ کی غلطی سے فہرست میں زیر تبصرہ کتاب کے مصنف کا ہی نام تبصرہ نگار کی حیثیت سے شائع ہو گیا ہے۔

●● ان غلطیوں کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے

● پریم رومانی

جناب حافظ محمد شعیب شاکر انصاری کی موت کی بھیانک خبر سن کر دل گھبرا گیا۔ شاکری انصاری صاحب ایک علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی رہنما بھی تھے۔

تازہ شمارہ میں نفضا ابن فیضی کی غزلیں دیکھ کر بے حد متاثر ہوا ویسے بھی میں ان سے کافی متاثر ہوں۔ ان کی غزل کا یہ مصرعہ

اتنے چہروں میں ہے آخر میرا چہرا کون سا آج تک مجھ پر نہ لوگو! بھید کھل پایا کھلا

حاصل غزل ہے۔ اسکے علاوہ رام پرکاش راہی اور افتخار بیگم صدیقی کی تخلیقات بھی داد دینے کے لائق ہیں۔

● شمیم عالم

امیر زہرا زیدی کا افسانہ "رشتہ" نے مختصر ہونے کے باوجود متاثر کیا۔ ذہن اُس انسانی رشتے کے اندر مضمر اجنبی رشتے کو دیر تک تلاش کرتا رہا کہ آیا یہ کس طرح کا رشتہ ہے! راجو مرزا کا مضمون "اردو ادب کا لکھنؤ ہندوستان" دلچسپ اور متاثر کن ہے۔

اگلے شمارے میں

خاص نمبر
دوسرا حصہ

اردو ادب میں عصری آگہی ——— آزادی کے بعد

افسانہ

رضیہ سجاد ظہیر
انور عظیم
اقبال مجید
عابد سہیل

دھندلا دھندلا موتیا رنگ سحر

——— (رپورٹ)
عبدالحی

تنقید

ڈاکٹر سید محمد عقیل
ڈاکٹر شارب ردولوی
ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی
ڈاکٹر فصیح ظفر

گوشۂ سجاد ظہیر

سلام مچھلی شہری، اشفاق حسین، قمر اعظم ہاشمی، ابوالفیض سحر
مغیث الدین فریدی، اجمل اجملی، انیس اشفاق، رعنا حیدری

خاص نمبر

مقالے: سردار جعفری، عبدالقوی دسنوی، باقر مہدی سے ایک گفتگو

افسانے: قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدی، انور عظیم، مصطفی کریم، محسن شمسی، شوکت حیات، حسین الحق، سجاد عزیز، طٰہٰ حسین، اے کے ندیم۔

منظومات: سلام مچھلی شہری، عمیق حنفی، بلراج کومل، فضا ابن فیضی، مظہر امام، وحید اختر، بشیر بدر، مدحت الاختر، مظفر حنفی، صادق، غلام مرتضیٰ راہی، وحید الحسن، اجمل اجملی، انیس الرحمان، پرکاش فکری، فاروق شفق، اشہر ہاشمی، کلیم منظور، تابش حلیمی، عبدالرحیم نشتر، طارق سبزواری، مسعود سبزواری، موسیٰ بحر دح، ظفر غوری، ذکا الدین شایاں، رشید افروز، ذکیہ انجم، شاہین، اختر علیم، اجلال مجید، رباب جعفری، بلدیو مرزا، ظہیر انور، علی الدین نوید، ندیم الواجدی، احتشام اختر، رؤف صادق، ادیب حسن، کرشن مراری، عقیل شاداب، راہی، رشید عبدالسمیع جلیل، خلیل رمزی، فرزانہ، نیاز اشرف، غلام حسین ایاز، مضطر مجاز، انور مسعود، افضل اجملی، مظہر مہدی، وقار ناصری، ناز قادری، پرتاپال سنگھ بیتاب۔

● **پابلو نیرودا کی تین نظمیں:** ترجمہ/ زاہدہ زیدی ● **کشمیری نظم:** ترجمہ/ شیبب رضوی ● **طنز و مزاح:** فکر تونسوی، ابن انشا، حمید عثمانی
تلخ، ترش، شیریں: وہاب اشرفی

ماہنامہ کتاب۔ کیپور مارکیٹ لکھنؤ ۳
صفحات: دو سو سے زائد ● قیمت: ۵ روپے

... है।

... मक्खियों से सुरक्षित रखना चाहिए तथा सड़ी वस्तुओं का सेवन नहीं ...।

... ताजा तथा गर्म और ढका हुआ खाना चाहिए।

... निश्चय कर लेना चाहिए कि पीने का पानी सुरक्षित साधनों से लिया ...

... के सब साधनों को जैसे कुएं आदि को कीट नाशक दवाइयों द्वारा साफ ... दूषित होने से उनका बचाव कीजिये।

... लोगों को हैजा रोधक उपायों के पालन करने की शिक्षा दीजिये।

... होने पर तुरन्त निकटतम स्वास्थ्य अधिकारी को सूचित करें।

... स्वास्थ्य एवं परिवार नियोजन शिक्षा ब्यूरो द्वारा प्रसारित

KITAB Registered with the Registrar of Newspaper at R. No. L-1781
LUCKNOW-3 Aug.-Sept 1974 Reg No. LW/N.P.-90

